عورت اور مزاحمت

محنت کش عورتوں سے مکالمہ

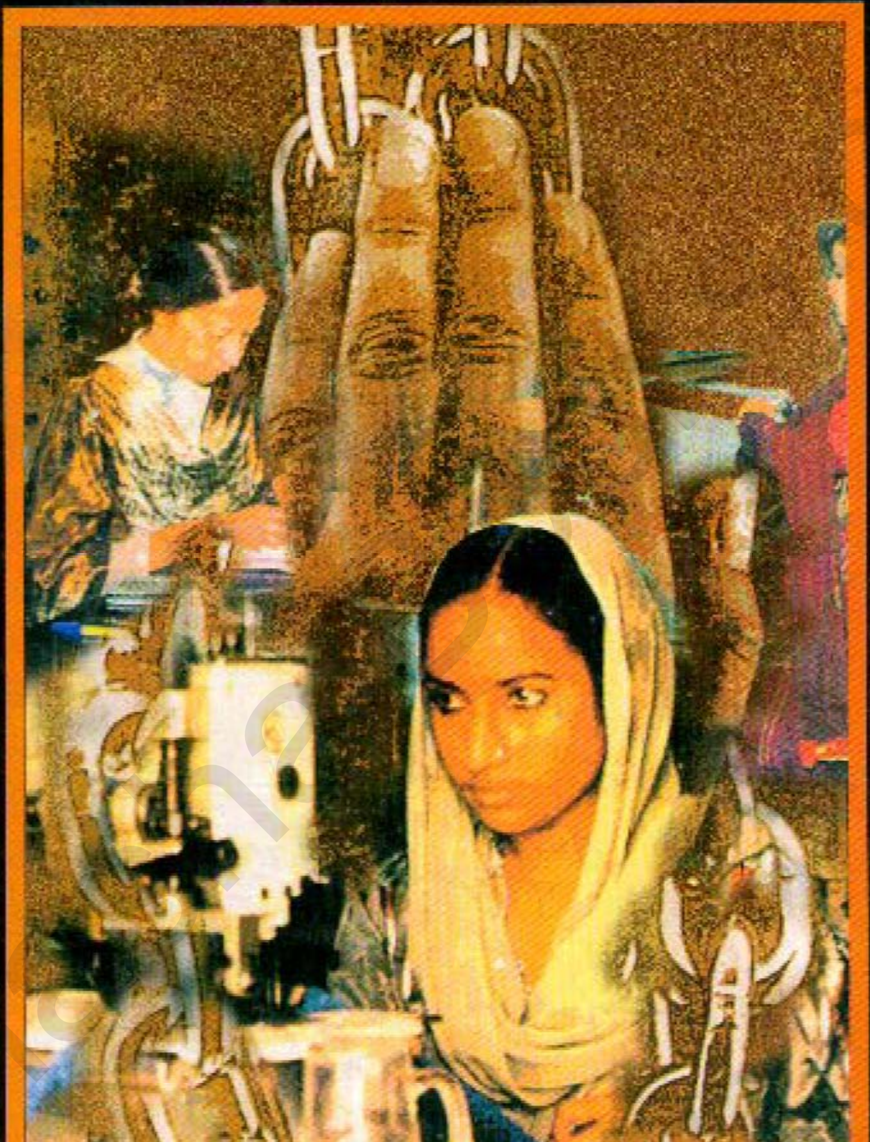

روبینہ سہگل

مشعل

عورت اور مزاحمت

محنت کشوں سے مکالمہ

روبینہ سہگل

مشعل
آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

MashalBooks.org

عورت اور مزاحمت

روبینہ سہگل

کاپی رائٹ اردو (c) 1999 مشعل

ناشر: مشعل

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

فہرست

تعارف	5
مزاحمت کیا ہے؟	19
عورت اور مزاحمت: ایک تاریخی پس منظر	55
مزاحمت اور مزدور خواتین	117
مزاحمت اور خواتین اساتذہ	177
مزاحمت اور گھریلو نوکرانیاں	205
نتائج اور اختتامیہ	227
حوالے	241

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تعارف

''عورت اور مزاحمت'' کے موضوع پر میں نے 1993ء میں کام شروع کیا جب مزدوروں کی تعلیم کی تنظیم نے مجھے اس موضوع پر ورکشاپ کرنے کی غرض سے کراچی بلایا۔ خواتین مزدوروں نے اس ورکشاپ کے دوران میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پاکستانی مزدور خواتین اپنے روزمرہ کے کام میں اتنی ہمت اور حوصلے سے کام لیتی ہیں۔ انہوں نے مجھے مزاحمت کے ایسے انداز بتائے کہ میں حیران رہ گئی۔ ان خواتین کا تعلق پیکنگ، دواؤں کی صنعت، بجلی کے پرزے بنانے کی صنعت اور ٹیلی فون کے محکمے سے تھا۔

ان کی باتیں سن کر مجھے پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ حقیقی دنیا کی عورت اس تصور سے بہت دور ہے جو مشرقی عورت کے بارے میں ناولوں ، افسانوں ، کہانیوں ، ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق عورت کمزور ہے ، بے بس ہے ، بیچاری ہے ، مظلوم ہے ، چپ چاپ دکھ اور عام تصور کے مطابق اگر کوئی عورت ایسی نہیں بلکہ اس تصور کے برعکس غصیلی ہے، اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہے، زیادتی اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہے ، تو وہ بدکردار اور بدچلن عورت کے طور پر پیش کی جاتی ہے ۔ رومانوی اور تصوراتی دنیا میں عورت کو بے کس ولاچار ، مجبور ، مظلوم اور بیچاری عورت کے طور پر پیش کرنے کی روایت زیادہ رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں ایسی عورت کی تصویر کھینچی جاتی ہے جو رحم کی مستحق ہو اور ہمدردی کی طلبگار ہو۔

لیکن جن عورتوں سے میری گفتگو ہوئی ان میں سے ایک بھی اس عکس پر پوری طرح نہیں اترتی تھی۔ کراچی میں صنعتی کارکن خواتین سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے

MashalBooks.org

احساس ہوا کہ یہ عورتیں ہر گز غیر متحرک نہیں اور نہ ہی بیچار گی اور مظلومیت کی تصویر ہیں ، وہ نہ صرف اپنے حقوق سے واقف ہیں بلکہ انہوں نے انوکھے اور دلچسپ انداز سے اپنے حقوق منوائے ہیں اور مزاحمت کا مظاہرہ بھی کیا۔ یہ مزاحمت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی ، جب بھی انتظامیہ نے کارکنوں کو دبانے اور کنٹرول کرنے کا کوئی نیا اورا نوکھا طریقہ اپنایا ، خواتین مزدوروں کی مزاحمت نے بھی اس نئے انداز کا مقابلہ نت نئے اور تخلیقی طریقوں سے کیا ، ان طریقوں کی تفصیل اور صنعتی انتظامیہ کے ہتھکنڈوں کا ذکر تیسرے باب میں آئے گا جس میں صنعتی کارکنوں کی مزاحمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

میں خواتین کارکنوں کی مزاحمت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ میں نے ان کے بارے میں اخباروں میں مقالے لکھے تا کہ ان کی ہمت ، بہادری ، حوصلے اور خندہ پیشانی کا اعتراف کیا جائے اور انہیں ان کی جرات مندی پر داد ملے۔ بعد ازاں جب بھی میں پائلر (Piler) کے بلانے پر خواتین مزدوروں کے ساتھ ورکشاپ کرتی تو مجھے نئے نئے واقعات اور بہت سے نئے مزاحمتی طریقوں کے بارے میں پتہ چلتا۔ اس عمل سے مجھے عورتوں کی مزاحمتی تحریکوں میں دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے تاریخی طور پر عورتوں کی مزاحمتی تحریکوں ، بغاوتوں اور سرکشی کے بارے میں پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں چپکو تحریک ، سندھیانی تحریک ، سیاسی تحریکوں اور تعلیم کے حق کی تحریکوں کے بارے میں پڑھا۔ ان تحریکوں کا مختصر ذکر اس کتاب کے دوسرے باب میں ہے۔

جب عورتوں کے اجتماعی اور انفرادی مزاحمتی کاموں کے بارے میں غور کیا تو احساس ہوا کہ عورت ایک انتہائی مضبوط ہستی ہے جو ظلم ، تشدد ، نا انصافی اور بربریت کے باوجود مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک غیر متحرک اور بیچاری ہستی نہیں ہے۔ عورت نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہمیشہ ناانصافی کا مقابلہ کیا ہے۔ تاریخ میں اس کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر عورتوں کی مزاحمت کی مثالوں کو قلمبند نہ کیا گیا تو یہ ہمیشہ کے لئے فراموش ہو جائیں گی۔ تاریخ میں ان کا ذکر تک نہیں آئے گا اور ان کے بے مثال کارنامے تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں ہوسکیں گے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی تاریخ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہے اور مشہور بادشاہوں اور سیاست دانوں کے گن گائے جاتے ہیں۔ عام لوگوں کی تاریخ لکھنے کا رواج تو صرف جمہوری سوچ

MashalBooks.org

آنے کے بعد ہوا ہے۔ مزید یہ کہ تاریخ زیادہ تر مردوں نے قلمبند کی جس کی وجہ سے عورتوں کی زندگیوں کا ذکر اس میں کم ہی ملتا ہے۔ تاریخ مردوں کے نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی اور اس میں جنگوں، سازشوں اور حکمرانوں اور امراء کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

لیکن جب سے جمہوریت آئی اور عام لوگوں کی زندگی کی تاریخ لکھنے کا رواج ہوا تو یورپی ممالک میں کسانوں، مزدوروں اور عام لوگوں کے طرز زندگی کے بارے میں لکھا جانے لگا۔ خاص طور ر فرانس میں اینلز (Annals) سکول کے مفکرین سماجی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ لکھنے کے حق میں ہیں۔ ہندوستان میں سب آلٹرن (Sub. Altern) سوچ کے مورخ کسانوں اور پسے ہوئے لوگوں کی تاریخ لکھتے ہیں لیکن پاکستان میں عام طور پر اب بھی تاریخ دان صرف حکمرانوں کے کارناموں کا ریکارڈ رکھتے ہیں اور عورتوں کو تو تاریخ کے عمل سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ عورت کا تاریخ میں کوئی کردار نہیں اور ان کے کوئی کارنامے نہیں ہیں۔ صرف مبارک علی نے اپنی کتاب ''تاریخ اور عورت،، میں ذکر کیا ہے کہ زراعت عورت کی ایجاد ہے اور عورت کا تاریخ میں بہت اہم کردار ہے۔
مجھے اس بات پر بہت تشویش تھی کہ اگر ہماری بہادر اور دلیر مزدور خواتین کی روز مرہ کی جدوجہد کے بارے میں نہ لکھا گیا تو ان کی یہ جدوجہد گم ہو کر رہ جائے گی لیکن میں تاریخ دان نہیں اور نہ ہی تاریخ لکھنے کے طریقوں سے واقف ہوں۔ اگر مزدور خواتین کے واقعات اور جدوجہد کا ریکارڈ ایک کتاب کی شکل میں محفوظ کر لیا جائے تو شاید کسی دن کوئی تاریخ دان اس ریکارڈ کو استعمال کر کے عورتوں کی کاوشوں اور جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرے۔ تب مجھے خیال آیا کہ مزدور خواتین کے ساتھ ورکشاپوں کے دوران اپنے تجربات کو قلمبند کیا جائے اور انہیں تحریری شکل میں محفوظ کر لیا جائے تا کہ ان کی تاریخ مٹ نہ جائے۔
یہ کتاب ان تجربات کا نتیجہ ہے اور انہیں میں سے نکلی ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عورت کی مظلومیت اور بیچارگی کی افسانویت کو توڑا جائے اور ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ ظلم اور تشدد تو ہوتا ہے، لیکن عورت اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے اور جواب دیتی ہے۔ وہ چپ چاپ، خاموشی سے ظلم سہنے والی کٹھ پتلی نہیں ہے بلکہ روز مرہ کی زندگی میں ہر دم حالات سے لڑتی ہے۔ صرف اس کی مزاحمت کا انداز اور طریقہ مختلف ہوسکتا ہے اور اس کی جدوجہد کی شاید وہ شکل وصورت نہ ہو جو علمی طور پر مزاحمت یا تحریک کہلاتی ہے۔ اس

بات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے کہ عورت کی مزاحمت کا انداز کیوں مختلف ہوتا ہے اور اسکے عوامل اور پیچیدگیاں کیوں ان عوامل سے مختلف ہوتے ہیں جو تاریخ دانوں کی نظر میں تحریک، جدو جہد اور مزاحمت سے منسوب ہوتے ہیں۔

عورت کی مزاحمت کو سمجھنے کی غرض سے دیگر معاشرتی عوامل کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ظاہر ہے عورت معاشرے کا حصہ ہے، علیحدہ مخلوق نہیں۔ عورت کی مزاحمت پر غور وفکر سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس مزاحمت کی تہہ تک جانے کے لئے معاشرے کے بنیادی معاشی اور تہذیبی اقدار کے نظام کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ معاشرے کا تجزیہ کئے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت کو مزاحمت کیوں اور کس کے خلاف کرنا پڑتی ہے؟ اس ضمن میں عورت پر تشدد کے عوامل کو سمجھنا بھی ضروری ہوگیا کیونکہ عام طور پر عورت کی مزاحمت تشدد کے خلاف ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن تشدد بھی ضروری نہیں کوئی انفرادی عمل ہو بلکہ تشدد معاشرتی ڈھانچوں میں چھپا ہوتا ہے، مثال کے طور پر سرمایہ داری نظام میں، جاگیرداری ڈھانچوں میں اور آزاد منڈی کی عالمی معیشت میں اس قدر تشدد موجود ہے کہ اس کو سمجھے بغیر عورت کی مزاحمت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ جدید دور میں عورت پر انفرادی تشدد کا بھی معاشی، سیاسی اور سماجی ڈھانچوں سے گہرا تعلق ہے۔ عورت کی مزاحمت نہ صرف انفرادی سطح پر نمودار ہوتی ہے بلکہ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام اور ڈھانچوں کے خلاف بھی ظاہر ہوتی ہے۔ تشدد میں طبقاتی کشمکش اور اس کے عوامل کا بھی بہت بڑا کردار ہے۔

میں نے عورتوں پر تشدد کے موضوع پر جتنے بھی مواد کا مطالعہ کیا مجھے مرد موردالزام نظر آئے۔ اکثر کتابوں اور مقالوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں پر مرد تشدد کرتے ہیں۔ مجھے بہت کم ایسا مواد ملا جس میں سیاسی اور معاشی ڈھانچوں اور ترقی کے عوامل کو تشدد کی بنیادی وجہ قرار دیا گیا ہو۔ بہت کم ایسا مواد ملتا ہے جو تشدد کے تجزیے میں جاگیرداری، سرمایہ داری، عسکریت، فرقہ واریت یا علاقائی عوامل کو شامل کرتا ہے۔

عام طور پر تشدد کو مردوں کا انفرادی اور ذاتی فعل قرار دیا جاتا ہے لہٰذا اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ عالمی معاشی نظام، جاگیرداری، فرقہ واریت، لسانی فسادات، طبقاتی ہمواری اور دیگر معاشرتی عوامل مردوں پر بھی بھرپور تشدد کرتے ہیں اور غریب، پسماندہ اور بے بس طبقوں کے مرد حضرات بھی دیوہیکل سماجی ڈھانچوں کے ہاتھوں شدید

MashalBooks.org

تشدید کا نشانہ بنتے ہیں۔ تشدد کا انفرادی فعل بھی اجتماعی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تشدد اچھے اور برے مردوں کے کردار کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے سماجی نظام کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی لپیٹ میں تمام پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقے آتے ہیں خواہ وہ مرد ہوں ، عورتیں ہوں بچے ہوں۔ چنانچہ عورتوں کی مزاحمت صرف کسی انفرادی مرد کے خلاف نہیں ہوتی، وہ ایک پورے نظریاتی، ثقافتی ، تہذیبی ، معاشی اور سیاسی نظام کے خلاف ہوتی ہے جس کا شکار مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ۔ لہٰذا اس نظام کا جدید دور میں تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو عورتوں اور مردوں میں اس قدر کشیدگی پیدا کرتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار بننے کے بجائے ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن جاتے ہیں۔

عورتوں پر تشدد کے خلاف عورتوں کی غیر سرکاری تنظیموں کا لٹریچر بھی عورت کو مظلومیت کی تصویر بنا دیتا ہے۔ اس میں بھی عورت ایک بے بس اور بے کس ہستی کے طور پر ابھرتی ہے جس پر ترس آتا ہے ، رحم آتا ہے اور اس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ عورتوں کے حقوق کی علمبردار خواتین نے بھی عورت کی مضبوطی ، اس کی خندہ پیشانی اور اس کی مستقل مزاجی کو نظر انداز کر کے صرف اس پر ظلم و تشدد کی داستانیں سنائی ہیں۔ بے شک عورتوں پر ظلم ہوتا ہے، تشدد ہوتا ہے اور یہ سچ ہے کہ عورتوں کو طرح طرح سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے مثال کے طور پر چولہا پھٹنے سے وہ جھلس جاتی ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل و غارت ہوتی ہے ، گھروں میں ان پر تیل چھڑک کر انہیں نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ کیا عورت نے مزاحمت کی ؟ کیا وہ بے انصافی کے خلاف بولی؟ کیا اس نے جان بچانے کی کوشش کی ؟ کیا وہ ظالم سے لڑی؟ یہی تاثر ملتا ہے کہ اس پر ظلم ہوا ، تشدد ہوا اور پھر وہ مرگئی ۔ یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان خاموشی سے ظلم سہ لے گا اور اس کے خلاف مزاحمت نہیں کرے گا ۔ عورتوں کے حقوق کی تنظیموں نے کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں کیا کہ عورت کس کس طرح مقابلہ کرتی ہے۔

عورت کی مزاحمت پر خاموشی کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں ۔ مقابلہ کرنے والی عورت کو برا سمجھا جاتا ہے، جواب دینے والی عورت کو زبان دراز کہا جاتا ہے ، تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دینے والی عورت کو بدکار کہا جاتا ہے، ظلم کا مقابلہ کرنے والی عورت کو لڑاکا کہا جاتا ہے، عورت کے عمومی تصور میں لڑائی ، بغاوت ، سرکشی ، مقابلہ ، مزاحمت یہ تمام صفات شامل

نہیں ہیں۔ یہ صرف بری عورت کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ ''اچھی'' یا ''نیک'' عورت جواب نہیں دیتی، لڑتی نہیں، چپ رہتی ہے، خاموشی سے ظلم برداشت کرتی ہے، اونچی آواز سے نہیں بولتی، جسمانی تشدد نہیں کرتی، گالیاں نہیں دیتی۔ یہ تصور اس قدر حاوی اور غالب ہے اور اس کا اتنا پرچار کیا جاتا ہے کہ کئی عورتیں جو زندگی میں روز مزاحمت کرتی ہیں، شاید اس کے تذکرے سے گریز کرتی ہیں۔ حاوی نظریات اور اقدار کے مطابق جینے کا دباؤ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ عورتیں اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ انہوں نے مزاحمت کی۔ معاشرے کے لعن طعن اور سزا سے بچنے کے لیے وہ اپنی مزاحمت کو چھپا لیتی ہیں۔ گھر والے یا محلے کے لوگ منع کر دیتے ہیں کہ فعل برا ہے، غلط ہے چنانچہ اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس طرح عورتوں کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کارنامے روپوش ہو جاتے ہیں اور چھپا دیے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی گناہ معلوم ہوتا ہے اور معاشرتی قدریں اور رسم و رواج اور مذہب کا سہارا لے کر عورتوں کے حاوی نظریے کو تقویت دی جاتی ہے کہ یہ ایک غیر متحرک، دبی ہوئی، محکوم اور بے بس ہستی ہے جو پیار تو کرنا جانتی ہے وار نہیں، محبت کرتی ہے مزاحمت نہیں، قربانی دیتی ہے، حق کے لئے نہیں بوتی، ہمدردی کرتی ہے، مخالفت نہیں، رحمدل ہے مضبوط نہیں، ہمدرد ہے باغی نہیں۔ درحقیقت عورت باغی بھی ہوتی ہے، سرکش بھی، مخالفت بھی کرتی ہے اور مزاحمت بھی، سوال بھی اٹھاتی ہے اور حقوق کے لئے آواز بھی۔ لیکن یہ سب کچھ چھپا دیا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک مشرقی معاشرے کی مشرقی عورت کو زیب نہیں دیتا۔ ہم اپنے معاشرے اور اپنی شناخت اور پہچان کے تصور سے ایسی عورت کو خارج کر دیتے ہیں جو ہمارے شعوری اور لاشعوری من پسند تصور کو جھٹلاتی ہے اور جس کی ہستی ہماری حاوی خواہشات کی عکاسی نہیں کرتی۔ ہم اس کا وجود اپنے ذہن، اپنی یادداشت اور اپنی تاریخ کے اوراق سے مٹا دیتے ہیں اور صرف ان پہلوؤں کو یاد رکھتے ہیں جو ہمارے تصور سے مطابقت رکھتے ہیں۔

عورتوں کی مزاحمت کے چھپ جانے یا اس حد تک پس پردہ ہو جانے کی کہ خود عورتیں اسے پہچان نہ سکیں، ایک اور اہم وجہ ہے۔ عام طور پر فرض کر لیا جاتا ہے کہ مزاحمت، جدوجہد، بغاوت صرف وہ ہوتی ہے جو کھلے عام، واضح اور اجتماعی صورت میں ظاہر ہو، مثال کے طور پر کوئی بہت بڑی تحریک ہو، اس میں متعدد افراد شامل ہوں اور کی

MashalBooks.org

صورت صاف نظر آئے ۔ مزاحمت کا مردانہ نقطۂ نظر یہی ہے۔ روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی بغاوتوں اور جنگوں اور جدوجہد کو مزاحمت ،تحریک یا جدوجہد کا نام نہیں دیا جاتا۔ اس کی وجہ تاریخ لکھنے کا وہ انداز ہے جو صرف بڑے بڑے واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ مزاحمت اور جدوجہد صرف ان اعمال کو کہا جاتا ہے جو باہر کی دنیا میں یعنی کام کی دنیا میں یا عوامی زندگی میں سامنے آئیں۔ ان واقعات کو جدوجہد یا مزاحمت نہیں کہا جاتا جو گھر کے اندر ، خاندان میں رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے تاثر یہ ملتا ہے کہ عورت مزاحمت نہیں کرتی کیونکہ وہ گھر کے اندر ہوتی ہے جہاں وہ سورج کے طلوع ہونے سے اس کے غروب ہونے تک دوسروں کا کہنا مانتی ہے ، تابعداری کرتی ہے ، فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کرتی ہے۔ یہ سوچ لیا جاتا ہے کہ مزاحمتی تحریکوں سے اس کا کیا تعلق؟ وہ تو مردوں کے کام ہیں جو بہادر ہوتے ہیں اور باہر کی دنیا میں مشکلات کا سامنا کرتے ہیں اور جدوجہد مصائب سے دوچار ہوکر روزی کماتے ہیں ۔ درحقیقت گھر کے اندر رہنے والی خواتین بھی ہر دم مزاحمت کا مظاہرہ کرتی ہیں ،صرف انکے اس عمل کا انداز شاید اتنا واضع پر تشدد اور اجتماعی نہیں ہوتا ۔

عورتوں کی تشدد سے پاک مزاحمت کے بارے میں کچھ مفکرین پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات اکثر کہی جا ہے کہ گاندھی کی ستیہ گرہ تحریک میں بہت سی عورتوں نے اس لئے حصہ لیا کہ مزاحمت کا یہ انداز تشدد سے خالی تھا اور پُر امن تھا۔ عورتوں کو عام طور پر امن کی تحریکوں سے منسوب کیا جاتا ہے کچھ مفکرین کی رائے ہے کہ گاندھی کی عدم تشدد طرز کی مزاحمت کی جانب بہت سے خواتین اس لئے گامزن ہوئیں کیونکہ عورتوں کی ذاتی گھریلو زندگی میں اس قسم کی پر امن مزاحمت کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اور عورتوں کو اس نوعیت کی مزاحمت کی عادت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی مفکر کیتو کا تکرک لکھتی ہیں کہ:۔

''------گاندھی نے ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو غیر متحرک مزاحمت کرنے کی ترغیب دی۔ اس طرح نو آبادیاتی نظام کے خلاف جو مردانہ طرز مزاحمت تھا وہ نسوانی ہوگیا۔عورتوں سے بہتر اس قسم کی مزاحمت کا نمونہ اور کون پیش کرسکتا تھا کیونکہ عورتوں کو بہت متحمل انداز میں پدرسری طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے''۔

کیتو کا تکرک کے اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی مزاحمت کا انداز

براہ راست قسم کا نہیں ہوتا اور واضح نہیں ہوتا کیونکہ صاف تشدد نہیں ہوتا۔ عورتیں بالواسطہ طور پر مزاحمت کرتی ہیں اور تشدد کا استعمال کم کرتی ہیں۔ شاید اسی لئے مورخوں نے ان کی بغاوت کے انداز نہیں پہچانے' ان کی جدوجہد کو نظر انداز کر دیا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ معاشرتی تبدیلی میں عورت کا کوئی کردار نہیں ہے۔

کیتو کا تکرک کا کہنا ہے کہ گاندھی کا عدم تشدد کا فلسفہ اپنی والدہ اور بیوی کی غیر متحرک مزاحمت کی بنیاد پر تشکیل ہوا۔ وہ لکھتی ہیں کہ گاندھی کا خیال تھا کہ عورتوں میں ایک دلچسپ دوہراپن ہوتا ہے۔ وہ فرمانبردار بھی ہوتی ہیں اور اتھارٹی کے خلاف بغاوت بھی کرتی ہیں۔ زیادہ تر ان کی بغاوت گھر کے اندر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ان پر ظلم اکثر گھروں کے اندر ہی ہوتا ہے لیکن گاندھی نے ان کے اس دوہرے پن کو نو آبادیاتی ریاست کے خلاف استعمال کیا اور عورت کے بلا تشدد مزاحمتی انداز کو عورت کی مضبوطی گردانا۔ گاندھی کا یہ حربہ عورتوں کو قومی آزادی تحریک میں شامل کرنے کی غرض سے بہت کارآمد ثابت ہوا اور لاتعداد عورتوں نے گاندھی کی سیاست کی حمایت کی اور اس میں حصہ لیا۔

سری لنکا کی مشہور کماری جے وردنا لکھتی ہیں کہ:

''یہ کہا گیا کہ چونکہ عورتوں کو اپنی روز مرہ کی زندگی میں غیر متحرک نوعیت کی مزاحمت کی عادت ہوتی ہے' اس لیے وہ منظم قسم کی غیر متحرک' مزاحمت اور عدم تعاون کی تحریک کے لیے زیادہ موثر طریقے سے کام کر سکتی ہیں۔''

چنانچہ عورتوں کی اس غیر متحرک ، بلا واسطہ مزاحمت کو قومی آزادی کی تحریک میں بروئے کار لایا گیا۔ اگرچہ یہ بہت حد تک صحیح ہے کہ عورتوں کا مزاحمتی انداز مردوں سے مختلف ہوتا ہے اور ان کی بغاوت کی نوعیت علیحدہ ہوتی ہے لیکن اس کی تاریخی وجوہات ہیں کیونکہ عورتوں کو شروع ہی سے براہ راست تشدد اور بلاواسطہ بغاوت سے روکا گیا اور اب بھی چھوٹی بچیوں کو اکثر یہی بتایا جاتا ہے کہ بولو مت ،لڑو نہیں، لڑکیاں جھگڑا نہیں کرتیں۔ لڑکیوں کو برداشت کرنا چاہئے ، چپ رہو وغیرہ۔ بچپن سے عورت کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ اسے غیر متحرک بنایا جائے اور اس کے مزاحمتی جذبات کو کچل دیا جائے۔ لہٰذا اگر عورتوں کا مزاحمت کرنے کا انداز اتنا واضح یا پر تشدد نہیں ہوتا تو اس کی معاشرتی اور تاریخی وجوہات ہیں، حیاتیاتی یا فطری نہیں۔

تاہم یہ کہنا تاریخی طور پر سچ نہیں کہ عورتوں نے کبھی براہ راست مزاحمت نہیں کی اور مزاحمت میں تشدد کا استعمال بالکل نہیں کیا جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے باب سے ظاہر ہوگا ،عورتوں نے بوقت ضرورت ہتھیار بھی اٹھائے ۔جنگیں بھی لڑیں اور مزاحمت کے دوران تشدد کا استعمال کیا عورت نے دونوں طرح کی مزاحمت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ جس میں تشدد یا جنگ کا استعمال ہوا اور وہ جس کا اندز بہت مختلف ، چھپا ہوا اور غیر متحرک تھا۔عورتوں نے اپنے حقوق کی جنگ میں نت نئے قسم کے مزاحمتی طریقے بھی ایجاد کئے اور کئی دفعہ صورت حال کے عین مطابق ایسا طریقہ ایجاد کیا جو اس صورت کے لیے بہترین تھا۔ اس طرح عورت کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے چنانچہ عورت کی مزاحمت تحریری شکل اختیار نہ کرنے کے باعث چھپ ضرور گئی ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں نے تاریخ میں اور معاشرتی تبدیلی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ مبارک علی اپنی کتاب ’’ تاریخ اور عورت‘‘ کے پہلے باب میں ہی بتاتے ہیں کہ عورتوں کو تحریری تاریخ سے اس لیے خارج کر دیا گیا کہ تاریخ مردوں نے تحریر کی اور عورتوں کا انداز زبانی تھا اور عورتیں تاریخ اور داستانوں کو لوری میں' کہانی میں اور زبانی روایت کے ذریعے زندہ رکھتی ہیں۔

جب یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا تو میرے سامنے چند مفروضے تھے جنہیں توڑنا میرے لیے اہم تھا۔ یہ مفروضے اس قدر عام ہیں کہ ہر شخص انہیں بغیر سوچے قبول کر لیتا ہے اور ان پر تنقید نہیں ہوتی چنانچہ اس کتاب کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:۔

1- اس عام سوچ کو غلط ثابت کیا جائے کہ عورت محض ایک مظلوم اور بے چاری ہستی ہے جو قابل رحم ہے اور جس کو ہمدردی کی ضرورت ہے

2- اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ عورت بے حد مضبوط' مستقل مزاج ' نڈر' بہادر اور دلیر ہستی ہے جس نے نہ صرف ذاتی زندگی میں بلکہ گھر سے باہر کی زندگی میں بھی جرات اور دلیری کے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔

3- تشدد کا تجزیہ سیاسی' سماجی اور معاشی ڈھانچوں اور اقتصادی نظام کے مدنظر رکھ کر کیا جائے تاکہ تشدد محض برے افراد کا ذاتی تعلق نہ معلوم ہو بلکہ ایک استحصالی نظام کا نتیجہ نظر آئے ۔ ایسے نظام کا جس میں مرد اور عورت دونوں ہی جکڑے ہوئے ہیں اور تمام مظلوم ومحکوم طبقے پھنسے ہوئے ہیں ۔تشدد کے انفرادی تجزیے

سے ہٹ کر اس کے پیچھے چھپے اجتماعی عوامل کو دیکھا جائے۔

4- جدید دور میں مرد اور عورت کے درمیان کشیدگی اور تشدد کی وجوہات کا تجزیہ کیا جائے۔ یہ تجزیہ موجودہ دور کی سماجی' سیاسی اور ثقافتی تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

5- معاشرے پر تشدد کے اثرات کا تجزیہ کیا جائے کہ اس سے فائدہ کس کو ہوتا ہے اور نقصان کون اٹھاتا ہے؟

6- گھر میں نجی ظلم و تشدد اور گھر سے باہر معاشرتی ناہمواریوں سے آئے ہوئے تشدد کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت کا جائزہ لیا جائے۔ چاہے وہ متحرک انداز کی مزاحمت ہو یا گیر متحرک ہو' اجتماعی ہو یا انفرادی۔ اس کی تاریخی مثالیں دی جائیں۔

7- مختلف صنعتوں اور خدماتی شعبوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے انٹرویو لیے جائیں تاکہ معلوم ہو کہ وہ نجی زندگی اور کام کی زندگی میں پدرسری کے خلاف کس طرح مزاحمت کرتی ہیں اور اس مزاحمت کے مخصوص انداز کیا ہیں۔ مزید سیاسی اور معاشی ڈھانچوں کے خلاف مزاحمت کا کیا انداز ہے۔

8- عورتوں اور مردوں میں باہمی تشدد کم کرنے اور معاشرتی تبدیلی لانے اور ظلم و ناانصافی کی اصل جڑ کے خلاف مزاحمت کے بارے میں کچھ خیالات ظاہر کیے جائیں۔

9- عورتوں اور مردوں کے بدلتے ہوئے سماجی کرداروں کے معاشرتی اثرات کا جائزہ لیا جائے اور اس تبدیلی کے اثرات پر روشنی ڈالی جائے۔

10- تشدد اور ذاتی شناخت کے باہمی تعلق کو سمجھا جائے تاکہ مزاحمت اور شناخت کا رشتہ سمجھ میں آ سکے۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے مختلف شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کے انٹرویو کیے گئے۔ ان میں صنعتی کارکن' غیر سرکاری تنظیموں کے کارکن' غیر رسمی اور نجی و سرکاری سکولوں کی اساتذہ اور گھریلو ملازمین شامل ہیں۔ چند خواتین خدمات کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً واپڈا' ٹیلی فون کا محکمہ وغیرہ۔

MashalBooks.org

ابتدا میں جب اس مکالمے کا فیصلہ کیا گیا تو صرف صنعتی مصنوعات بنانے والی خواتین کو انٹرویو کرنے کا ارادہ تھا۔ تاہم بعد میں یہ سوچا کہ دوسرے شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کے انٹرویو بھی لئے جائیں۔ مطالعے میں اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ آج کل صرف مصنوعات تیار کرنے والی صنعتیں نہیں ہیں بلکہ خدمات کی صنعت بڑھتی جا رہی ہے اور ان صنعتوں میں بے شمار خواتین ملازم ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ صنعتی خواتین کو مالکان آسانی سے انٹرویو کے لئے آنے نہیں دیتے۔ ان کا ملنا بہت مشکل ہے اور میں پائلر کی شکر گزار ہوں کہ اس تنظیم کی مدد سے میں نے ان صنعتوں میں کام کرنے والی خواتین کے انٹرویو کر لیے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ مختلف شعبوں کی کارکنوں کے انٹرویو کرنے سے ان شعبوں کا آپس میں موازنہ کیا جاسکتا ہے' مثال کے طور پر اس طرح واپڈا یا پی ٹی سی ایل یعنی ٹیلی فون کمپنی کی کارکنوں کے مسائل کا' دواؤں پر لیبل لگانے والی خواتین سے موازنہ ہو جاتا ہے۔ اساتذہ کے رسمی اور غیر رسمی شعبے کا موازنہ ممکن ہو جاتا ہے۔ طبقاتی فرق کے عوامل نظر آنے لگتے ہیں اور گھر پر چیزیں بنا کر بازار میں بیچنے والی خواتین کا گھریلو خادماؤں کے حالات سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح مختلف صنعتوں میں کام کرنے والی خواتین کے مختلف مسائل اور مختلف طرز مزاحمت کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ گھریلو ملازمین کا شعبہ سب سے زیادہ غیر رسمی شعبہ ہے جس میں کسی لیبر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا اور ان ملازمین کو منظّم کرنا ممکن نہیں ۔ مطالعے کو وسیع کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا' کہ ان ملازمین کا' جہاں لیبر یونین موجود ہے' دوسرے ملازمین سے کیا فرق ہے ؟ غیر سرکاری تنظیموں کے ملازمین کو مطالعے میں اس لیے شامل کیا گیا کہ ان تنظیموں کے ملازمین بھی بہت حد تک غیر محفوظ ہوتے ہیں اور انہیں تنظیم کے نظریے اور اس کے ملازمین کے سلوک میں نمایاں تضاد نظر آتا ہے۔ ان تمام وجود کی بنا پر اس مطالعے کو وسیع کرنے کا ارادہ کیا گیا تا کہ اس میں دلچسپی کا عنصر بڑھ جائے۔

اس طریقہ کار کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح یہ معلوم ہوتا کہ مختلف قسم کی انتظامیہ کے مزدوروں کو دبانے' دھمکانے' ڈرانے اور محکوم رکھنے کے کیا طریقے ہیں۔ ہر انتظامیہ دوسروں سے مختلف ہوتی ہے اور مزدوروں کو ایک دوسرے سے توڑنے کے مختلف حربے استعمال کرتی ہے۔ مزدور انہیں حربوں کے مطابق مزاحمت کرتے ہیں۔ مزدوروں کے

خیال کے مطابق مالکان کے مقابلے میں اکثر درمیانے درجے کی انتظامیہ کا رویہ زیادہ ظالمانہ ہوتا ہے کیونکہ انہیں مالکان کی خوشامد کرنا ہوتی ہے وہ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

ابتدا میں یہ سوچا گیا کہ مزدور اور کارکن خواتین سے بہت سے سوالات کئے جائیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:۔

1۔ آپ کو گھر کے اندر، نجی زندگی میں کیا مسائل درپیش آتے ہیں؟
2۔ آپ ان کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہیں؟ جذبات کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
3۔ آپ ان مسائل و مصائب سے کس طرح نبٹتی ہیں؟ اور ان کا مقابلہ کیونکر کرتی ہیں؟
4۔ گھر سے باہر کی دنیا میں، بسوں، ویگنوں وغیرہ میں کیا مسائل درپیش ہوتے ہیں؟
5۔ ان کے بارے میں آپ کے جذبات اور احساسات کیا ہیں؟
6۔ آپ ان سے کس طرح نبردآزما ہوتی ہیں؟
7۔ کام کی جگہ پر آپ کس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں؟
8۔ ان کے بارے میں آپ کے احساسات اور تاثرات کیا ہیں؟
9۔ آپ کام کی جگہ پر مسائل سے کس طرح مقابلہ کرتی ہیں؟
10۔ انتظامیہ کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟
11۔ کیا انتظامیہ آپ کے مسائل پر ہمدردی کا اظہار کرتی ہے؟ کس طرح؟ نہیں تو کیوں؟
12۔ کیا انتظامیہ آپ کے مسائل حل کرتی ہے؟ کیسے؟
13۔ کیا آپ اس حل سے مطمئن ہیں/نہیں ہیں؟
14۔ کیا آپ اپنے مسائل انتظامیہ تک پہنچا سکتے ہیں؟ ان کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟
15۔ مالکان کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟
16۔ کیا آپ کی فیکٹری میں ٹریڈ یونین ہے؟
17۔ کیا آپ اس کی رکن ہیں/نہیں ہیں؟

MashalBooks.org

18۔ نہیں، تو کیوں؟

19۔ اگر ہیں تو کیا ٹریڈ یونین آپ کے مسائل کے حل میں آپ سے تعاون کرتی ہے؟

20۔ ٹریڈ یونین کے مردوں کا آپ سے کیسا رویہ ہے؟

21۔ مرد مزدوروں کا رویہ کیسا ہے؟

22۔ کیا آپ نے کبھی کسی اجتماعی عمل میں حصہ لیا ہے مثلاً جلوس جلسہ وغیرہ یا احتجاجی مظاہرہ؟

23۔ نہیں، تو کیوں؟ ہاں، تو تفصیل بتایئے

24۔ کیا آپ کے گھر والے آپ کے کام سے متعلق مسائل کو سمجھتے ہیں؟ ہمدردی کرتے ہیں؟

25۔ نہیں، تو کیوں؟

26۔ آپ کو گھر میں کام کرنے والی عورت کی حیثیت سے کیا مراعات / مشکلات درپیش ہیں؟

27۔ کیا آپ پر تشدد ہوا ہے؟ تفصیل بیان کیجئے

28۔ کیا آپ کی اجرت منصفانہ ہے؟ نہیں تو کیوں؟

29۔ کیا آپ کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اپنی تنخواہ خود رکھیں گی یا گھر والے آپ سے لے لیتے ہیں؟

30۔ اگر آپ نے گھر یا کام کی جگہ پر مزاحمت کا اظہار کیا ہو تو بتایئے۔

شروع میں ایک دو خواتین سے یہ انٹرویو کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ طے شدہ سوالات پوچھنے سے گفتگو کا ربط و تسلسل ٹوٹتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ تھا کہ یہ تمام امور دوران گفتگو خود بخود آ ہی جاتے تھے۔ لہٰذا ہم نے اوپن اینڈ ڈ طریقہ کار یعنی کھلی گفتگو کا انداز اپنا لیا جس میں ہم صرف دو یا تین بنیادی سوالات کرتے تھے مثلاً آپ کے گھر کے اندر کیا مسائل ہیں اور ان سے آپ کیسے نبٹتی ہیں، کام کی جگہ پر کیا مسائل ہیں اور ان سے آپ کیونکر نبرد آزما ہوتی ہیں، بحیثیت ایک کام کرنے والی عورت آپ کے گھر اور کام پر ایک دوسرے کا کیا اثر پڑتا ہے، آپ کا کیا رویہ ہوتا ہے؟ ان دو چار عام سوالات سے گفتگو کا سلسلہ خود ہی چل پڑتا تھا اور بیشتر مزدور خواتین نے خود ہی تشدد، ظلم اور اس سے نبٹنے، انتظامیہ کے رویے، گھر

MashalBooks.org

والوں کے رویے اور مرد مزدوروں اور ٹریڈ یونین والوں کے رویے پر اتنا کچھ کہنا شروع کر دیا کہ سوالات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ چند خواتین دوران انٹرویو اس قدر جذباتی ہوگئیں کہ رو پڑیں۔ تقریباً تمام نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس وجہ سے مواد بہت زیادہ ہو گیا جس کا تجزیہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ ان کے جذبات کی عکاسی کی جائے اور ان کی جھلک اس کتاب میں نظر آئے اور یہ تجزیہ محض ایک سرد اور غیر جذباتی تجزیہ نہ معلوم ہو۔ اس کتاب میں شامل مواد ان عورتوں کے دلوں کی بھڑاس ہے' ان کی زندگیوں کی تلخیوں کی داستان ہے' لیکن ان کی خندہ پیشانی کو خراج تحسین بھی ہے' ان کے حوصلے اور ہمت کی تعریف بھی ہے اور ان کی بہادری اور مضبوطی کی دلیل بھی ہے۔ یہ ان کی مزاحمت کا ریکارڈ ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جا رہا ہے تاکہ مستقبل کے تاریخ دان ان کے عزم اور حوصلے کو فراموش نہ کریں۔

میں پائلر (Piler) کی بے حد شکر گزار ہوں کیونکہ اس تنظیم نے صنعتی کارکنوں کے انٹرویوز کا انتظام کرنے میں میری بہت مدد کی۔ خاص طور پر میں فرحت پروین طارق اور نورین کی ممنون ہوں جنہوں نے صنعتی کارکنوں سے رابطہ کرانے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں اپنی دوست فرزانہ شمیم کی ممنون ہوں جنہوں نے انٹرویوز کرنے اور مواد جمع کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔ اس کے علاوہ میں ان تمام غیر سرکاری تنظیموں' سکولوں اور ان کے افسروں کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس مطالعے کے لیے مواد جمع کرنے میں مدد دی۔

روبینہ سہگل

5 اکتوبر 1998ء

پہلا باب

مزاحمت کیا ہے؟

مزاحمت ہر ایسے عمل' سوچ رویے یا طریق کار کو کہا جاسکتا ہے جو کسی نا انصافی' ظلم' تشدد بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا' کسی ظلم کی مخالفت کرنا' کسی نا انصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عملی اور متحرک انداز میں کس ظلم کا سدباب کرنا۔

اجتماعی اور انفرادی مزاحمت

مزاحمت مختلف سطح پر کی جاتی ہے۔ اس کے انفرادی اور اجتماعی انداز ہوتے ہیں۔ اجتماعی اور دیرپا مزاحمت کو تحریک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اجتماعی مزاحمت بہت سے افراد' جو کسی ظلم وستم کا اکٹھے شکار ہوں' مل کر کرتے ہیں۔ اجتماعی مزاحمت کے لئے ضروری ہے کہ بہت سے افراد کسی ظلم کی اجتماعی شکل کو پہچانیں' آپس میں یک جہتی محسوس کریں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ یہ ظلم سب ہی کے خلاف ہے۔ عموماً اجتماعی طرز کی مزاحمت کے لئے کسی نہ کسی رہنما کا کردار اہم ہو جاتا ہے۔ اجتماعی مزاحمت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ظلم و نا انصافی واضح طور پر نظر آئے اور لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کا نصب العین کیا ہے اور وہ اپنی جدوجہد کے نتیجے میں کیا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اجتماعی مزاحمت کے اغراض و مقاصد اکثر واضح اور صاف ہوتے ہیں۔ نتیجتاً اس قسم کی مزاحمت کے مطالبات بھی واضح ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانس کا 1789ء کا انقلاب اجتماعی مزاحمت پر مشتمل تھا۔ انقلابیوں کو معلوم تھا کہ ان کا واضح دشمن کون ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ انقلاب سے قبل سلطنت کے تمام وسائل پر چرچ' مذہبی رہنماؤں اور امراء اور بادشاہوں کا قبضہ تھا۔ غریب لوگ بھوکے مر رہے تھے اور امراء بادشاہ کے دربار میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کسان بے شمار ٹیکسوں کے بوجھ تلے پس رہے تھے

MashalBooks.org

جبکہ امراء عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے جو کہ کسانوں اور غریب عوام کی محنت سے ممکن ہوئی تھی۔ چنانچہ واضح قسم کی بے انصافیاں نظر آتی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ دشمن کون ہے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ چند مشہور مفکرین مثلاً روسو' والٹیئر وغیرہ نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرے کی نشاندہی اور مذمت بھی کی تھی۔ فرانس میں تمام وہ حالات موجود تھے جو مزاحمت اور انقلابی جذبے کو جنم دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ بغیر کسی الزام یا مقصد کے جیلوں میں پڑے تھے۔ چنانچہ 14 جولائی 1789ء کو پیرس میں لوگوں نے مشہور جیل بیسیل پر حملہ کر کے سیاسی قیدیوں اور حکومت کے مخالفین کو زنجیروں سے چھڑایا اور ایک طویل انقلاب کا آغاز ہوا۔ اس انقلاب کے رہنماؤں نے جن میں دانتین' روبسپئر وغیرہ شامل تھے' انقلاب کی رہنمائی کی۔ فرانسیسی لوگوں کا نعرہ تھا آزادی' برابری اور بھائی چارہ۔ لوگ چرچ اور بادشاہ کی طرف سے لگائے گئے ٹیکسوں کی منسوخی مانگ رہے تھے اور ملک کے کاروبار اور سیاست میں شمولیت اور حصہ مانگ رہے تھے۔ ان کے مطالبات واضح تھے اور فرانس کی صورت حال پر مبنی تھے۔ مزاحمت حکمرانوں کی طرف سے بھی ہوئی کیونکہ کوئی بھی اپنا اقتدار آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ لیکن آخر کار بادشاہ اور امراء کے کئی نمائندوں کے سر قلم کر دیئے گئے اور فرانس میں ایک نئے طرز حکومت کا آغاز ہوا جس میں لوگوں کی شمولیت کا تصور تھا۔ اس لئے فرانسیسی انقلاب کو جدید اور جمہوری قدروں کا آغاز کہا جاتا ہے۔ یہ انقلاب اجتماعی جدوجہد کی نمایاں مثال ہے۔ جب بہت سے لوگوں کی انفرادی خواہشات اور ضروریات مل کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو تحریک بن جاتی ہے اور اس میں جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اجتماعی مزاحمت اور جدوجہد کی ایک اور مشہور مثال جو یورپ ہی سے تعلق رکھتی ہے' روس کے 1917ء کے انقلاب کی مثال ہے۔ روس میں انقلاب سے قبل بادشاہت تھی اور یہ بنیادی طور پر زرعی ملک تھا۔ یہاں صنعتکاری زیادہ وسیع پیمانے پر نہیں ہوئی تھی۔ روس میں بھی غریب عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے پس رہے تھے ان کا معیار زندگی بہت پسماندہ تھا۔ روس کے رہنماؤں پر' خصوصاً لینن پر یورپی مفکر کارل مارکس کا بہت اثر تھا۔ کارل مارکس نے معاشرے میں طبقوں کی تقسیم کی نشاندہی کی اور معاشرے کے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی مذمت کی۔ اس کا خیال تھا کہ معاشرے کے وسائل پر ہر فرد کا حق ہونا چاہئے اور یہ کسی

شخص یا طبقے کی ذاتی ملکیت نہیں ہونے چاہیں۔نجی جائیداد کی بجائے تمام ذرائع پیداوار سانجھے ہونے چاہئیں تا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت سے زیادہ دولت نہ ہو اور کوئی بھی اتنا مفلس نہ ہو کہ بنیادی انسانی ضروریات بھی پوری نہ کر سکے ۔ مارکس کا خیال تھا کہ چونکہ محنت ومشقت سے خام مال ایسی مصنوعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بازار میں قیمت وصول کرتی ہیں' لہٰذا دولت کا ذریعہ محنت ومشقت ہے۔محنت کش کو اس کے کام کا منصفانہ اجرت مل جائے تو کوئی بھی ضرورت سے زیادہ منافع نہ کما سکے۔ اس طرح کوئی بھی اتنا امیر نہیں ہوگا کہ دوسروں کی محنت کا استحصال کرے اور نہ کوئی اتنا غریب ہوگا کہ اس کے پاس اپنی محنت کو سستے داموں بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو کیونکہ ذرائع پیداوارا پر اس کا قبضہ نہیں ہے۔اگر ذرائع پیداوار یکساں طور پر سب کی ملکیت ہوں گے' یعنی قومی ہوں گے تو لوگوں کے سماجی رشتے تبدیل ہو جائیں گے اور وہ استحصال کرنے والے اور مظلوم طبقوں میں نہیں بٹے رہیں گے۔اس طرح مزدور کو اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی کہ وہ صرف اور صرف مشین کا ایک پرزہ بن جائے بلکہ اس کے پاس آرام وتفریح کا وقت ہوگا جس میں وہ اپنی ذہنی' علمی، فنی، تخلیقی اور دیگر صلاحیتوں کی نشوونما پر توجہ دے سکے گا۔ مارکس کے ان خیالات کو لینن نے عام کیا اور لوگوں' خاص طور پر مزدور طبقوں میں مقبول کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران روس جنگ میں ملوث تھا اور لوگوں کے جان و مال کا شدید نقصان ہو رہا تھا۔ روس جرمنی سے جنگ میں پھنسا ہوا تھا۔ لوگ امن وامان کی بحالی چاہتے تھے' خوراک اور زمین کے طلبگار تھے تا کہ کاشت کر کے پیٹ پال سکیں۔ 1917ء میں لینن کی کوشش کامیاب ہوئیں اور روس کو ایک سوشلسٹ ملک قرار دے دیا گیا جہاں کوئی نجی ملکیت نہیں ہوگی اور مزدوروں کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔ لوگوں کا نعرہ تھا امن' روٹی اور زمین ۔ ان مطالبات کی روشنی میں ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی گئی' جہاں ہر فرد بنیادی معاشی ضرورت کا حقدار ٹھہرایا گیا اور ان ضروریات کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ روس کے بادشاہ نکولس II کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بادشاہت ختم کر دی گئی۔

فرانس اور روس کی ان دونوں مثالوں کی کچھ تفصیل یہاں اس لئے بیان کی گئی ہے کیونکہ یہ دونوں انقلاب اپنے وقت کے بے حد کامیاب انقلاب تھے اور ان کے دیرپا

اثرات ہوئے' نہ صرف فرانس اور روس میں بلکہ اس پورے کرہ ارض پر ان دونوں انقلابوں کے بنیادی اجزاء شامل ہیں۔ انسانی حقوق کے معاشی اور سماجی حقوق روس کی محنت کشوں کی تحریک سے لئے گئے اور سیاسی اور شہری حقوق فرانس کے انقلاب کی سوچ سے لئے گئے ہیں۔ جہاں بھی جمہوری ریاست کا قیام ہوا' فرانس سے لی گئی سیاسی سوچ کا حوالہ دیا گیا خاص طور پر آزادی اور برابری کے تصورات کو مدنظر رکھا گیا۔ قومی آزادی کی تحریکوں نے بھی فرانسیسی انقلاب سے بہت کچھ سیکھا۔ اس طرح یورپ اور امریکہ کی جمہوری ریاستوں نے روسی انقلاب کے بہت سے مطالبات کو معاشی اور سیاسی حقوق کے معاہدے میں شامل کر لیا تاکہ روس جیسا انقلاب نہ آجائے اور حکمرانوں طبقوں کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے۔ ان دونوں انقلابوں سے لی گئی سوچ حقوق کی عالمی تحریک کا لازمی حصہ بن چکی ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہے کہ یہ سوچ آفاقی ہے یعنی دنیا کے ہر خطے اور ہر معاشرے کے لئے ناگزیر ہے۔ گو اس دعوے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیونکہ مختلف خطوں اور معاشروں کے اپنے علیحدہ تصورات بھی ہیں جو آزادی اور برابری اور مذہبی رواداری سے تعلق رکھتے ہیں' اور جو مقامی روایات پر مبنی ہیں' لیکن یہ سچ ہے کہ فرانسیسی اور روسی انقلاب کی اقدار آفاقی اقدار تسلیم کی جاتی ہیں۔

ان دونوں تحریکوں میں اجتماعی مزاحمت کے بہت سے پہلو صاف نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں معاشروں میں بادشاہت' امراء اور مذہب کی طرف سے ظلم و نا اصافی کا دور تھا۔ دونوں معاشروں میں عام لوگ غریب' مفلس اور نادار تھے۔ دونوں معاشروں میں فیصلہ سازی کے اداروں میں عام لوگوں کی شمولیت نہیں تھی۔ دونوں جگہ پر امراء غریبوں پر لگان' خراج اور ہر قسم کے ٹیکس لگا کر دولت لوٹ رہے تھے اور آسائشوں سے بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ دونوں معاشروں میں فلسفیوں کا اثر پھیلا اور دانشوروں اور سماجی مفکرین نے تنقید کی۔ دونوں جگہ دشمن واضح تھا اور مطالبات بھی واضح تھے۔ دونوں معاشروں میں بہت سے افراد کے مسائل ایک سے تھے جس وجہ سے ان میں یک جہتی کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ یہ دونوں نقلاب کامیاب اجتماعی تحریکوں کی مشہور ترین مثال ہیں۔

تاہم یہ کہنا ہرگز سچ نہیں کہ کامیاب اجتماعی تحریکیں صرف فرانس اور روس میں نظر آئیں۔ دنیا کے بہت سے خطوں میں کسانوں' مزدوروں اور عورتوں کی کامیاب تحاریک کی

MashalBooks.org

مثالیں ہیں۔ جنوبی اور وسطی امریکہ میں بائیں بازو کی سوچ کا ہیرو چے گویرا ایک مشہور انقلابی تھا جس نے دور دور تک یہ سوچ پھیلائی اور اس پر مبنی نظام ترتیب دیا۔ کیوبا میں فیڈرل کاسترو نے بھی کامیابی سے یہ نظام قائم کیا۔ عورتوں کے حقوق کی تحریکیں نہ صرف یورپ اور امریکہ بلکہ ہندوستان میں بہت کامیابی سے چلیں۔ اس کے علاہ کسانوں کی مقامی مزاحمتی تحریکیں اور سرکشی کے واقعات ہندوستان کی تاریخ میں بھی موجود ہیں اور ان کا تجزیہ خاص طور پر ہندوستان میں سب آلٹرن سوچ کی مفکرین نے کیا ہے۔

1۔ اس کے علاوہ قدیم زمانے سے غلاموں کی آزادی کی بغاوتیں مشہور ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں نے مل کر غلامی کے خاتمے کے لئے بغاوت کی۔ مزاحمت اور بغاوت کی یہ دردناک مثالیں ہیں کیونکہ غلاموں کو انسان تصور نہیں کیا جاتا تھا اور ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ان بغاوتوں میں سب سے مشہور بغاوت 71 تا 73 قبل مسیح میں ہونے والی سپارٹکس کی ناکام بغاوت ہے جس میں رومیوں نے غلاموں کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔

2۔ سپارٹکس کی یہ بغاوت ناکام رہی، لیکن غلاموں کی مزاحمت کی یہ بہترین مثال ہے۔ اور اس بات کی گواہ ہے کہ انسان شروع سے ہی غیر انسانی سلوک اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا چلا آیا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مزاحمت صرف اجتماعی ہی نہیں بلکہ انفرادی عمل بھی ہے۔ اس کی اجتماعی شکل کا انحصار بھی انفرادی صورت پر ہوتا ہے۔ جب تک کوئی فرد اپنے دل میں غم وغصے اور انتقام کے جذبات محسوس نہ کرے، کوئی اجتماعی تحریک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ نفسیات دانوں کا کہنا ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر مزاحمت اور جارحیت کا جذبہ لے کر دنیا میں آتا ہے۔

3۔اس کے انتقامی جذبات کو معاشرہ دبانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اجتماعی زندگی ممکن ہو سکے۔ مشہور نفسیاتی مفکر فرائڈ کا کہنا ہے کہ انسان کیونکہ جانداروں (جانوروں) کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے، اس میں تمام وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو دوسرے جانداروں میں ہوتی ہیں۔ ہر جانور میں بنیادی طور پر دو خصوصیات ضرور ہوتی ہیں جو اس سے زندہ رہنے اور اس کی افزائش کے لئے ناگزیر ہیں۔ پہلی خصوصیت جارحیت کے جذبے کے بغیر کسی جاندار کا

MashalBooks.org

زندہ رہنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہ ایک دفاعی جذبہ ہے جو کہ جانور حملے کی صورت میں اپنے دفاع کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہی جذبہ شکار کر کے کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ اگر جانداروں میں قطعی طور پر کوئی جارحیت نہ ہوتو نہ وہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں اور نہ ہی خوراک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ قدیم انسان کو شکار کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تا کہ خوراک میسر آسکے اور جنگلی جانوروں سے خود کو بچانے کے لئے حملہ کرنے کی صلاحیت ضروری تھی۔ اس طرح دلیری اور بہادری کے تصورات ابھرے کیونکہ انسان کی بقا دلیر ہونے اور نڈر ہونے میں تھی۔ چنانچہ جارحیت کا مادہ ایک قدرتی ضرورت کے پیش نظر دیگر جانوروں کی طرح انسان میں بھی تھا۔

دوسری خصوصیات جو جاندار چیزوں اور انسان میں یکساں ہے وہ ہے اپنی جنس کی افزائش یعنی جنسی صلاحیت تا کہ اولاد کے ذریعے اپنی قسم کو، اپنی پود کو قائم و دائم رکھا جا سکے۔ اس طرح اگر کسی ایک قسم کے انفرادی نمونے مار بھی دیئے جائیں تو جنس نہیں مٹتی۔ پود نہیں ختم ہوتی۔ لہٰذا جنسی صلاحیت اور جنسی جذبہ بھی بقا کی غرض سے جانداروں میں ہوتا ہے کیونکہ جارحیت کے جذبے کے بغیر کوئی جاندار نہ تو خوراک کا انتظام کر سکتا ہے اور نہ خود کو نہ اپنے بچوں اور پود کو دوسرے جانوروں سے بچا سکتا ہے۔ جنسی صلاحیت کے بغیر پود آگے نہیں چل سکتی اور افزائش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پود کی بقا کے لئے اور اسے قائم اور زندہ رکھنے کے لئے جنسی عمل ضروری ہے۔ یہ دونوں احساسات بنیادی طور پر دفاعی ہیں اور خود کو قائم رکھنے کے لئے نے جانداروں میں ڈالے ہیں۔

ان خیالات کی بنا پر فرائڈ کا خیال تھا کہ بنیادی طور پر ایک فرد معاشرے اور اجتماع کے خلاف ہوتا ہے۔ قدیم یونانی مفکر ارسطو کے الفاظ مشہور ہیں کہ انسان بنیادی طور پر سماجی جانور ہے اور دوسرے سے تعلق چاہتا ہے لیکن فرائڈ کو اس سے اتفاق نہیں کیونکہ فرائڈ کے مطالعے نے اسے قائل کیا کہ انسان کی بہت سی قدرتی صفات دراصل معاشرے کے نظام کے خلاف ہوتی ہیں کیونکہ معاشرہ اس کی فطری اور قدرتی صلاحیتوں کو دبا کر انہیں دوسری جانب گامزن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی کو ممکن بنانے کے لئے انسان کے دونوں بنیادی جذبات، جارحیت اور جنسی ہوس، کو قابو میں لانا پڑتا ہے۔ انسان کو ایک دوسرے کو قتل کرنے اور لڑنے جھگڑنے سے روکنا پڑتا ہے۔ جنسی صلاحیت اور ہوس کو

اجتماعی قدروں کے دائرے میں لاکر قید کرنا پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر فرد کا وسائل پر اورعورتوں پر کھلا حق نہیں رہتا کہ وہ جتنا چاہے لے لے اور جس عورت کے ساتھ چاہے جنسی فعل کر لے۔ معاشرہ ان ضروریات کو سماجی اداروں کے ذریعے' اخلاقی ضابطوں میں لے آتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے تقریباً ہر معاشرے نے جنسی عمل کو شادی کی کسی نہ کسی قسم میں قید کر رکھا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اولاد کس کی ہے اور نجی ملکیت محفوظ ہو سکے۔ شادی کے ذریعے عورتوں کی جنسی صلاحیت کو خاص طور پر پدرانہ اقدار کے دائرے میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح معاشرے نے انسانوں کے انتقامی جذبات کو بھی سماجی و سیاسی اداروں کی مدد سے ضابطوں میں ڈھال دیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی جان لے لے تو یہ ریاست یا معاشرے کے خلاف جرم تصور کیا جاتا ہے اور معاشرہ اس کا انتقام سزا کے نام پر لیتا ہے۔ فرد کے ہاتھ سے انتقام کا حق چھین کر معاشرے کو دے دیا گیا ہے۔ قانونی ادارے انتقام لیتے ہیں اور ایک فرد کے جارحیت کے جذبات کو پوری طرح تقویت نہیں ملتی کیونکہ سزا وہ خود نہیں بلکہ معاشرہ دیتا ہے۔

فرائڈ کا خیال تھا کہ فطری طور پر ایک انسان مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک وقت تھا کہ وسائل محدود سمجھے جاتے تھے۔ ہر فرد ان وسائل کے حصول کے لئے 'دوسروں کا دشمن تھا اور ان پر مردوں کے درمیان جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ معاشرتی زندگی افراد کے ان مقابلوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور انہیں کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مقابلے میں بھی جارحیت کے جذبات کام آتے ہیں تاکہ دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری ثابت کی جاسکے۔ فرائڈ کا موقف تھا کہ معاشرہ جارحیت' جنسی ہوس اور دیگر حیاتیاتی جذبات اور احساسات کو تخلیقی اور تہذیبی کاموں کی طرف موڑ دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں دنیا میں فن' فنون لطیفہ' عملی کام اور محنت و مشقت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کسی حد تک جنسی جذبات کو قابو میں رکھنا معاشرتی زندگی اور تہذیبی عمل کے لئے ناگزیر ہے' لیکن اگر ایک فرد پر معاشرتی دباؤ ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو یہ تہذیبی عمل کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ یا تو وہ شخص جرائم کی جانب گامزن ہو جاتا ہے اور معاشرے کا دشمن بن جاتا ہے اور اس کی جنسی قوت دہشت گردی اور غلط کاموں میں نکل جاتی ہے۔ یا دوسری صورت میں وہ اس قدر دب جاتا ہے کہ کسی مثبت یا تعمیری کام کے قابل بھی نہیں

رہتا۔ وہ خوفزدہ' نا اہل اور ڈرا رہتا ہے اور اپنے اندر کے احساسات کو مسلسل طویل عرصہ تک دبا دبا کر ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

صنفی تصورات' تشدد اور مزاحمت

عام طور پر عورتوں کی جنسی صلاحیت کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ دبایا اور کمزور کیا جاتا ہے۔ عورت کو ضبط کرنے کی تعلیم مردوں سے بہت زیادہ دی جاتی ہے کیونکہ معاشرہ عورت کی جنسی قوت سے خوفزدہ رہتا ہے۔ کئی معاشروں میں تو عورت کی جنسی قوت کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا اور اس کی نفی کر دی جاتی ہے۔ لیکن جن معاشروں میں عورت کی جنسی قوت کا اعتراف کیا جاتا ہے' ان میں اس صلاحیت پر شدید پابندیاں ہوتی ہیں اور عورتوں کو سخت نصیحت ہوتی ہے کہ وہ اس قوت کو صرف خاندان کی چار دیواری کے اندر' شادی کے مقدس رشتے میں رہ کر افزائش اولاد کے لئے استعمال کریں۔ کسی اور قسم کا استعمال' مثلاً لذت حاصل کرنے کے لئے یا تسکین کے لئے اسے استعمال کرنا بہت برا اور شرمناک سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں عورت کو فتنہ کہا گیا ہے تو شاید اس کا پس منظر یہی ہے کہ عورت کی جنسی صلاحیت کے بے باک استعمال سے معاشرہ منتشر ہو سکتا ہے۔

اس پابندی کی تہہ میں جو خوف چھپا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح مرد کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اولاد اس کی اپنی ہے یا نہیں۔ مرد کو اپنے باپ ہونے کا یقین صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب اسے پورا اعتبار ہو کہ عورت نے کسی دوسرے مرد کے ساتھ جنسی تعلق نہیں قائم کیا۔ اسی لئے کئی معاشروں میں عورتوں پر پردے' چادر اور چار دیواری کی سخت پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عورت کی جنسی قوت پدر سری معاشرے کی خدمت میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے باپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عورت کے جسم کی قوت جو اس کی پیدائش میں استعمال ہوتی ہے' جھٹلا دی جاتی ہے اور اس کے حق کی نفی کر دی جاتی ہے۔ کوئی مرد نہیں چاہتا کہ اس کی جائیداد یا ملکیت کا مالک کسی دوسرے مرد کی اولاد ہو۔ اس لئے وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ اس کے گھر پیدا ہونے والا بچہ اس کا ہے۔ اس لئے عورت کی جنسی صلاحیت کو خوف اور خطرے کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس صلاحیت کو قابو میں رکھنا پدر سری معاشروں کی بنیادی ضرورت بن جاتی ہے۔

MashalBooks.org

چنانچہ عورتوں پر رسم و رواج اور روایتوں کے پہرے لگا کر اس کی جنسی قوت کو قابو میں رکھا جاتا ہے۔ اس لئے خاتون مفکر کیتو کا ترک کہتی ہیں کہ زیادہ تر روایات عورت پر جنسی پابندیوں کے اردگرد ہوتی ہیں۔

4۔ پدرسری نظام اور نجی ملکیت کے نظام دونوں مل کر عورتوں کی جسمانی قوتوں کو استعمال کرتے ہیں' ان کا استحصال بھی کرتے ہیں اور ان پر پابندیاں لگا کر ان قوتوں کو نجی حیثیت دے دیتے ہیں۔

اپنی جنسی صلاحیت اور پیداواری قوتوں کو مرد کی خاطر اور پدرانہ معاشرے کی ضروریات کے لئے مسلسل قربان کر کے اور ان پر لگا تار ضبط کر کے عورتیں اکثر ذہنی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مسلسل ضبط کی وجہ سے ایک شخص کا احساس طاقت کم ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ شخص خود کو کمزور' لاغر' طاقت سے قاصر اور کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ احساس کمزوری اور بے بسی اس کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں ۔ وہ خود کو کسی بھی کام کا اہل نہیں جانتا اور بتدریج دوسروں پر مکمل طور پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر کا شخص کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کا تشخص ماند پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر شفا نعیم نے پاکستانی خواتین کے ایک نفسیاتی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عورتوں میں اکثر رنجیدہ' غمگین یا مرجھائے ہوئے رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خود کو مردوں اور معاشرے کے مقابلے میں بے بس یا کمزور تصور کرتی ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پر اور ان کے جسم پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں ہے ۔

عورتوں کو نظم و ضبط پر مجبور کر کے معاشرہ ان کی مزاحمتی صلاحیت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ان کے اندر بغاوت اور سرکشی کے جذبات کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر کوئی عورت پدرسری نظام کے ضابطوں اور زنجیروں سے نکل آئے' مثلاً جیسے صائمہ ارشد نے والدین کی مرضی کے خلاف اپنی پسند کی شادی کر لی' تو ایسی عورت کو پورے معاشرے کا غم وغصہ برداشت کرنا ہوتا ہے۔ صائمہ ارشد کی اخبارات نے کردار کشی کی' اسے مولوی حضرات نے برا بھلا کہا اور اسے ایک بے حیا' ملک وقوم کی دشمن کے طور پر پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس نے خاندان' والدین' معاشرے اور ملکی کی غیرت کو تباہ کیا ہے۔ پورے ملک اور معاشرے کی غیرت ایک اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی!

صائمہ کا عمل کا تھا؟ اس نے نہ تو مذہب کا کوئی اصول توڑا تھا' نہ ہی قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس نے پدرسری کی طاقت کے خلاف سرکشی کی تھی اور پدرانہ اقدار کی خلاف ورزی کی تھی ۔ ایک نوجوان عورت کی بغاوت پورے پدرانہ معاشرے کے لئے بقا کا مسئلہ بن گئی۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پدرانہ معاشرہ عورت کی آزادی اور خود مختاری سے کس قدر خوفزدہ ہوتا ہے۔ وہ برداشت نہیں کرسکتا کہ عورت اپنی زندگی کا کوئی اہم فیصلہ خود کرے یا اپنی جنسی صلاحیت کا خود اظہار کرے۔ اس مقصد کے لئے بچپن ہی سے لڑکی کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے' سکول میں بھی اور گھر میں بھی' کہ وہ دوسروں کا کہنا ماننے فرمانبردار ہو ' اطاعت گزار ہو اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو۔ عورت کی ذات کو تربیت کے ذریعے ایسے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے کہ اس کے اندر کی فطری بغاوت' خودسری اور خود مختاری ختم ہو جائے اور وہ دوسرں کے اشاروں پر چلے۔ جو عورت ان ضابطوں کو توڑتی ہے اسے بدچلن' بدکردار' آزاد خیال اور دیگر منفی القاب سے نوازا جاتا ہے۔

لیکن کسی شخص کے اندر کی فطری جارحیت یا جنسی صلاحیت پوری طرح ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں صفات' جارحیت اور جنسی قوت انسانی بقا کے جذبات ہیں' انہیں مطلق ختم نہیں کیا جاسکتا' محض دبایا جاسکتا ہے ۔جب گہرے 'فطری اور مضبوط بنیادی جذبات دبادیئے جاتے ہیں تو وہ مختلف اور بدلی ہوئی صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنسی قوت کھیل کود میں 'لڑائی جھگڑے میں' تخلیقی کاموں میں 'سخت جسمانی مشقت کی صورت میں دہشت گردی' عدم رواداری اور دیگر اشکال میں خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ معاشرے اور تہذیت کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ جذبات فنون لطیفہ' مصوری' کھیل کود یا تعمیری کاموں میں اظہار پالیں تاکہ معاشرے کو نقصان نہ ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دبے ہوئے احساسات مثبت یا تعمیری کاموں کی صورت اختیار کریں۔ دبی ہوئی قوتیں معاشرے کے خلاف بھی نکل آتی ہیں اور جرائم کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ عورتوں کو چونکہ بہت جارحانہ انداز میں اپنا غصہ' رنج ' انتقام' یا بغاوت ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ ہی موقع ملتا ہے' تو وہ اکثر ذہنی انتشار اور کسمپری میں مبتلا رہتی ہیں۔ خاص طور پر متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ عورتیں جذباب کے کھلے اظہار کو برا اور غیر مہذب سمجھتی ہیں۔ یہ ڈاکٹروں کے چکر لگاتی رہتی ہیں یا پھر خود کو اپنے بچوں یا کسی تخلیقی کام میں کھو دیتی ہیں ایسی خواتین میں اکثر

سر کا درد یا پھر پیٹ کی تکالیف، جو ذہنی کشمکش کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں، نمایاں ہوتی ہیں۔ اندرون شہر کی نچلے متوسط طبقے کی خواتین ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کر کے اپنے غم وغصہ کو دور کر لیتی ہیں۔

جارحانہ اور جنسی جذبات ضبط کرنے کے نتیجے میں عورتوں کی مزاحمت کے انداز بدل جاتے ہیں اور ان کی جارحیت مختلف قسم کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے جو بظاہر جارحانہ ہوں۔ یہ مزاحمت براہ راست قسم کی نہیں ہوتی بلکہ اس کا انداز چھپا ہوا اور بالواسطہ ہوتا ہے کہ غصہ بھی نکل جائے اور بظاہر کوئی جارحانہ حرکت بھی نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی عورت کا شوہر ظالم ہو اور مارتا پیٹتا ہو اور وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکتی ہو، تو کئی دفعہ وہ جان بوجھ کر عورتیں نمک تیز کر دیتی ہیں تاکہ وہ کھانے سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور یوں لگے کہ انجام میں غلطی ہوئی۔ سردرد یا بیماری کا بہانہ کر شوہر کو جنسی تسکین سے محروم رکھنا بھی اس قسم کی مزاحمت کا پرانا انداز ہے۔ شوہر کی بات کا جواب نہ دینا، بالکل مکمل چپ سادھ لینا یا بیمار ہو کر لیٹ جانا تاکہ اسے اپنے کام خود کرنا پڑیں، اسی قسم کی خاموشی مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مردوں کو تکلیف دی جاتی ہے۔ بظاہر عورت نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہوتا، مگر اس طرح وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی ہے اور کہنے کو اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اکثر عورتیں ماؤں، بہنوں اور قریبی دوستوں سے باتیں کر کے دل کا غبار نکال لیتی ہیں۔ اس طرح یہ بات بنتی ہے کہ عورتیں بولتی بہت ہیں۔ دراصل یہ ان کی مزاحمت کا طریقہ ہے جو مرد اس لئے نہیں سمجھتے کیونکہ انہیں اجازت ہوتی ہے کہ اپنا غم وغصہ آزادی سے عورت پر تشدد کے ذریعے نکالیں۔ انہیں عمل کی اجازت ہوتی ہے اور وہ اکثر عورتوں کو مار پیٹ لیتے ہیں، اس لئے بولنے کی اتنی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ مرد کو جارحیت کی اجازت ہوتی ہے، وہ اپنی طاقت کا کھلا اظہار کرتا ہے تو اسے مردانگی پر شاباش ملتی ہے۔ عورت کو طاقت کا کھلا اظہار کرنے پر لعنت ملامت ملتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی نسوانیت میں کمی آ گئی اور وہ مردوں جیسی ہوگئی۔ اسے تمام عمر اپنی نسوانیت کا یہی مطلب بتایا جاتا ہے کہ چپ چاپ خاموشی سے ظلم سہ لے تو جنت میں جائے گی۔ چنانچہ نسوانیت اور مردانگی، یعنی صنفی تفریق، کے تصورات کو استعمال کر کے عورت کی مزاحمت ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مرد کے لئے کہا جاتا ہے کہ آخر وہ مرد ہے، مارے گا نہیں تو اور کیا کرے گا۔ سارا دن باہر کی دنیا میں دوسروں

MashalBooks.org

کے جوتے کھا کر گھر آیا ہے' اپنی عورت پر بھی غصہ نہ نکال سکے تو بے چارہ کیا کرے۔ اس طرح مرد کی جارحیت کا جواز تلاش کر لیا جاتا ہے اور عورت پر فرض کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مرد کو خود پر باہر کی دنیا کے غصے نکالنے کا موقع دے۔ تاکہ جب دوسرے دن مرد کام پر جائے تو اس کا غصہ نکل چکا ہو اور وہ اپنے مالک پر اس کا اظہار نہ کرے ورنہ اس کی نوکری چلی جائے گی۔

اگر غور کیا جائے تو عورت پر تشدد کا فائدہ معاشی و طبقاتی نظام کو ہوتا ہے۔ اگر مزدوروں کا غصہ سرمایہ دار کی جانب نکل جائے' اگر کسانوں کا غم وغصہ ان کا روزانہ استحصال کرنے والے زمیندار اور جاگیرداروں پر نکل جائے' اگر ملازم کا غصہ اپنے مالک پر نکل جائے' تو طاقتور طبقوں کا نظام ٹوٹنے لگے۔ دبے اور پسے ہوئے لوگ اگر اپنا غصہ وہیں نکال لیں جہاں وہ پیدا ہوا' یعنی اپنے اوپر حاوی نظام کی عدم مساوات اور زیادتیوں پر' تو طاقتور افراد کا ترتیب دیا ہوا استحصالی نظام ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن حاکم اور جابر طبقوں نے اپنی روزمرہ کی بے انصافیوں اور بربریت سے پیدا ہونے والے رنج سے نمٹنے کا یہ ذریعہ نکالا ہے کہ خاندان والے اور خاص طور پر عورتیں اس رنج کو جذب کر لیں اور مزدور' ملازم' کسان گھر میں اپنا رنج و غم نکال کر دوسرے دن ہشاش بشاش واپس کام پر آئے اور پھر سے استحصالی نظام کو اپنی محنت و مشقت بیچ کر زندہ رہ سکے۔ چنانچہ عورتوں پر تشدد کا سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سے گہرا تعلق ہے کیونکہ یہی تشدد اس نظام کو قائم و دائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تشدد اور سرمایہ دری نظام

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ عورتوں پر تشدد عموماً ان کی مشقت حاصل کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً عام طور پر اس بہانے سے عورتوں کو مارا جاتا ہے کہ کھانا وقت پر تیار نہیں ہوا' کھانا صحیح نہیں بنا' کپڑے صاف نہیں ملے' یا استری نہیں ہوئے' یا پھر جنسی مشقت یعنی مرد کو جنسی تسکین پہنچانے سے انکار کیا۔ اگر غور کیا جائے تو عورت کا بے پناہ کام' اس کی دن رات کی مشقت جس میں کھانا پکانا' کپڑے دھونا' استری کرنا' بچوں کو سنبھالنا' پانی لانا' ایندھن لانا' صفائی کرنا' برتن دھونا' بچوں اور شوہر کو کھانا دینا' شوہر کے

پاؤں دبانا شامل ہیں' یہی تمام بلا اجرت کام سرمایہ داری نظام اور اس نظام کی تشکیل دی ہوئی ریاست کو قائم رکھتا ہے۔ مثال کے طو پر اگر عورتیں ان تمام کاموں کی اجرت مانگنے لگیں تو سرمایہ داروں کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ وہ ہر مزدور کو اتنی تنخواہ دے کہ وہ یہ خدمات خرید سکے۔ اس طرح تنخواہ کی کم سے کم حد اس قدر بڑھ جائے گی کہ سرمایہ داری نظام کا منافع ختم ہو جائے گا اور وہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر شخص کو یہ سہولیات مثلاً پکا پکایا کھانا' دھلے دھلائے کپڑے اور دیگر آرام ریاست فراہم کرے گی تو ریاست کو ایسا کرنے کے لئے بھاری ٹیکس لگانے پڑیں گے تا کہ ہر مزدور کو یہ سہولیات مفت دی جائیں۔ ان ٹیکسوں کی زیادہ شرح سرمایہ داری اور امراء پر لگے گی جس سے ان کا منافع گھٹ جائے گا۔ اس طرح سرمایہ داری یا جاگیرداری نظام قائم نہیں رہ سکیں گے۔ اس نظام کی یہ بنیادی ضرورت ہے کہ عورتیں یہ کام بلا معاوضہ کرتی رہیں اور اس کام کو پیار سے کیا ہوا کام کہا جا سکے۔ یہ جذباتی اور محنت کا گہرا استحصال ہے ایک طرف عورت کے جذبات کا استحصال ہے اور دوسری طرف اس کی پیداواری قوتوں کا۔ جب ایک مزدور یا کسان اپنی عورت پر تشدد کرتا ہے' خاص طور پر اس کی مشقت حاصل کرنے کی غرض سے' تو اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا فائدہ کس کو ہے۔ اس کا فائدہ سرمایہ داروں کو ہوتا ہے' جاگیردار کو ہوتا ہے۔ مرد کے اس عمل کا فائدہ اس نظام کو ہوتا ہے جو اس کا اپنا استحصال کر رہا ہے یعنی عورت پر تشدد کر کے مرد اپنے ہی ظالموں کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ اپنے ہی دشمنوں کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس کی سوچ اس طرح بنا دی جاتی ہے کہ اسے یہ عنصر نظر نہیں آتا اور وہ سمجھتا ہے کہ شاید یہ اس کا ذاتی فائدہ ہے۔

تشدد اور سماجی طبقے

اب تک جو کہا گیا' اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ صرف غریب مزدور یا کسان ہی اپنی عورت کو مارتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ حکمران اور امراء طبقوں میں بھی عورت کو مارا پیٹا جاتا ہے اور کئی دفعہ غیرت کے نام پر قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن امراء کے طبقوں میں عورت کی مشقت کی اس قدر ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ملازمین کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ ان طبقوں میں زیادہ تر عورت سے جنسی تسکین کا مطالبہ ہوتا ہے اور اولاد' خاص طور پر لڑکوں کی پیدائش

کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جائیداد اور کاروبار کے لئے وارث پیدا ہوں۔ ان طبقوں کی عورتوں پر ظلم تب کیا جاتا ہے جب وہ جنسی لذت دینے سے انکار کریں یا پھر ان کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہو۔ اس طبقے میں جنسی لذت دینے سے انکار مقصود ہوتا ہے تاکہ وارث کا خون غیر کا خون نہ ہو۔ خواہ کوئی بھی طبقہ ہو' عورت پر تشدد موجودہ سیاسی معیشت کا لازمی جزو ہے اور جب تک یہ سرمایہ داری اور جاگیرداری ڈھانچہ اور اس سے جڑی اقدار قائم رہیں گی' یہ تشدد ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ عورت پر تشدد ضروری نہیں کہ مرد کی فطری خواہش ہو' بلکہ یہ سیاسی' معاشی' نظریاتی' مذہبی اور تہذیبی ڈھانچوں کی پیداوار ہے۔ ایک شخص اگر تشدد کرتا ہے تو یہ اس کا انفرادی فعل نہیں بلکہ صدیوں سے بنائے ہوئے سماجی ڈھانچوں کا فعل ہوتا ہے جن کا وہ نمائندہ بن جاتا ہے۔ یہی ڈھانچے ایسی سوچ پیدا کرتے ہیں کہ مرد کو اس کا فعل انفرادی دکھائی دے اور وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ کن اداروں' قدروں اور ڈھانچوں کی سوچ کے تحت یہ عمل کر رہا ہے۔ کیونکہ ثقافتی اور تہذیبی عمل بہت قدیم ہے اور اس کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں' ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ فطری یا قدرتی عوامل کے تحت کوئی فعل کر رہا ہے۔ نظریات اور قدروں کے ڈھانچے پیچھے چھپ جاتے ہیں اور فرد سامنے آجاتا ہے۔ ہم سب صدیوں سے جاری عامل کا نتیجہ ہیں لیکن ہم اس بات کو شعور میں نہیں لاتے کیونکہ معاشرے کے حاوی نظریات جو حکمران طبقے تعمیر کرتے ہیں' ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ فلاں کام بہت مردانہ ہے اور اس سے مردانگی ظاہر ہوتی ہے اور فلاں کام بہت نسوانی ہے کیونکہ اس سے نسوانیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس طرح جو خیالات' سوچ اور نظریاتی ڈھانچے درحقیقت تاریخی ہوتے ہیں وہ ہمیں فطری یا قدرتی دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ کا عمل روپوش ہو جاتا ہے اور فطرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگر مختلف تاریخی ادوار اور اور مختلف تہذیبوں کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو مردانگی اور نسوانیت کے نظریات اور تصورات میں بہت متضاد قسم کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ بہت سے نظام' طور طریقے' رسم و رواج اور روایات تاریخی ہیں اور کسی نہ کسی دور کی مخصوص پیداوار ہیں لیکن چند صدیاں گزرنے کے بعد یہ فطری اور قدرتی لگنے لگتی ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے کیونکہ اگر کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ مختلف ادوار میں اور مختلف ثقافتوں میں یکساں نظام اور ڈھانچے نہیں تھے۔ اس لئے ہم یہ حقیقت بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ کسی نہ کسی دور میں یہ

MashalBooks.org

نظام اور ڈھانچے جو آج فطری اور قدرتی نظر آتے ہیں' فنا و برباد ہو چکے ہوں گے اور ان کی جگہ دوسرے ڈھانچوں لے لیں گے۔ تاریخ کا عمل انسان کی طاقت سے باہر ہے اور ہم کتنا بھی چاہیں اسے روک نہیں سکتے ۔ ایک فرد تو صرف ایک مخصوص زمانے اور ثقافت کی سوچ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت کی عکاسی کرتا ہے۔ محض ایک فرد کو مورد الزام ٹھہرانا پوری طرح صحیح نہیں کیونکہ جس طرح عورتیں اپنے وقت کے تصورات کے مطابق جینے کی کوشش کرتی ہیں' اسی طرح مرد بھی اپنے زمانے اور دور کے مردانگی کے تصورات کے مطابق جینے کی کوشش کرتا ہے تا کہ لوگ اسے نا مرد نہ کہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ دور میں مردانگی کے تصور کو بہت حد تک تشدد' مار پیٹ اور جارحیت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ مردانہ تصور سرمایہ داری اور جاگیرداری قدروں کا اہم ستون ہے۔ اسے کسی ایک مرد نے ترتیب نہیں دیا بلکہ یہ ایک شخص کی زندگی سے بالاتر ہے۔ تشدد پر آمادہ شخص اگر تاریخ میں اپنے کردار کو سمجھ لے اور جان لے کہ وہ موجودہ زمانے کی پیداوار ہے اور اس کا یہ عمل طاقتور سیاسی اور نظریاتی ڈھانچوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے' تو شاید وہ اس عمل سے گریز کرے۔ لیکن اس پر ہر وقت معاشرے کا یہ دباؤ ہوتا ہے کہ مرد بنو' اس دباؤ میں عورتیں' یعنی ایک مرد کی ماں' بہن وغیرہ بھی شامل ہوتی ہیں کیونکہ عورتیں بھی پدرسری اقدار کے تحت پرورش پاتی ہیں۔ ان کی سوچ بھی اسی ڈھانچے کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ معاشرے سے علیحدہ نہیں ہو پاتیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے تو یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ عورتیں فطری یا قدرتی طور پر کسی دوسری عورت کی دشمن نہیں ہوتیں بلکہ پدرسری نظام کے تحت جو رشتے تشکیل دیئے جاتے ہیں اس میں عورتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آجاتی ہیں ۔ پدرسری نظام' یعنی باپ کی حاکمیت یا مردوں کی بالا دستی اور برتری کا نظام ایسی سیاسی معیشت تشکیل دیتا ہے جس میں عورت اور مرد حریف بن جاتے ہیں' عورتیں عورتوں کی اور مرد مردوں کے دشمن بھی بن جاتے ہیں' غریب امیر کا' مزدور اور سرمایہ دار کا' جاگیر دار اور مزارع کا آپس میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں تقریباً ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے حتیٰ کہ ایک ہی طبقے کے افراد بھی مذہبی' علاقائی اور فرقہ کی بنیادوں پر آپس میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارت شروع کر دیتے ہیں۔ جدید طرز کی پدرسری اور اس سے جڑا معاشی نظام معاشرے میں توڑ پھوڑ اور تقسیم پیدا کرتا ہے۔ غم' غصہ اور مزاحمت کے

MashalBooks.org

جو جذبات طاقتور طبقوں اور ریاست کی جانب ہونے چاہیئں وہ لوگوں میں ایک دوسرے کی طرف موڑ دیئے جاتے ہیں۔ بجائے ریاست اور اس کی سرپرستی میں محفوظ طبقوں کی طرف بغاوت، سرکشی اور مزاحمت ابھرے، لوگ ایک دوسرے سے آپس میں لڑ پڑتے ہیں اس لئے کہ یہ نظام لوگوں کو صنفی، مذہبی، فرقہ اور لسانی بنیادوں پر بانٹ کر خود کو مضبوط اور مستحکم کرتا ہے۔ یہ تقسیم مزاحمت کو توڑنے کا بہترین طریقہ بن جاتی ہے۔

عورت اور محکوم طبقوں کی صورت حال میں مشابہت

اب تک کے تجزیئے سے یہ بات واضح ہو چکی ہوگی۔ کہ عورتوں اور دبے ہوئے طبقوں کے مردوں کی سماجی حیثیت لگ بھگ ایک سی ہی ہے۔ جہاں عورت کے مزاحمتی، اور باغی جذبات کو توڑا جاتا ہے وہاں پسے ہوئے طبقوں کے مردوں سے بھی یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ظلم، تشدد، نا انصافی اور بربریت کے خلاف آواز نہ اٹھائیں، چپ چاپ برداشت کریں اور خاموشی سے ظلم سہ لیں ۔ مالکان اور طاقتور افراد سے مزدوروں، کسانوں اور مزارعوں کا رشتہ ہی ہوتا ہے جو مردوں سے عورتوں کا ہوتا ہے۔ مظلوم و محکوم طبقے اگر اپنا مقام مد نظر رکھ کر سوچیں تو ان کے ساتھ طاقتور طبقے ہی سلوک کرتے ہیں جو مرد عورتوں سے کرتے ہیں۔ اگر ان طبقوں کے مرد یہ سمجھنے کے قابل ہو جائیں تو شاید عورتوں میں ظلم و تشدد کی اصل جڑ، یعنی سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام، کے بارے میں ان کا شعور بیدار ہو جائے۔ لیکن مردوں اور عورتوں کو تشدد کے ذریعے توڑ کر ان میں یک جہتی پیدا ہونے نہیں دی جاتی۔ ایک دبا اور پسا ہوا محکوم آدمی محسوس کرتا ہے کہ گھر اور بیوی، یہی تو میدان ہے جہاں پر وہ اپنی جواں مردی، دلیری، بہادری، اور مردانگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے یہی تو ایک جگہ ہے جہاں وہ برتر ہے، افضل ہے اور دوسروں پر حکم چلا سکتا ہے۔ باہر کی دنیا میں تو اسے حکم ماننا پڑتا ہے، اطاعت گزاری کرانا پڑتی ہے اور تشدد سہنا پڑتا ہے۔ مردانگی ظاہر کرنے اور اس کا ثبوت دینے کا واحد موقع گھر کی دنیا میں بیوی بچوں پر حکم چلا کر ملتا ہے۔ ورنہ باہر کی بے درد دنیا تو نامرد ہی بنا دیتی ہے۔ مردانگی کا مسلسل ثبوت دینے کا یہ دباؤ، تشدد کرنے والے مردوں کے لئے ایک ضرورت بن جاتا ہے۔ جتنا ایک شخص کمزور اور دبا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے جھوٹی قسم کی مردانگی کے تصور کے مطابق خود کو

ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ عورت پر غصہ نکال کر وہ زیادہ مشکل اور دلیرانہ عمل کرنے سے بچ نکلتا ہے جو دراصل اپنے ظالموں اور حاکموں سے ٹکر لینے میں ہے۔ اس طرح اس کی مزاحمت کو توڑ دیا جاتا ہے۔ اسے عورتوں سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی بنیادوں پر دوسرے محکوم افراد سے توڑ دیا جاتا ہے' اسے فرقہ واریت اور علاقائی بنیادوں پر دوسرے مزدوروں' کسانوں اور پسے ہوئے لوگوں سے دور کر دیا جاتا ہے۔اس طرح پنجابی کو سندھی' سندھی کو بلوچی' مسلمان کو عیسائی اور شیعہ کو سنی سے توڑ کر سب کا طبقاتی شعور ختم کر دیا جاتا ہے اور تشدد کو ایک انفرادی عمل بنا کر گھر تک لے جایا جاتا ہے۔ ایک آدمی محسوس کرتا ہے کہ بے شک وہ غریب ہے اور اس کا خون جوش مارتا ہے۔اس مردانگی کو وہ صرف عورتوں پر ظلم کر کے ثابت کر سکتا ہے اور اس عمل میں یہ بھول جاتا ہے کہ عورت تو اس کی اپنی ہے۔ اس کی ساتھی ہے' اس کی ہمدرد ہے' حمایتی ہے اور اس کے اپنے طبقے کی ہے۔ وہ تو اس کے دکھ درد کی شریک ہے اور س کی دشمن نہیں ہے۔

تشدد کی نفسیاتی وجوہات

موجودہ زمانے میں تشدد کی معاشری وسماجی وجوہات کے علاوہ نفسیاتی وجوہات بھی ہیں۔ اگرچہ عورت ہمیشہ سے کام کرتی آئی ہے اور زراعت کو تو عورت کی ایجاد کہا جاتا ہے' لیکن روایتی طور پر مرد کو کفالت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اناج اگانے اور کھانے پکانے میں ہمیشہ سے عورت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن باہر کی دنیا سے روزی کما کر لانا بنیادی طور پر مرد کا کام تصور کیا گیا ہے ۔ قدیم ادوار سے کفالت اور حفاظت کی ذمہ داری مرد کی سمجھی جاتی تھی اور اسے دونوں کاموں میں مردانگی کا اظہار ہوتا تھا۔ موجودہ مشینی دور میں سخت قسم کی جسمانی مشقت کچھ کم ہوگئی ہے اور عورتوں کے لئے فیکٹریوں اور دفتروں میں مشینیں چلانا مشکل نہیں رہا۔ دوسری طرف موجودہ دور کے معاشرتی اور سیاسی نظام نے اس قدر غربت پیدا کر دی ہے کہ کئی ایسے گھرانوں میں جہاں عورت کا گھر سے باہر کام کرنے کا تصور تک نہیں تھا' ان گھروں کی عورتوں کو مہنگائی اور مالی مشکلات کے پیش نظر گھر سے باہر فیکٹریوں اور دفتروں میں بھاری تعداد میں کام کرنا پڑتا ہے۔ دیہات کی عورت تو شروع ہی سے گھر سے باہر کھیتوں میں کام کرتی آئی ہے لیکن شہر کی متوسط طبقے کی عورت جو آج سے

تقریباً بیس پچیس برس پہلے کام نہیں کرتی تھی اب باہر نکل آئی ہے اور دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ بینکوں' سکولوں' سرکاری ملازمتوں' فیکٹریوں اور نجی کمپنیوں میں اکثر جگہ عورتیں نظر آنے لگی ہیں۔ ان میں سے اکثر ان گھروں کی عورتیں ہیں جو ماضی میں عورتوں کا گھر سے باہر کام کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ لیکن آج سے بیس پچیس برس قبل ایک شخص کی تنخواہ میں کنبہ گزارا کر لیا کرتا تھا۔ لہٰذا مردانہ عزت و غیرت کی یہ علامت' کہ عورتیں گھر بیٹھی رہیں' قائم رکھی جا سکتی تھی۔ لیکن آج پاکستان کی بڑھتی ہوئی مالی بدحالی اور حکمرانوں کی غلط پالیسیوں اور لوٹ کھسوٹ نے ایک کنبے کے لئے افراد کو روزگار تلاش کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ماضی میں مرد کی عزت' شان' وقار اور برتری کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ وہ محنت کر کے دوسروں کو کھلاتا ہے۔ یہ اس کی طاقت کی وجہ تھی۔ کفالت اور حفاظت کی وجہ سے ہر کوئی اس سے ڈرتا تھا اور اس کا تابعدار تھا۔ اس طرح مرد کے لئے اپنی فوقیت یا برتری جتانا قدرے آسان تھا۔

روایتی صنفی کرداروں میں تبدیلی

موجودہ زمانے میں مرد کے دونوں روایتی کرداروں میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ ایک طرف عورتیں پڑھ لکھ کر خود کفیل ہونے لگی ہیں اور ان کو مرد کے سہارے کی اتنی ضرورت نہیں رہی جتنی کہ پہلے تھی' دوسری طرف آج بندوقوں اور اسلحہ' کے زمانے میں مرد خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا وہ کسی اور کو کیا حفاظت دے گا۔ کوئی شخص بھی' مرد ہو یا عورت' خود کو محفوظ نہیں کر سکتا۔ مردوں کی آنکھوں کے سامنے ان کے گھر کی عورتوں کی آبرو ریزی ہوتی ہے' بچوں کا قتل ہوتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک بے بسی اور کمزوری کا عنصر نمایاں ہو گیا ہے۔ مزید یہ بھی سچ ہے کہ بیشتر خواتین اپنے ہی مردوں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں یا ان پر جنسی تشدد ہوتا ہے۔ محافظ خود خطرناک ہو گیا ہے اور تحفظ کی ضرورت اسی کے خلاف ہوتی ہے۔ آجکل کے دور میں ان تبدیلیوں کی وجہ سے مرد کے دونوں اہم کرداروں میں کمی آ گئی ہے۔ نہ وہ پوری طرح سے اپنی تنخواہ میں کنبے کی کفالت کر سکتا ہے' اور نہ ہی حفاظت کی ضمانت دے سکتا ہے۔ مرد کا کردار کہیں کہیں تو صرف بچے کی پیدائش کے لئے ''بیج'' ہی مہیا کرنے تک رہ گیا ہے کیونکہ کام کرنے والی عورت خود کما بھی لیتی ہے' بچے بھی پیدا کر

لیتی ہے اور انہیں پال بھی لیتی ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ مرد مکمل طور پر غیر ضروری ہو گیا ہے۔ جب سے ٹیکنالوجی نے مرد کی شمولیت کے بغیر بھی بچہ پیدا کرنا ممکن بنا دیا ہے' تو لگتا ہے کہ مرد کی ضرورت کیا ہے۔ کئی ممالک میں' جہاں طلاق کی شرح بہت زیادہ ہے' عورتیں نہ صرف بچے پیدا کر رہی ہیں بلکہ انہیں خود پال پوس لیتی ہیں۔ عورتیں بچہ بھی پیدا کرتی ہیں' نوکری بھی کر لیتی ہیں اور گھر بھی سنبھال لیتی ہیں۔ کئی ممالک میں عورتیں اکیلے یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔ لہٰذا عورت کے کردار میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ وہ بڑھ گیا ہے۔ پہلے اگر وہ صرف بچہ پیدا کرتی اور گھر سنبھالتی تھی تو اب وہ کنبے کی کفالت بھی کر لیتی ہے۔ اس کا بوجھ دوہرا ہو گیا ہے اور کئی جگہ پر عورت کی تنخواہ بھی شوہر سے زیادہ ہے۔ بچہ پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے میں بھی عموماً عورتیں زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ عورتوں کو اپنی نسوانیت پر کوئی شک نہیں ہوا۔ عورت کو جب ماہواری آتی ہے' جب وہ بچہ پیدا کرتی ہے' جب وہ اسے دودھ پلاتی ہے تو اس کی نسوانیت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسے کچھ ثابت نہیں کرنا پڑتا۔ نہ ہی اس پر ہر وقت یہ دباؤ ہوتا ہے کہ اپنا عورت ہونا ثابت کرے کیونکہ عورت محض بن سنور کر میک اپ کر لے تو عورت کہلاتی ہے اور اس پر کوئی شک نہیں کرتا۔ ہاں' اگر عورت بانجھ ہو اور بچہ نہ پیدا کر سکے تو اسے عورت نہ مانے جانے کی فکر ہوتی ہے لیکن دنیا کی بیشتر عورتوں کا یہ مسئلہ نہیں' صرف چند عورتیں اس سے دو چار ہوتی ہیں۔

مردوں کے لئے معاملہ کافی پیچیدہ ہے۔ اگرچہ بچہ پیدا کرنے میں عورتوں کا کردار مرد سے زیادہ ہے' عورتیں کما بھی لیتی ہیں اور خود اپنی حفاظت بھی کر لیتی ہیں اور اب اگر مرد کے بغیر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ایجاد ہو چکی ہے' تو مرد کو اہمیت' وقار' برتری کیونکر ملے؟ مرد کس بنیاد پر خود کو زیادہ اہم قرار دے۔ خود کمانے والی عورت تو آسانی سے مرد کو چھوڑ بھی سکتی ہے کیونکہ وہ اپنی کفالت کر لیتی ہے۔ بہت سی لڑکیاں آجکل شادی سے گریز بھی کرتی ہیں کیونکہ وہ خود مختار ہیں۔ مرد کی برتری کے تصورات جو اس کی کفالت اور حفاظت پر مبنی تھے' اب کہاں سے آئیں۔ اس بدلتی دنیا میں' مرد کا روایتی کردار کم ہو گیا ہے اور کنبے میں اس کی مرکزی اہمیت اور قدر کم ہو گئی ہے' اب مرد اپنی مردانگی کا اظہار کیونکر کرے؟ ایک طرف موجودہ معاشی نظام نے مردوں کو کفالت اور حفاظت کی صلاحیت کم کر دی ہے تو دوسری طرف ہر دم لڑکوں سے کہا جاتا ہے کہ مرد بنو' مردانگی دکھاؤ۔ مردانگی ثابت

کرنے کے طریقے ختم ہوگئے لیکن سماجی قدریں اور روایات وہی رہیں کہ مرد کسی نہ کسی طرح مرد ہونا دکھائے۔ بچوں کی پرورش اور گھریلو کاموں سے مرد کتراتا ہے کہ سب ہنسیں گے اور طنز کریں گے کہ زن مرید ہوگیا ہے' مردانگی کھو بیٹھا ہے۔ چنانچہ کنبے کے ضروری کاموں میں وہ ایک حد سے زیادہ کردار ادانہیں کرنا چاہتا جبکہ عورتوں نے خوشی سے نوکریاں کرلی ہیں اور یہ'' مردانہ کام'' اپنا لیا ہے۔ مردوں کے لئے اپنا رعب' دبدبہ اور برتری دکھانے کا واحد طریقہ ان کی جسمانی طاقت کا اظہار رہ گیا ہے۔نوجوان لڑکے ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جسمانی طاقت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں' کشتیاں لڑتے ہیں اور جسمانی طاقت کے مقابلے کرتے رہتے ہیں۔لڑکوں کو اکثر ایک دوسرے سے اپنے پٹھوں کا موازنہ کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے کیونکہ بچپن سے ان پر یہ بوجھ ہوتا ہے کہ طاقت دکھاؤ۔کبھی وہ گاڑی یا موٹر سائیکل تیزی سے چلا کر اور ان پر کرتب دکھا کر مرد ہونا ظاہر کرتے ہیں' کبھی عورتوں پر فقرے کس کے اور انہیں ہراساں کر کے مردانگی دکھاتے ہیں اور کبھی کلاشنکوف بندوقوں اور اسلحہ کا مظاہرہ کر کے اپنا مرد ہونا دکھاتے ہیں ۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانے نے مرد کو مجبور کردیا ہے کہ وہ تشدد سے بھرپور طریقے سے اپنی مردانگی کو ہر دم دوسروں پر ثابت کرتا رہے۔ لہٰذا تشدد کا ایک طریقہ رہ گیا ہے جس سے دوسروں پر برتری ظاہر کی جاسکتی ہے اور خوف طاری کیا جاسکتا ہے۔کمانے والی خود مختار بیوی کو مار پیٹ کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ بے شک وہ کماتی ہے لیکن گھر میں وہ پاؤں کی جوتی ہے اور اسے اپنی حیثیت پہچان لینی چاہے۔

قدیم زمانے میں مردانگی کے مظاہرے کھیلوں کی صورت میں ہوا کرتے تھے اور مرد مشکل قسم کے کھیلوں کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔مردانگی کا تصور یہ تھا کہ اپنے سے زیادہ طاقت ور کے آگے کھڑے ہو جاؤ' ظلم کے خلاف لڑو اور اپنے سے کم طاقتور افراد' چاہے مرد ہوں یا عورتیں' بچے اور بوڑھے' انہیں حفاظت دو اور آسمانی آفتوں سے بچاؤ اور ان کا خیال رکھو۔ اپنے سے کمزور پر ہاتھ اٹھانا نسوانیت کی نشانی تھا اور کوئی بھی غیرت مند مرد یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ جسمانی طور پر چھوٹے پر ہاتھ اٹھائے ۔ وہ اس میں اپنی ہتک سمجھتا تھا کیونکہ اسے مردانگی ثابت کرنے کے لئے اپنے سے زیادہ طاقتور ظالم حاکموں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے مواقع حاصل تھے۔موجودہ زمانے میں تصورات اس کے بالکل برعکس ہیں۔حکمرانوں نے طاقت کے نئے نئے مؤثر طریقے ایجاد کر کے غریب'

مفلس اور کمزور طبقوں کے مردوں کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ ان کے خلاف نہیں اٹھ سکتے ۔ اس لئے اب طاقت کا استعمال اپنے سے کمزور اور چھوٹے شخص پر تشدد کر کے اور اس پر رعب جما کے کیا جاتا ہے ۔عورتوں کے لیے مردانگی ثابت کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے اور موجودہ دور کا مردتشدد سے اس کا ثبوت دیتا ہے۔

اب تک یہ بات سامنے آئی ہے کہ عورتوں پر تشدد کی تہہ میں مردانگی ثابت کرنے کے عامل کارفرما ہیں۔اس کے علاوہ اس کی سماجی و معاشی وجوہات ہیں۔لیکن اب وقت ہے کہ اس امر پر کچھ بات کی جائے کہ مردانگی کا تصور اس قدر اہم کیوں ہے اور اس سے معاشرہ اس قدر دوچار کیوں ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے اور مانا جاتا ہے کہ وہ جاندار دنیا میں خدا کی سب سے بہترین اور اعلی مخلوق ہے' اس کے پاس ذہن اور سوچنے کی قوت ہے۔ انسان کی اسی برتری اور اسی قابلیت میں اسکی بے چارگی کی وجوہات پنہاں ہیں۔

مردانگی کے تصور کی پیچیدگی

انسان کے علاوہ باقی جانور سوچنے' سمجھنے اور تصورات بنانے کی قوت سے تہی ہیں۔انسان کی یادداشت' اس کا ذہن' اس کا تخیل اور غیر حاضر چیزوں کے بارے میں ذہنی تصور بنانے کی صلاحیت اس کی برتری مانی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر انسان اَن دیکھے خدا پر یقین کر لیتا ہے کیونکہ وہ ذہن میں خدا کا تصور بنا لیتا ہے۔ اسی طرح انسان نے جنت و جہنم کی نوعیت کے بے شمار تصورات تعمیر کئے ہیں کیونکہ کسی بھی شخص نے زندگی میں یہ دیکھی نہیں ہوتیں۔ انسان چونکہ خیالات اور نظریات تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتا ہے' وہ اپنی زندگی اور سماجی زندگی کے بارے میں تصورات اور نظریات بنالتا ہے' مثال کے طور پر حکومت کرنے کا تصور' اونچے اور نیچے کا تصور' اپنے اور پرائے کا تصور اور اسی طرح کے ہزاروں قسم کے خیالات اور نظریات انسانی تاریخ کی میراث ہیں۔ ان نظریات اور تصورات کا انسانی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ ہر نیا پیدا ہونے والا شخص بچپن ہی سے ان خیالات سے آگاہ ہونے لگتا ہے اور معاشرے کی سوچ اس کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ تصورات اور نظریات انسان اپنے تجربات کی بنیاد پر بناتا ہے اور انہیں نام دے کر دوسروں

MashalBooks.org

تک منتقل کرتا ہے۔ اس طرح زبان کا ارتقاء ہوتا ہے اور زبان کے طویل استعمال کے بعد یہ تصورات اور زیادہ مستحکم اور جامع ہو جاتے ہیں۔ زبان نہ صرف ان تصورات کی منتقلی کا ذریعہ ہوتی ہے بلکہ نئے تصورات کو جنم دینے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جیسے جیسے زبان کا استعمال وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور جتنے زیادہ لوگ اسے بولتے ہیں اتنا ہی وہ تصور پھیلتا ہے اور اس کے معنی میں ہلکی پھلکی تبدیلی آتی رہتی ہے حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ ایک نیا تصور ابھرتا ہے جو پرانا لفظ نہیں کہہ پاتا' اور اس کے لئے نیا لفظ تلاش کرلیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ عمل صدیوں سے چلا آرہا ہے' دنیا میں ہزاروں زبانیں پیدا ہوگئی ہیں اور ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی بن گئے ہیں۔ زبان بھی تصورات کی طرح انسان کی عظمت کی نشانی ہے اور اس کی میراث ہے۔

صنفی تفریق کی آفاقیت

کچھ تصورات اور نظریات آفاقی ہو چکے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی تصور مردانگی اور نسوانیت کا ہے اور صنفی تفریق کا ہے۔ بیشتر مفکرین کے مطابق دنیا کے تقریبا تمام معاشرے پدرسری کے آئینہ دار ہیں اور ان سب سے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا متضاد سمجھا جاتا ہے اور مردوں کو عورتوں پر افضل اور برتر سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کو مردوں کی تابع اور محکوم سمجھا جاتا ہے اور دونوں کو مختلف کردار ادا کرنے کو کہا جاتا ہے۔ چند تصورات دنیا کے تمام خطوں میں نو آبادیاتی نظام کے ذریعے پھیلائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قومی ریاست کا تصور' نمائندہ حکومت کا تصور' جمہوریت کا تصور' سیکولرازم کا تصور وغیرہ۔ اسی وجہ سے شاید چند نظریات میں مختلف خطوں کے باوجود یکسانیت نظر آتی ہے کیونکہ سامراجیت عموماً فرق مٹا کر یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ مردانگی اور نسوانیت کے تصورات میں ہمیں یورپ سے لے کر ایشیا' افریقہ' امریکہ اور آسٹریلیا تک چند باتیں یکساں اور ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر تقریباً تمام معاشروں میں مردانگی کے جدید تصور میں بہادری' دلیری' کما کر لانا' جارحیت کا جذبہ' نڈر ہونا اور مقابلہ کرنا شامل کئے جاتے ہیں۔ گو یہ تصورات مختلف معاشروں میں مختلف ہوسکتے ہیں' ان میں کچھ چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ اسی طرح تقریبا تمام معاشروں میں

MashalBooks.org

نسوانیت سے جو صفات منسوب کی جاتی ہیں ان میں خاموشی' زیادہ باہر نہ جانا' گھر کا کام کاج' بچوں کی نگہداشت' شرمیلا ہونا' کم گو ہونا' ڈرپوک یا بزدل ہونا' تابع اور محکوم ہونا' اطاعت گزار اور فرمانبردار ہونا وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔ دونوں عورتوں اور مردوں کے تصورات میں بہت سی ایسی صفات شامل کر دی گئی ہیں جن کا ان کے جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ سماجی سوچ اور تصورات کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ پیدا کرنے کا تو عورت کے جسم سے تو تعلق ہے لیکن اسے پالنے میں مرد بھی شامل ہوسکتا ہے۔ مرد بزدل اور عورتیں دلیر ہوسکتی ہیں لیکن عام طور پر یہ تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ تاریخی عوامل نے ان تصورات کو مضبوط کر دیا ہے اور ہماری تعلیم و تربیت میں یہ باتیں باقاعدہ طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔

اگرچہ تصورات تعمیر کرنے کی صلاحیت انسان کو دوسرے جانداروں سے افضل قرار دیتی ہیں لیکن انہیں تصورات کے ہاتھوں انسان مار بھی کھاتا ہے۔ نہ صرف عورتیں اور مرد علیحدہ ڈبوں میں بند ہو کر مختلف قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں' بلکہ انہیں ہر دم ان تصورات کے مطابق جینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کئی عورتیں بہت ذہین اور قابل ہوتی ہیں اور پڑھ لکھ کر خود مختار ہونا چاہتی ہیں۔ لیکن انہیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ملتی کیونکہ گھر والوں کی سوچ ہوتی ہے کہ اسے تو گھر گرہستی کریں اور گھر میں عورتوں کا ہاتھ بٹائیں لیکن طنز و تشنیع کا نشانہ بننے کے ڈر سے' وہ اس سے گریز کرتے ہیں۔ کئی مرد نرم اور ملائم جذبات کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں لیکن نامرد ہونے کے الزام سے خوفزدہ ہو کر دوسروں کے سامنے رہ بھی نہیں سکتے۔ اسی طرح کئی عورتیں جب انجینئر یا سائنس دان بننا چاہتی ہیں تو ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ استانی نرس یا ڈاکٹر بن کر خدمت خلق کریں' دوسرے پیشے تو مردانہ ہیں۔ اب یہ تقسیم کچھ بدل رہی ہے اور عورتیں ہر میدان میں آچکی ہیں' لیکن اب بھی انہی تعصّبات کی وجہ سے اکثر کشیدگی اور بدمزگی ہو جاتی ہے۔ مرد بھی ایک ڈبے میں بند ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنے اوپر خول چڑھا کر جھوٹی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف نہیں کر سکتے کہ انہیں ڈر لگ رہا ہے کیونکہ جواب ملتا ہے کہ مرد بنو۔

معاشرے کے تشکیل کردہ تصورات کی قید

مرد بنو۔ مردوں کے لئے سب سے زیادہ مصیبت اور تکلیف کی وجہ یہی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا' عورتوں کے لئے یہ بات قدرے آسان ہے کہ وہ ماں بن کر یا بن سنور کر اپنی نسوانیت کا ثبوت دے دیں۔ کوئی ہر وقت ان کی نسوانیت پر سوال نہیں اٹھاتا۔ لیکن مردوں کے لئے موجودہ زمانے میں مردانگی بہت مشکل ہوگئی ہے اور اس کے اظہار کی اکلوتی صورت تشدد نظر آتی ہے۔ انسان کے مقابلے میں دیگر جانوروں اور پرندوں کے لئے زندگی پھر بھی آسان ہے کیونکہ نر اور مادہ ہونے کے باوجود ان پر ہر دم یہ ثابت کرنے کا بوجھ نہیں کہ وہ نر ہیں یا مادہ۔ نر' بغیر تصورات کی قید میں رہے اور بغیر پریشان ہوئے' اپنا کردار بطور نر ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بچوں پر ضرب آئے تو ایکدم جارحیت دکھاتا ہے لیکن کسی پر کچھ ثابت کرنے کے لئے نہیں ۔ یہ اس کی حس ہوتی ہے مادہ بھی اپنا مامتا کا کردار آرام سے ادا کرتی ہے بغیر اس فکر کے کہ وہ اچھی ماں ہے یا نہیں۔ دونوں کو اپنے اچھے یا برے ماں باپ یا اچھی بری بیوی یا اچھا برا شوہر ہونے کی فکر نہیں ہوتی۔ پرندے اور چرندے نظریات اور تصورات اور زبان کی قید میں نہیں ہوتے اور صرف اپنی حس کے مطابق چلتے ہیں۔ اس لئے مردانگی ثابت کرنے کا مسئلہ ہی نہیں اٹھتا۔ انسان چونکہ عقل وفہم' سوچ کی قوت اور تخلیق کی صلاحیت لے کر آیا ہے' تصورات بنانے کی قابلیت لے کر پیدا ہوا ہے' لہٰذا انسان اپنی ہی بنائی ہوئی زبان' اپنے ہی تعمیر کردہ تصورات اور اپنی ہی سوچ کا بے بس شکار ہو جاتا ہے۔ وہ عزت' غیرت' انا' غرور' طاقت اور دیگر تصورات کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے میں ہی اس کا زوال ہے' اس کے افضل ہونے میں ہی اس کی تباہی ہے۔ کیونکہ تصورات اس قدر طاقتور ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی ایک انسان کے بس میں نہیں رہتے بلکہ اس کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ تاریخی اور معاشرتی ہوتے ہیں۔ لیکن اب سب میں امید کی کرن یہ ہے کہ جہاں انسان نے موجودہ تصورات اور الفاظ کی تخلیق کی ہے اور انہیں مستحکم کیا ہے' وہاں وقت گزارنے کے ساتھ متبادل الفاظ اور تصورات بھی ابھریں گے کیونکہ تبدیلی کا عمل رک نہیں سکتا ۔ تاریخ اٹل حقیقت ہے۔ ضروری نہیں کہ مستقبل کے تصورات زیادہ منصفانہ ہوں' لیکن یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ

MashalBooks.org

تبدیلی کس سمت میں آتی ہے۔ البتہ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ کوئی بھی شخص پوری طرح سے حالات اور وقت کا قیدی نہیں ہوتا۔ کس حد تک تو ہم سب اپنے وقت کی پیداوار ہیں اور آج کی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن ہم سب کے پاس تھوڑی بہت آزادی ضرور ہوتی ہے کہ ہم سب اپنے زمانے کی سوچ سے خود کو قدرے آزاد کر لیں جس طرح عورتوں نے اپنے حقوق کی تحریک میں، افریقہ کے سیاہ فام افراد نے سفید فام لوگوں کے خلاف، مزدوروں، کسانوں اور دیگر لوگوں نے اپنے وقت کے حالات میں مداخلت کر کے انہیں بدلا ہے، اسی طرح آج بھی ممکن ہے کہ ہم تاریخ کے عمل میں چھوٹی چھوٹی سطح کی مداخلت کر کے تبدیلی لا سکیں۔ ضروری نہیں کہ تبدیلی کے لئے کوئی بہت بڑی تحریک ہی چلے، بلکہ روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی مزاحمت سے اپنے حالات میں تبدیلی لانا کسی حد تک ممکن ہے۔

صنفی تصورات کا بحران۔ انیسویں صدی اور ترقی کا تصور

موجودہ زمانے (یعنی پچھلی اور موجودہ صدی) میں نسوانیت اور مردانگی کے تصورات کے بحران کی شہادت ہمیں مشہور شاعر اکبرالہ آبادی کی شاعری میں بہت واضح ملتی ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف اس بحران کی غماز ہے بلکہ ان کی کلیات پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان کے انیسویں اور بیسویں صدی کے مرد کس حد تک یہ محسوس کر رہے تھے کہ مردانگی کا زوال ہو گیا ہے اور مسلمان معاشرہ نامردی کے المیے سے دو چار ہے۔ اکبر الہ آبادی کے دور میں تبدیلی کا عمل بہت تیز ہو گیا تھا۔ معاشرہ انگریزوں کی حکومت اور سوچ کے تحت تیزی سے بدل رہا تھا۔ نہ صرف حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکی تھی بلکہ اقدار، خیالات، نظریات اور تصورات کا بھی زبردست تصادم تھا۔ مسلمانوں کو نہ صرف انگریز کی طاقت کی وجہ سے اپنی تہذیب مٹ جانے کا خوف تھا بلکہ ہندو اکثریت سے بھی ڈر تھا کہ وہ مسلمانوں پر حاوی ہو جائے گی۔ باہر کی دنیا میں تو مسلمان مرد اپنی سیاسی طاقت کھو ہی چکا تھا لیکن اپنے گھر کے اندر ابھی اسی کی حکومت تھی اور جدت اور سماجی تبدیلی کو گھر کی دہلیز پار کرنے سے روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن یہ کام بتدریج مشکل نظر آ رہا تھا کیونکہ ایک طرف انگریز یہ الزام لگا رہا تھا کہ مسلمان پسماندہ ہیں کیونکہ وہ اپنی عورتوں کو پردے میں رکھتے ہیں اور تعلیم نہیں دیتے، دوسری طرف لڑکیاں آہستہ آہستہ سکولوں میں جانے لگی

تھیں اور پردے کا رواج بھی ختم ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اکبرالہ آبادی ان تمام چیزوں سے بہت پریشان تھے اور جدت، ترقی اور نئی روشنی کے خلاف مسلسل اپنی شاعری میں احتجاج کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی ترقی اور جدت کے خلاف شاعری طنز و مزاج کے پر لطف انداز سے بھر پور ہے، لیکن اس طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے پن کے پیچھے ایک نہایت سنجیدہ، پریشان اور مضطرب شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی کلیات کا قریب ایک تہائی حصہ عورتوں کی تعلیم، پردے کے خاتمے اور ترقی کے اثرات سے متعلق ہے۔ عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی وہ اس بات کے قائل تھے کہ عورتوں کو صرف گھر گرہستی، امور خانہ داری اور بچوں کی نگہداشت کے لئے تعلیم دینے کی ضرورت ہے وہ پردے کے خاتمے کے سخت مخالف تھے اور اسے مسلمانوں کا زوال تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی عورتوں کو پردے سے نکالنا مسلمانوں کی بے عقلی ہے اور یہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مسلمان مرد انگریز کے ہاتھوں اس قدر نامرد ہوگیا ہے کہ انگریز نے اس کی عورت کو کامیابی سے گھر سے باہر نکال کر پبلک میں کھڑا کر دیا ہے جہاں پر غیر محرم اسے دیکھ سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل ان کے کچھ شعر ہیں جو اس موضوع پر لکھے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کے نزدیک جدید دور کی عورت کس قدر آزاد ہو گئی تھی اور اس میں مسلمان مردوں کا کتنا زیادہ قصور تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

بے پردہ کل جو چند نظر آئیں بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اس شعر میں وہ پردے کو قومی غیرت سے منسوب کرتے ہیں اور پردہ دار کو مردوں کی بے عقلی کہتے ہیں۔ ایک اور شعر میں وہ مسلمان مردوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اس شعر میں وہ مردانگی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ زمانے کو تبدیل کرے نہ کہ خود تبدیل ہو جائے۔ یعنی انگریز نے زمانہ بدل دیا اور محکوم مردوں کی مردانگی گئی۔ لہٰذا تبدیلی پر ناز کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا ایک اور شعر ہے کہ:

بڑھتا جاتا ہے حسن قوم مگر
ساتھ ہی اس کے ناتوانی بھی

اس شعر سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کے نزدیک مردانہ قوم وہ ہے جس میں توانائی ہو' طاقت ہو' صرف حسن (یعنی نسوانی صفات) نہ ہوں۔ توانائی بھی مردانگی ہی سے جڑا ہوا تصور ہے اکبر قوم کے بارے میں بہت اداس تھے کہ اس میں نہ تو اتحاد اور یک جہتی رہی ہے نہ ہی مردانگی۔ ایک اور شعر اسی مردانہ کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

مسلمان مردوں کو اکثر تیغ وشمشیر کے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہاں اکبر پریشان ہیں کہ جب حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی' تو چلمن کی تیلیاں کب تک مسلمان عورتوں کی عزت وغیرت کو محفوظ رکھیں گی۔

ایک اور شعر میں اکبر مسلمان مردوں کو انتباہ کرتے ہیں کہ:

نہ ہو جو مذہب و ملت کے ساتھ ہمدردی
زمانہ صاف کہے گا کہ ہے یہ نامردی

اکبرالہ آبادی کے نزدیک نئی روشنی اور نئی تہذیب کے آگے جھکنا اور خاص طور پر عورتوں کو پردے سے نکال دینا نامردی کی نشانی تھی۔ وہ مغربی فلسفے کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ اس نے مسلمان عورتوں کو بے پردہ کر دیا ہے۔

ایک شعر میں اکبر نامردی کو شیطان سے منسوب کرتے ہیں:

مکر و فریب وظلم یہ سب اس میں ہے مگر
شیطان میں دلیری و مردانگی نہیں

MashalBooks.org

اس شعر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مکر وفریب نسوانی صفات ہیں کیونکہ شیطان میں یہ تو ہیں مگر مردانگی نہیں ہے۔ دلیری اور مردانگی کو یہاں ایک دوسرے سے جوڑا گیا ہے۔ ایک اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مرد مغرب کی تہذیب سے متاثر ہو کر جنٹلمین بن گئے ہیں یعنی مہذب ہوگئے ہیں تو بیبیاں کیوں گھر میں رنج کے عالم میں بیٹھیں۔ یعنی وہ عورتوں کے بدلتے ہوئے کردار کے لئے مردوں کو ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ ایک دلچسپ شعر میں وہ کہتے ہیں۔

شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے
شمشیر کو چھپایئے زن کو نکالئے

اس شعر میں بھی اکبر مردوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی شناخت شمشیر اور بہادری سے ہوا کرتی تھی اور وہ اس کے ذریعے عورتوں کو حرم میں چھپا کر رکھتے تھے۔ لیکن اب سب کچھ ایک نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ شمشیر کو چھپایا جاتا ہے یعنی نامردی اور زن کو نکال لیا گیا ہے یعنی بے پردگی۔ اس شعر میں مسلمان مردوں کی مردانگی پر اکبر گہری چوٹ لگاتے ہیں اور ان کا انداز بے حد طنزیہ ہے۔ وہ افسوس کرتے ہیں کہ اب مردوں کو کیا ہوگیا ہے کہ انہیں بے پردگی اور بے حیائی پر غصہ بھی نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں:

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

مردانہ غصہ وغیرت کا تقاضا تھا کہ عورتوں کو پردے میں اور قابو میں رکھا جائے۔ مرد اب ان چیزوں کے قابل نہیں رہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ عورتوں کے سکول جانے کی وجہ مردوں اور عورتوں کے پرانے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور نئے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بیبیاں سکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

ایک اور شعر ہے کہ:

MashalBooks.org

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ان کا خیال تھا کہ ترقی اور جدید دور کی قدروں کی وجہ سے مردوں میں مذہب، غیرت، عزت یہ سب کچھ نہیں رہا اور وہ مرد نہیں رہے اور عورتوں میں تابعداری اور پردہ نہیں رہا اور وہ عورتیں نہیں رہیں۔

ان تمام اشعار سے یہ بات کافی حد تک سامنے آتی ہے کی اکبر الہ آبادی کے نزدیک جدید دور کے بدلتے تقاضوں نے شوہر اور بیوی کے رشتے کو بدل دیا ہے۔ مردوں میں مردانگی نہیں رہی، یعنی جو روایتی مردانگی سمجھی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی اور عورتوں میں روایتی طرز کی نسوانیت نہیں رہی۔ اس سے رشتوں کا بحران پیدا ہوا، خاندانی زندگی متاثر ہوئی اور انگریز کی حکومت مسلمان کے گھر کے اندر تک داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی شکست یہی تھی کہ جدید تعلیم اور نئی روشنی کی وجہ سے مرد مرد نہیں رہے اور عورتیں عورتیں نہ رہیں۔

ان اشعار سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبر کے نزدیک مردوں کو مجاہد ہونا چاہئے جو میدانوں میں جنگیں لڑیں نہ کہ وہ جو جدید طرز کی سیاست کریں۔ مردانگی کا گہرا تعلق جنگ و جدل سے ہوا کرتا تھا اور مجاہد سچا مرد سمجھا جاتا تھا لیکن جدید زمانے میں مجاہد کے بجائے سیاستدان آگئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

عہدہ دیتے ہیں، سند دیتے ہیں، زر دیتے ہیں
خانساماں وہ مجاہد کو بھی کر دیتے ہیں

لہٰذا جدید تعلیم اور عہدہ نامردی کی جانب لے جاتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ان دنوں یہ احساس عام تھا کہ جدید دور کا مرد اپنی مردانگی کھو بیٹھا ہے جس کی وجہ سے اب وہ جدید دور کی عورت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اکبر بہت مقبول ہوئے کیوں کہ وہ اس وقت کے عام شخص کی سوچ کی عکاسی کر رہے تھے۔ اگرچہ اکبر کا اپنا بیٹا انگلستان میں پڑھ رہا تھا لیکن جہاں عورتوں کی بات تھی، وہاں اکبر کے خیالات بہت قدامت پرست نظر آتے ہیں۔ اکبر کی شاعری ایک

شخص کی سماجی تبدیلی اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت تھی۔ مزاحمت کا تعلق بہت حد تک شناخت اور ذات سے ہوتا ہے۔ اس احساس نامردی کا جدید دور کے ہندوستانی مرد پر بہت گہرا اثر تھا۔ یہی احساس نامردی بہت حد تک عورتوں پر تشدد کی وجہ ہے۔ لیکن اس بات کو سمجھنا اور جان لینا ضروری ہے کہ موجودہ زمانے کا مرد معاشی اور مالی بوجھ تلے دب کر اور زیادہ کمزور اور بے بس محسوس کر رہا ہے۔ وہ کنبے کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اگر کنبے کی کفالت عورت (ماں' بہن' بیٹی) کی کمائی کے ذریعے ہوتی ہے تو وہ بے غیرتی کے احساس سے دو چار ہو جاتا ہے اور غیرت دکھانے کی خاطر تشدد کرتا ہے اور عورتوں پر ہر قسم کی پابندیاں لگاتا ہے۔

یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ تشدد جدید دور کی پیداوار ہے کیونکہ جب سے بنی نوع انسان نے اس کرہ ارض پر قدم رکھا ہے' تشدد کی کوئی نہ کوئی قسم موجود رہی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جدید دور نے ہر قسم کے نئے تشدد کو جنم دیا ہے مثال کے طور پر چولہا پھٹنے سے عورتوں کو ہلاک کیا جاتا ہے' عورتوں پر تیزاب پھینک کر انہیں اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے' اجتماعی زنا بالجبر کا ارتکاب کیا جاتا ہے' عورتوں کے ناک' کان یا دیگر جسمانی اعضاء کاٹ دیے جاتے ہیں اور اکثر ان جرائم کی وجہ غیرت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اکثر کوئی نہ کوئی مالی وجہ ہوتی ہے۔ غربت' بے روزگاری' افراط زر' جہیز کا لالچ پیسے کی دوڑ' یہ تمام جدید عوامل آجکل کے جرائم کی وجوہات ہیں لیکن اکثر تجزیوں میں مردوں کی نفسیات کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ معاشی اور سیاسی بحران کو نہیں دیکھا جاتا۔ اس بات کا تجزیہ نہیں کیا جاتا کہ اگر جدید دور میں مرد ہونے کا مطلب بدل گیا ہے اور مرد ہونا مشکل ہو گیا ہے تو اس امر کا شناخت اور تشدد سے گہرا تعلق ہے۔ شاید مردوں کا یہ ردعمل ہے جو جدید دور کے نئے تقاضوں کے پیش نظر آیا ہے۔ پرانے زمانے میں انہیں مردانہ شناخت ظاہر کرنا مشکل نہ تھی لیکن اب جبکہ عورت کفالت بھی کر رہی ہے' اس کا کردار بدل گیا ہے تو مرد ہونے کے معنی کہاں سے اخذ کئے جائیں؟ عورت تو اب بھی بچہ پیدا کرتی ہے چنانچہ اس کی شناخت کا اتنا شدید بحران نہیں آیا۔ وہ روایتی کردار نبھانے کے علاوہ نئے کردار بھی ادا کر رہی ہے۔ لیکن مرد نہ تو روایتی کردار ادا کر پا رہا ہے اور نہ کوئی نیا کردار اس کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا مطلب' معنی جواز کہاں سے تلاش کرے خاص طور پر اگر وہ بے

MashalBooks.org

روزگار بھی ہو' غریب بھی ہو اور دبے ہوئے طبقے کا بھی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تعلقات' عورتوں پر دوہرے بوجھ اور مرد کے کردار میں کمی کی وجہ سے بہت کشیدہ ہو گئے ہیں۔

جدید دور میں مردانگی اور نسوانیت کے معنی

جدید دور میں مردوں اور عورتوں کے کام میں زبردست فرق آیا ہے۔ عورتوں پر دوہرا بوجھ ہو گیا ہے اور کئی جگہ ان کا کام تین گنا بڑھ گیا ہے جبکہ مردوں کے کام میں کمی آ گئی ہے۔ کیونکہ عورتیں کنبے کی کفالت بھی کرنے لگی ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ جدید دور میں مرد ہونے کا کیا مطلب ہے؟ عورت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ بدلتے ہوئے کرداروں کی وجہ سے عورتوں کو شکایت ہے کہ ان کا کام اگر عورت کرے گی تو ان کو اہمیت کیونکر ملے گی؟ پرانا طرز غیر موزوں ہو گیا ہے اور کوئی نیا ابھی پوری طرح تشکیل نہیں ہوا یہ بحران بنیادی طور پر شناخت کا ہے۔ صنفی شناخت انسان کے خودی کے تصورات سے جڑی ہوئی ہے۔ میں کون ہوں؟ یہ سوال ہر شخص کی زندگی کا بنیادی سوال ہوتا ہے۔ میری زندگی کے معنی کیا ہیں؟ یہ ایک اور بنیادی سوال ہے۔ موجودہ زمانے میں ان سوالوں کے جواب مشکل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ لوگوں نے' افراد نے خود نہیں بدلے بلکہ معاشی صورت حال کے پیش نظر یہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ افراط زر' غربت' بے بسی اور معاشی نظام نے سماجی رشتوں کو بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ پرانے زمانے کے طے شدہ رشتے ٹوٹ گئے ہیں جس کے نتیجے میں بے یقینی کی کیفیت بڑھ گئی ہے۔ پرانے زمانے میں پیدائش کے وقت سے ہی ایک شخص کی زندگی طے شدہ ہوتی تھی اور وہ وہی کردار ادا کرتا تھا جو اس کے طبقے کی وجہ سے معاشرے میں طے تھا۔ صنعتی معاشرے کی آمد سے جہاں ایک طرف نئے مواقع کھلے اور نئی چیزیں ممکن ہوئی ہیں' وہاں پرانے' طے شدہ رشتوں کا تحفظ ختم کر دیا گیا ہے۔ اب انفرادیت آ گئی ہے۔ ہر شخص کو سوچنا پڑتا ہے کہ میں کیا بنوں گا' میں کیا کروں گی' کون سا پیشہ اختیار کرنا ہے' کس جگہ رہائش اختیار کرنی ہے۔ پرانے زمانے میں لوہار کا بیٹا لوہار ہوتا تھا' درزی کا بیٹا درزی اور ترکھان کا بیٹا ترکھان۔ یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ آئندہ کیا ہوگا۔ پشت پیشے اور سوچ اور طور طریقے بدستور قائم رہتے تھے۔ بے یقینی نہیں ہوا کرتی تھی۔ طبقے کی عورت کو بھی اپنے طبقے کے اعتبار سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ زراعت میں عورتوں کا

MashalBooks.org

نمایاں کردار ہوتا تھا اور دیگر کوموں میں بھی ان کے طے شدہ کردار ہوتے تھے۔ صنعتی ترقی اور معاشرتی تبدیلی نے یہ انتشار پیدا کر دیا ہے کہ عورتوں کو بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا کریں۔ جدید مشینوں اور ٹریکٹروں کے آنے سے عورتوں کے زرعی کام پر فرق پڑا کو کیونکہ زراعت پر مردوں کا قبضہ ہو گیا۔ موجودہ زمانے میں خاندان' برادری، ذات پات اور جدی پشتی کام کے تصور کی جگہ اب انفرادی انتخاب آ گیا ہے۔ اپنا پیشہ' کام' کردار خود منتخب کرنے کا حق مل گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ ایک مثبت عمل ہے کہ اب ہر شخص اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکتا ہے اور اس سے خود اعتمادی اور خود مختاری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف انفرادیت کا نقصان یہ ہوا کہ کمیونٹی کا قدیم جذبہ' جو ہر شخص کے لئے باعث تحفظ تھا' ماند پڑ گیا ہے اور ہر شخص ایک لحاظ سے تنہا رہ گیا۔ جہاں رشتوں کی زنجیریں تھیں' وہاں رشتوں کا تحفظ بھی تھا' جہاں کمیونٹی اور برادری کی پابندیاں تھیں اور انفرادی حقوق کم تھے' وہاں برادری کا سہارا بھی تھا اور کوئی اتنا اکیلا نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ چنانچہ ترقی' جدت اور انفرادیت کے اتنے مثبت اثرات نہیں ہوئے' جتنے سمجھے جاتے ہیں جہاں ترقی اور جدت پسندی نے شخصی آزادی میں اضافہ کیا ہے اور طے شدہ کرداروں سے چھڑایا ہے' وہاں انسان کو تنہائی اور بیگانگی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ احساس بیگانگی اور اجنبیت خاص طور پر لوگوں کے جم غفیر سے بھرپور بڑے شہروں کی پیداوار ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کو ذاتی طور پر نہیں جانتے' کوئی کسی کا نہیں ہوتا اور احساس اپنائیت میں شدید کمی ہوتی ہے۔ جدید دور اور ترقی نے جہاں نئی راہیں دکھائیں وہاں لوگوں کو یک جہتی کے احساس سے محروم کر دیا' لوگوں کو آپس میں توڑ دیا اور ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا۔

ترقی کی اس دوڑ میں ہر کوئی ہر کسی کو مات کرنا چاہتا ہے' پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہے اور دوسروں کو شکست دے کر خود فتح حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چیزوں اور اشیاء نے بے انتہا اہمیت اختیار کر لی ہے اور لوگ اشیاء کی خرید سے خود کو بڑا محسوس کرتے ہیں۔ باہمی تعاون' ایک دوسرے کی مدد اور انسان دوستی کے جذبات چیزوں کی دوڑ میں ماند پڑ گئے ہیں۔ روزمرہ کے زندہ رہنے کے مسائل اور روز مرہ کی جدوجہد نے ہر دم مزاحمت کرنا ضروری بنا دیا ہے۔ قدم قدم پر چھوٹی چھوٹی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ہر روز چھوٹی سے چھوٹی سطح پر مزاحمت کرنا پڑتی ہے۔ یہ مزاحمت مردوں اور عورتوں دونوں کو کرنا پڑتی ہے۔ جب کام کی

جگہ پر ناانصافی ہوتی ہے، جب گھر میں حق تلفی ہوتی ہے، جب سڑکوں پر گولیاں چلتی ہیں، جب ہر روز انسان پستا ہے، گرتا ہے، ٹوٹتا ہے، تو ہر روز اسے خود کو اٹھانا پڑتا ہے اور حالت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، یہ مردوں اور عورتوں دونوں کی قسمت بن گیا ہے۔ اگرچہ عوامی جدوجہد جاری رکھنے والوں مل جل کر بے انصافی کا مقابلہ کریں لیکن اجتماعی سوچ جب بالکل ہی انفرادیت کو کچل دیتی ہے تو اس کیا اچھے نتائج نہیں نکلتے۔ جیسا کہ روس میں ہوا اور اب امریکہ میں ذرائع ابلاغ سے اجتماعی سوچ کی تشکیل کی جاتی ہے، جب لوگ انفرادی سوچ سے مکمل انحراف کرتے ہیں تو مزاحمت کی امید اور اس کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ مزاحمت چونکہ ایک شخص کے اندر معاشرے کے جبر کے خلاف پیدا ہوتی ہے اسے پوری طرح سے کچل دینا معاشرے کی موت ہوتی ہے کیونکہ تبدیلی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ ہر شخص تبدیلی کا ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی انفرادیت اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ آزاد، خود مختار اور تنقیدی سوچ کا جذبہ ابھی باقی ہے۔ ایک شخص کیا نفرادی شناخت کا اس کی مزاحمت سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر انفرادیت اس قدر بڑھ جائے کہ ہر شخص تنہا ہو جائے تو اس کے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انفرادیت، جو جدید دور میں بڑھ گئی ہے، ضروری بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اس کا روز مرہ کی اور اجتماعی، دونوں قسم کی مزاحمت سے گہرا تعلق ہے۔ انفرادیت سے سوچنے کا عمل پیدا ہوتا ہے جو امزاحمت کے لئے ناگزیر ہے۔

مزاحمت اور نظریہ حیات

مزاحمت کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص کا واضع نظریہ حیات ہو۔ یہ خاص طور پر اجتماعی نوعیت کی مزاحمت کے لئے ضروری ہے۔ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی نظریہ حیات تو ہوتا ہے لیکن ایک واضع اور شعوری نظریہ حیات اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ کوئی شخص مزاحمت کرے گا۔ اگر نظریہ حیات واضح اور شعوری نہ ہو تو روز مرہ کی مزاحمت تو پھر بھی ہوگی لیکن مزاحمتی تحاریک میں حصہ لینے کا جذبہ کم ہوگا۔ نظریہ حیات بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان کا زندگی کی طرف ایک فلسفیانہ رویہ ہو۔ فلسفیانہ رویے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان ہر وقت سقراط، ارسطو یا افلاطون پر بحث کرتا رہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ زندگی کی جانب

ایک تنقیدی رویہ ہو اور انسان زندگی کے ہر مسئلے پر غور وفکر کرے۔ اپنی ذات کے بارے میں' اپنے بارے میں' اپنے کام کے بارے میں' اپنے رشتوں کے بارے میں غور وفکر کرے اور سوچے ۔کسی بھی بات کو بنا سوچے سمجھے قبول نہ کرے۔ اسے فلسفیانہ رویہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی صورت حال کے ہر پہلوں پر سنجیدگی سے غور کرنا اور اپنے اردگرد کے ماحول اور عوامل کو تنقیدی شعور سے سمجھنا۔ تنقیدی سوچ اور اندازِ فکر اجتماعی مزاحمت کی اولین شرائط ہیں۔

اس باب میں ہم نے موجودہ دور کے نفسیاتی ' سماجی' ذاتی اور جذباتی بحران کے چند بنیادی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اس جائزے میں ہم نے جدید دور کے بدلتے ہوئے سیاسی اور معاشی تقاضوں کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات پر غور کیا۔ ہم نے دیکھا کہ مردوں اور عورتوں کے کردار میں تبدیلیوں کے باعث ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہوگئی ہے اور کشیدگی کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس کشیدگی کی بنیادی وجہ نہ تو مرد ہیں اور نہ عورتیں بلکہ دونوں ہی جدید معاشرے کے پیدا کردہ بحران کے منفی اثرات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ عورتوں پر تشدد مرد نہیں بلکہ ایک طرز معیشت کر رہا ہے جس میں مرد بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ گو عورتوں پر تشدد کا آلہ کار عموماً مرد بنتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہر مرد برا' ظالم یا بے رحم ہے بلکہ اس تشدد کے عوامل معاشرے کے معاشی نظام میں ہیں جس کے تحت جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں کسان عورتیں' مرد اور بچے پسے ہوئے ہیں' سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدور اور ان کے بچے' اور عورتیں ظلم کا شکار ہیں۔ اس نظام کی طرف سے آیا ہوا تشدد ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور اسلحے کی فراوانی کی وجہ سے معاملہ بندوق سے طے کیا جاتا ہے نہ کہ باہمی مذاکرات اور بات چیت سے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کی وجہ سے اس خطے کے مردوں نے خود کو دوسرے ممالک کے غالب مردوں کے مقابلے میں کمزور پایا اور انہیں اپنی مردانگی جاتی محسوس ہوئی جس کا اظہار شاعری اور ناول نگاری میں ہوا۔ شاعری اور ناول نگاری نے انیسویں صدی میں اس بحران کی عکاسی کی اور اس پر تنقید کی۔ اس باب میں کوشش کی گئی کہ عورتوں پر ظلم وتشدد کو محض برے مردوں کا کام نہ سمجھا جائے اور صرف مرد موردِ الزام نہ ٹھہرائے جائیں جو کہ اکثر عورتوں کی تحریروں میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں

کوشش کی گئی ہے کہ تشدد کے تاریخی' سیاسی اور نظریاتی ڈھانچوں پر روشنی ڈالی جائے جو ہمیں تشدد کی تہہ میں نظر آتے ہیں۔ تشدد کے معاشی عوامل کو بے نقاب کیا جائے جو طبقاتی تفریق میں پنہاں ہیں تاکہ تشدد ایک فرد کی حرکت نہ نظر آئے بلکہ ایک سماجی و سیاسی عمل دکھائی دے۔

کیا عورت محض ایک مظلوم ہستی ہے؟

اگلے باب میں اس بات کی نشاندہی کی جائے گی کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح مزاحمت کی پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ عورتوں کے مزاحمت کرنے کے طریقے عام طور پر مردوں سے مختلف ہوتے ہیں' لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہوگا کہ عورت صرف بیچاری ہے' مظلوم ہے' بے بس ہے اور کمزور ہے۔ عورت کا انداز بے شک بالواسطہ ہوتا ہے' وہ شاید بندوق اٹھانے سے کتراتی ہے' اس کا طریقہ شاید اتنا واضح نہ ہو' لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر عورتوں نے بندوق بھی اٹھائی' ڈٹ کر مقابلے بھی کیے اور بغاوت بھی کی۔ عورتوں سے انٹرویو کرنے کے بعد میں بالکل اس بات کی قائل نہیں ہوں کہ عورت ایک غیر متحرک اور مظلوم ہستی ہے' تصویرِ غم ہے جس کی عکاسی علامہ راشد الخیری' مصورِ غم نے بہت دردناک انداز میں اپنی کہانیوں میں کی۔ اس کتاب کا بنیادی تھیسس اور موقف یہ ہے کہ عورت ایک بہادر' مضبوط' سخت جان اور مستقل مزاج ہستی ہے جو بوقت ضرورت بندوق بھی اٹھا لیتی ہے' جیل بھی چلی جاتی ہے اور جنگ بھی کر لیتی ہے اور چاہے تو پھول کی طرح نرم بھی ہے' ہمدرد بھی ہے' رحمدل بھی ہے اور معاف بھی کر دیتی ہے۔ عورت متحرک ہے اور ہر دور میں اس نے اپنی مزاحمت کا اظہار کیا ہے خواہ وہ سخت طریقے سے اور بالواسطہ ہو یا نرم طریقے سے اور بلا واسطہ۔ عورت کی عظمت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ دبائے جانے کے باوجود کمتر اور کمزور کہلانے کے باوجود' ظلم برداشت کرنے کے باوجود اس نے معاشرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ اس نے ہر تہذیب میں' ہر معاشرے میں' ہر ثقافت میں اپنی جرات اور بہادری کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنی علمی اور ادبی صلاحیت کے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ میں اس عام تاثر کو توڑنا چاہتی ہوں کہ عورت بے چاری بری قسمت لے کر پیدا ہوتی ہے' مظلوم ہے' صنف نازک ہے اور چپ چاپ تمام دکھ سہہ لیتی ہے اور اسے اسی لئے بنایا

MashalBooks.org

گیا ہے۔ میرا دعوی ہے کہ عورت طرح طرح حالات کا مقابلہ کرتی ہے چاہے وہ خود مختار ہو کر کرے، کنبے کی کفالت کر کے کرے، جنگ میں لڑ کر کرے یا قربانی دے کر کرے۔ وہ روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی جنگیں بھی لڑتی ہے اور بڑی بڑی آفتوں سے بھی ٹکرا جاتی ہے۔ میرا یہ دعوی بھی ہے کہ صرف اونچے یا متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ عورت ہی مزاحمت نہیں کرتی بلکہ ہر طبقے کی عورت چاہے وہ کسان ہو، مزدور یا پیشہ ور عورت ہو، ظلم و نا انصافی کے خلاف جدوجہد کرتی ہے۔ عورت کی مظلومیت کی تصویر اسے کمزور بنانے کی غرض سے کھینچی جاتی ہے۔ یہ عکاسی ان تعصّبات کے پیش نظر کی جاتی ہے جو عورت کو صنف نازک اور کمزور قرار دیتے ہیں اور ہر وقت مظلوم عورت کا رونا روتے ہیں اور اس پر تشدد کے قصے سناتے ہیں۔ بے شک عورت پر تشدد ہوتا ہے لیکن عورت اس کا بھرپور مقابلہ کرتی ہے اور مرد بھی دبائے اور پیسے جاتے ہیں لیکن عورتوں کو بے چارہ ثابت کرنے میں ٹیلی وژن کے ڈرامے، فلمیں اور افسانے کہانیاں بہت نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عورتوں کو محض اور محض مظلوم ہستی کے طور پر تشکیل دینے میں خواتین مصنفین اور تنظیموں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان تنظیموں نے بھی صرف عورت پر ظلم و تشدد کی داستانیں سنائی ہیں لیکن عورت کی جرات، بہادری اور خندہ پیشانی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی قابلیت کو قطعاً نہیں ابھارا جیسے وہ کوئی بے جان شے ہو کہ جو چپ چاپ ہر بات برداشت کر لے۔ عورت کے متحرک ہونے کا ثبوت عورتوں کی تحریک میں ملتا ہے لیکن خود یہ تحریک عورتوں کو مظلوم زیادہ اور متحرک کم ظاہر کرتی ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم عورتوں کی جدوجہد، عورتوں کی مزاحمت اور عورتوں کے انفرادی اور اجتماعی بہادری کے اعمال کے بارے میں کچھ غور کریں اور انہیں منظر عام پر لائیں۔ اگلے باب میں عورتوں کی مزاحمتی تحریکوں اور انفرادی اعمال کے بارے میں بات کی گئی ہے جس سے یہ تاثر غلط ثابت ہوتا ہے کہ عورت غیر متحرک ہے اور مظلوم ہے، اس کی عظمت کے کارنامے بھی سامنے آتے ہیں۔ عورتوں کے مزاحمتی انداز پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کیونکہ چند نفسیاتی وجوہات کی بنا پر عورت کے مزاحمتی انداز مردوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

دوسرا باب

عورت اور مزاحمت : ایک تاریخی پس منظر

جب سے بنی نوع انسان نے دنیا میں قدم رکھا ہے' عورت حالات کا مقابلہ کرتی آئی ہے اور اس نے اپنی جرات اور شجاعت کے کارنامے دکھائے ہیں۔ مزاحمت عورت کی بھی اتنی ہی میراث ہے جتنی کہ مرد کی ۔عورتوں نے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کیا ہے' آسمانی اور قدرتی آفتوں کا بھی اور انسان کی پیدا کردہ مصیبتوں کا بھی۔ اس نے جنگوں میں بھی حصہ لیا اور ظالمانہ معاشروں ظالم حکمرانوں اور بادشاہوں کے خلاف بھی کھڑی ہوگئی۔ اس کی مزاحمت کے ظاہری انداز بھی رونما ہوئے اور بالواسطہ قسم کے طریقے بھی دیکھنے میں آئے۔عورت کی مزاحمت نے اجتماعی اشکال بھی اختیار کیں اور انفرادی سطح کی مزاحمت کا اظہار بھی کیا۔ اسے سزائیں بھی دی گئیں' جلایا بھی گیا' مثال کے طور پر جون آف آرک کو نذر آتش کیا گیا۔لیکن عورت نے ہمیشہ مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔

اجتماعی مزاحمت کی تحریکیں

عورتوں نے مختلف اداروں میں مختلف قسم کے امور اور مسائل پر تحریکیں چلائیں جن میں سے کچھ عالمی سطح پر مشہور ہیں۔ یہ تحریکیں دنیا کے مختلف خطوں میں چلائی گئیں اور ان میں سے کچھ بہت کامیاب ہوئیں۔ سیاسی اور شہری حقوق کی تحریکوں سے لے کر ماحول کے تحفظ کی تحریکوں تک عورتوں نے زندگی کے ہر مسئلے پر اپنی آواز بلند کی۔عورتوں کے اتحاد' یک جہتی اور باہمی تعاون کی مثالیں ان کی عظمت' مضبوطی' خندہ پیشانی اور مستقل مزاجی کا ثبوت ہیں اور اس مفروضے کی نفی کرتی ہیں کہ عورت ایک کمزور اور مظلوم ہستی ہے۔ یہاں عورتوں کی اجتماعی عمل کی تحریکوں کا مختصراً ذکر ضروری ہے۔

MashalBooks.org

سیاسی وشہری حقوق کی تحریکیں

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے پہلے دوعشروں میں یورپ اور امریکہ میں خواتین نے ووٹ دینے کے حق کے لئے تحریک چلائی۔ اس تحریک کا اثر دنیا کے دوسرے کئی ممالک پر بھی پڑا' خاص طور پر جو ملک یورپی ممالک کی نو آبادی تھے۔ ووٹ ڈالنے کا حق اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک عورت مکمل شہری ہے اور قانون ساز اسمبلیوں میں نمائندے بھیجنے کا حق رکھتی ہے۔ اس طرح قانون سازی کے عمل میں اس کی آواز شامل ہوسکتی ہے۔ اس طرح عورتوں نے ملک کی حکومت کو چلانے اور اس کے سیاسی و معاشی امور میں اپنی شمولیت کو یقینی بنایا۔ عورت کی شمولیت کے بغیر جمہوریت نامکمل رہتی ہے کیونکہ نصف آبادی کو قانون سازی سے دور رکھ کر جمہوریت لنگڑی لولی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عورت بھی قوانین کے تابع ہوتی ہے' اسے حق ہے کہ ان تمام عوامل میں پوری طرح شامل ہو جو قوانین بنانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اگرچہ پاکستانی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہے لیکن یہ حق بنیادی وجہ سے پوری طرح حاصل نہیں کیا جاسکا۔ عورت کو ابھی تک یہاں کی روایات کے مطابق مکمل فرد یا شہری نہیں سمجھا جاتا ۔ والد' شوہر' بھائی یا بیٹا جس کو ووٹ ڈالنے کو کہتے ہیں وہ اسے ہی ووٹ ڈال دیتی ہے اور یہ فیصلہ انفرادی طور پر نہیں کرتی ۔ صرف جب 1970ء کے انتخابات ہوئے تو کہا جاتا ہے کہ عورتوں نے اپنے ہی گھر کے مرد حضرات کے خلاف مزاحمت کر کے ذوالفقار علی بھٹو کے لیے ووٹ ڈالے۔ یہ ان کی عقل و فہم اور زندہ دلی کی نشانی تھی کہ انہوں نے مردوں کے کہنے کے باوجود اپنا حق رائے دہی خود استعمال کیا۔ تاہم قبائلی اور جاگیر دارانہ علاقوں میں عورتیں اکثر ووٹ نہیں ڈالتیں کیونکہ وہاں کی روایات کے مطابق سیاسی اور پبلک سطح کے کاموں سے عورتوں کو دور رکھا جاتا ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عورتوں کے لئے جو مخصوص نشستیں مقرر کی گئی تھیں وہ ختم ہوگئی ہیں اور ابھی تک بحال نہیں ہوئیں۔ بے شمار وعدوں کے باوجود تمام حکومتیں عورتوں کی مخصوص نشستیں بحال کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس طرح قانون ساز اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی بہت کم ہے لیکن اس کے لیے جدوجہد بدستور جاری ہے۔ اس کام

MashalBooks.org

میں عورتوں کے حقوق کی تنظیم عورت فاؤنڈیشن پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس بات پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت اپنے مقاصد کے لیے شریعت کا استعمال کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس حکومت نے اپنی مرضی کی شریعت کے نفاذ کے لیے پندرھویں ترمیم کا بل پیش کیا ہے۔ نہ صرف یہ سچ ہے کہ یہ ترمیم جمہوریت کی جڑیں کاٹ دے گی اور ایک شخص کو آمرانہ طرز کا لیڈر بنا دے گی، بلکہ شریعت کے نفاذ کا ثبوت عورتوں کے حق پر پابندی لگا کر دیا جائے گا۔ ضیاءالحق کے دور کی طرح معیشت اور سیاسی امور پر تو شریعت نافذ کرنا ناممکن ہوگیا تھا لیکن عورتوں کے حقوق پر یکے بعد دیگرے پابندیاں لگا کر خود کو سلام کا علمبردار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر ایک کمزور اور گھبرائی ہوئی حکومت جو غلط پالیسیوں کی وجہ سے مقبولیت کھو بیٹھی ہے، عورتوں پر بے جا پابندیاں لگا کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دے گی۔ شریعت کی ایسی تشریح کی جائے گی جو شخص آمریت کو فروغ دے گی اور عدلیہ اور تمام دیگر جمہوری ادارے اس کی ذاتی خوشی کے تابع ہو جوئیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورتوں کے ساتھ وہی سلوک ہو جو افغانستان میں طالبان نے کیا یا ایران اور سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ انہیں دفتروں میں کام کرنے سے روک دیا جائے، اور پردے کی بے جا پابندیاں لگا کر ملکی امور سے علیحدہ کر دیا جائے۔ لیکن عورتیں اس بل کی منظوری کے خلاف زبردست احتجاج کر رہی ہیں اور ملک کے مختلف شہروں میں جلوس جلسے نکالے جار ہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقوق کبھی مستقل اور دائمی نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے ہر دم لڑنا پڑتا ہے اور ہر وقت چوکنا رہنا ہوتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کب کس حق کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن پاکستان کی عورتوں نے بار ہا اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ ہر ایسے قدم کی شدید مخالفت کریں گی جو ان کے حقوق کو پامال کرنے کی غرض سے اٹھایا گیا ہو اور ملک کو عہد وسطی کی طرز کے مذہبی جنون سے ہمکنار کر دے۔

سیاسی و سماجی حقوق کی تحریک کا تاریخی پس منظر

ہندوستان کی عورتوں کی سیاسی و سماجی حقوق کے لیے تحریک 1997ء میں شروع ہوئی ۔ اس وقت ہندستان کی 14 عورتیں سروجنی نائڈو کی قیادت میں مونٹی گیو سے ملیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جب ہندوستان کے عوام کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا جائے تو عورتوں کو بھی

اس میں شامل کیا جائے۔ مزید انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی قانون ساز کونسل کے ارکان کو عوام کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے۔ اس اعلانئے میں عورتوں نے تعلیم اور سماجی بہبود کے حقوق کا مطالبہ بھی کیا۔ (1)اس کے بعد 1919ء میں مسز اینی لیسٹ اور سروجنی نائیڈو حق رائے دہی کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان کے بلدیاتی کمیشن سے ملیں۔ سب سے پہلے دہی کا حق 1921ء میں مدراس کی قانون ساز کونسل نے دیا۔ 1932ء میں ہندوستانی خواتین آئین ساز کمیٹی سے ملیں اور اپنے مطالبات پیش کئے۔ 1929ء میں جب گول میز کانفرنس ہوئی تو آل انڈیا ویمن کانفرنس نے عورتوں کی نمائندگی کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ 1932ء میں آل انڈیا ویمن کانفرنس نے بنیادی حقوق، عورتوں کی نمائندگی اور رائے دہی کے بارے میں اپنے مطالبات دہرائے۔

دوسرے گول میز کانفرنس کے موقع پر ویمن کانفرنس نے بالغ رائے دہی، مخلوط انتخابات اور مخصوص نشستوں کے خلاف مطالبہ کیا کہ عورتیں برابری سے انتخابات لڑکر مردوں کے شانہ بشانہ اسمبلیوں میں آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ مخصوص نشستوں کا تصور عورتوں کی کمزوری ظاہر کرتا ہے اور یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ عورتیں عام انتخابات نہیں لڑسکتیں۔ مزید مخصوص نشستوں سے قانون ساز اسمبلی کا منتخب کردار متاثر ہوتا ہے۔

گاندھی کی ستیہ گرہ کی تحریک کے دوران ہزاروں عورتوں نے نمک بنانے کے قانون کو توڑنے میں حصہ لیا۔ 1929ء سے لے کر 1930ء کے مجلس اقوام (League of Nations) کے جینوا کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے ہندوستانی وفد میں راجکماری امرت کور شامل ہوئیں۔ 1942ء میں آل انڈیا ویمن کانفرنس نے عورتوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا چارٹر پیش کیا تا کہ ان کے حقوق کے تحفظ دیا جائے۔

ان تمام مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ برصغیر کی خواتین کس قدر متحرک تھیں اور انہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں کس قدر جرات مندانہ مطالبات کیے اور سیاسی اور شہری حقوق کے لیے اتنی جدوجہد کی۔ اس سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی جدوجہد اور عورتوں کی مزاحمت مغربی ممالک کی پیداوار ہے اور وہاں سے آئی ہے۔ شاہدہ لطیف اپنی کتاب میں یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ عورتوں کی تحریک ہندوستان میں اتنی ہی سرگرم تھی جتنی کہ یورپ اور امریکہ میں۔ یہ کہنا ہرگز

MashalBooks.org

صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان کی عورتوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ مغربی عورت کو دیکھ کر کیا۔(2)

سماجی حقوق کی تحریکیں

جہاں ایک طرف عورتوں نے سیاسی حقوق اور شہری آزدیوں کے مطالبات کئے' وہاں انہوں نے سماجی اصلاح کے مطالبات بھی کیے۔ 1927ء میں آل انڈیا ویمن کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ کم عمری کی شادیوں پر پابندی لگائی جائے۔ انہوں نے شادی کی کم سے کم عمر سولہ برس مقرر کرنے کو کہا۔ 30۔ 1929ء میں یہ مسئلہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں ویمن کانفرنس کا ایک وفد وائسرائے، محمد علی جناح اور پنڈت مدن موہن سے ملا۔ مدراس کی اسمبلی نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ 1929ء میں مرکزی اسمبلی نے شادی کی کم سے کم عمر لڑکیوں کے لیے 14 اور لڑکوں کے لیے 16 مقرر کر دی۔ 1931ء میں عورتوں نے مطالبہ کیا کہ اس قانون کو موثر بنایا جائے۔

1934ء میں ویمن کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ ہندو اور مسلمان عورتوں کی عمومی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ اس پر ہزاروں عورتوں نے دستخط کئے۔ بڑودا کی ریاست نے طلاق کے معاملے میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق دے کر عورتوں کی تحریک کو مزید مستحکم کیا۔ ویمن کانفرنس نے مطالبہ کیا تھا کہ اسلامی قانون میں عورتوں کو جو طلاق کا حق حاصل ہے اسے منظور کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ انگریزی عدالتوں میں اس حق کو تسلیم کیا جائے اور اس کا موثر اطلاق ہو۔ 1929ء میں ہندوستان کی خواتین کی تنظیموں نے تحریک چلائی کہ جائیداد کی وراثت اور کنٹرول میں عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں۔ یہ بل 1936ء میں اسمبلی میں پیش ہوا اور اس کا مقصد تھا کہ ہندو بیوہ عورتوں کو مرحوم شوہر کی جائیداد میں سے حصہ ملے۔

عورتوں کی کانفرنس نے ہندو کوڈ کے ظالمانہ قوانین کو ختم کرنے کے لیے بھی جدوجہد کی۔ عورتوں کے مسلسل مطالبے پر عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے حکومت نے ایک خاتون کو قانون ساز اسمبلی میں عورتوں کی نمائندہ کے طور پر مقرر کیا۔

آل انڈیا ویمن کانفرنس نے اخلاقی اور سماجی اصولوں کی بنیاد پر عورتوں کی تباہی اور خرید وفروخت اور عصمت فروشی کے خلاف تحریک چلائی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ عورتوں

کی تجارت کو روکا جائے اور مندروں میں لڑکیاں بطور داسی دے دینے کی روایت کی سخت مذمت کی۔

جب اقوام متحدہ قائم ہوئی تو آل انڈیا ویمن کانفرنس نے اس کی رکنیت اختیار کی۔عورتوں کی کانفرنس اقوام متحدہ کی سماجی اور معاشرتی کونسل کی مشاورتی رکن مقرر ہوئی۔ ویمن کانفرنس نے نسلی امتیاز اور رنگ ونسل اور ذات پات کی تفریق کے خلاف بھی مہم چلائی۔انہوں نے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی تیاری میں حصہ لیا۔

مذکورہ بالا تمام اقدامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں نہ تو سیاسی اور شہری حقوق سے غافل تھیں اور نہ سماجی اصلاح سے ناواقف تھیں۔انہوں نے ہر میدان میں اپنی آواز بلند کی اور کئی حقوق تسلیم بھی کروائے۔تاریخ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ عورت باشعور بھی تھی اور متحرک بھی' بیدار بھی تھی اور سرگرم عمل بھی ۔اس میں حوصلہ بھی تھا اور لڑنے کا عزم بھی' ہمت بھی تھی اور قوت ارادہ بھی ۔یہ مفروضہ غلط نظر آتا ہے کہ وہ ایک غیر متحرک' بے جان' مظلوم ومحکوم ہستی تھی۔جو مسائل عورتوں نے اٹھائے' ان کے تجزیے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی خواتین کی تحریک مغرب سے متاثر نہیں تھی کیونکہ جو ایشوز اس نے اٹھائے ان کا تعلق ہندوستان کے حالات سے تھا' مثال کے طور پر بیوہ کی دوسری شادی' ستی کی رسم اور مسلمان عورتوں کا طلاق کا اسلامی حق اور وراثت میں حصے کا اسلامی حق۔اس لیے یہ سوچنا کہ عورتوں کی تحریک محض مغربی سوچ کی علامت ہے' صحیح نہیں دکھائی دیتا۔تاہم جمہوریت' انفرادیت اور قوم پرستی جو کہ نو آبادیاتی نظام سے حاصل ہوئیں' وہ قدریں مردوں نے پوری طرح اپنائیں اور اگر جمہوری نظام مغربی سوچ کی عکاسی کرتا ہے تو پھر مردوں کی حق خود ارادیت اور آزادی کی تحریکیں بھی مکمل طور پر مغربی تھیں۔عجیب بات یہ ہے کہ صرف عورتوں کو مغرب زدگی کا طعنہ دیا جاتا ہے جبکہ ان کے اٹھائے ہوئے مسائل ہندوستانی تھے اور اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے ہم آہنگ تھے۔لیکن مردوں کے مغرب زدہ ہونے کا طعنہ نہیں دیا جاتا حالانکہ انہوں نے دھوتی چھوڑ کر پتلون کوٹ اپنایا' جمہوریت اپنائی' انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس اپنائی ۔اس تضاد پر غور وفکر ضروری ہے کیونکہ جب بھی عورتیں اپنے جائز معاشرتی اور اسلامی حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں تو ان پر ایک دم مغرب سے متاثر ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے یہ الزام مردوں پر کبھی

نہیں لگایا جاتا۔

قومی آزادی کی تحریکیں

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر بہت سی نو آبادیوں میں قومی آزادی کی تحریکیں چلیں جس کے نتیجے میں تیسری دنیا کا تصور ابھرا جس میں وہ ممالک شامل ہیں جو یورپی تسلط سے آزاد ہوئے۔ بلا واسطہ سامراجی تسلط کا اختتام ہوا گو بالواسطہ قسم کا سامراجی تسلط آج بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں' آئی۔ ایم ایف اور عالمی ترقیاتی بینک کی شکل میں موجود ہے۔ حق خودارادیت کی تحریکوں میں مختلف ممالک کی عورتوں نے نمایاں کردار ادا کیا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاکستان کی تحریک آزادی میں بیگم شاہنواز' بیگم سلمی تصدق حسین اور بیگم نسیم جہاں کے علاوہ اور بھی بہت سے نام نمایاں ہیں۔ 14 سالہ صغری بی بی نے مسلم پرچم سیکرٹریٹ کی عمارت پر لہرایا۔ ہزاروں کی تعداد میں عورتوں نے جلوس جلسے نکالے اور برطانیہ کی حکومت کے اقدامات کی مذمت کی۔ انہوں نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مطالبات کیے اور احتجاجی جلوسوں کی وجہ سے بہت سی خواتین کو قید کیا گیا اور ان پر لاٹھی چارج ہوا۔

فرانس کے خلاف الجزائر کی قومی آزادی کی تحریک میں بھی عورتوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کی برطانیہ سے جنگ آزادی کے دوران عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ 1989ء کے فرانسیسی انقلاب کے دوران بھی عورتوں کا جلوس ہاری ایٹونٹ کے پاس گیا اور ملکہ نے انہیں کہا کہ اگر روٹی نہیں ہے تو کیک کھا لو۔ ملکہ اور بادشاہ کا سر قلم کروانے میں بھی عورتوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اسی طرح فلسطینی عورتوں نے اسرائیل کی بربریت اور تشدد کے خلاف ناقابل فراموش جنگی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیلیٰ خالد نے تو ہوائی جہاز تک ہائی جیک کیے۔ آزادی کشمیر کی جدوجہد میں کشمیر کی خواتین پوری طرح سرگرم عمل ہیں اور بے مثال قربانیاں دے رہی ہیں۔

اس قسم کی تحریکوں میں شامل ہونے کے باعث عورتوں کو گھر کی دنیا چھوڑ کر باہر نکل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کا شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ بطور خواتین اپنے حقوق سے آگاہ ہو جاتی ہیں۔ قومی آزادی کی جنگ میں حصہ لینے سے ذاتی آزادی کی جنگ کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر صورتوں میں جب قومی آزادی

حاصل کر لی جاتی ہے تو عورتوں کو اسی قوم کا واسطہ دے کر واپس گھر میں بند کر دیا جاتا ہے' ان کی جنگی کارناموں کو جھٹلا دیا جاتا ہے اور ان کو ملکی امور یعنی سیاست اور معیشت سے یہ کہ کر علیحدہ کر دیا جاتا ہے کہ عورت کا مقام گھر ہے اور اسے گھریلو ذمہ داریوں اور ماں کے کردار کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچنا چاہیے۔ یہی فلسطین میں ہوا۔ الجزائر میں ہوا اور پاکستان میں بھی اکثر جنگ آزادی میں عورتوں کے بھرپور کردار کو جھٹلا کر انہیں گھر کی چار دیواری میں قید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ مذہب' تہذیب اور روایتی اقدار کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں یہ کوشش عروج پر تھیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ عورتوں کو ملازمت کی اجازت نہ دی جائے اور گھروں میں بند کر دیا جائے۔ لیکن یہ اس لیے نہ ہو سکا کہ دیہات کی عورت کے کام کے بغیر کسان کا کنبہ روٹی نہیں کھا سکتا۔ عورتوں کی تنظیموں نے بھی اس مجوزہ اقدام کی شدید مخالفت کی۔

اس تضاد پر بھی غور کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ قومی آزادی' شخصی آزادی اور انفرادی یا مردوں کی آزادی کو تو اچھی بات سمجھا جاتا ہے لیکن عورت کی آزادی کو بدچلنی اور بد اخلاقی سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ وہی لفظ جو قوم کے لیے اور مردوں کے لیے ایک بہت مثبت چیز سمجھا جاتا ہے' عورتوں کے لیے منفی معنی اختیار کر لیتا ہے۔ آزاد عورت بدکردار اور بری عورت تصور کی جاتی ے جبکہ آزاد قوم اور آزاد فرد بہت اچھے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہاں پچھلے باب میں دیئے گئے دلائل کو یاد رکھنا ضروری ہے کیونکہ موجودہ زمانے کا مرد خود کو کمزور' بے بس اور نامرد تصور کرنے لگا ہے' وہ عورت کی آزادی سے خوفزدہ رہتا ہے۔ اگر عورت ملازمت کرے گی اور دفتر جائے گی' تنخواہ لے کر آئے گی اور دوسرا یہ کہ مرد پھر اپنی مردانگی کس طرح ظاہر کرے گا۔ یہ خوف طالبان کے اقدام میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے کیوں کہ انہوں نے اسلام کی آڑ میں عورتوں کی تعلیم اور ملازمت دونوں پر پابندی لگا دی ہے جبکہ اسلام ایسی کوئی پابندیاں نہیں لگاتا۔ نامردی کا خوف خود کو کئی کئی صورتوں میں ظاہر کرتا ہے۔ دنیا کے چھوٹے۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک امریکہ جیسی طاقت کے تسلط سے ڈر کر خود کو کمزور محسوس کرتے ہیں۔ اس احساس کمزوری سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ مذہب کا سہارا لے کر عورتوں پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔

خواتین محاذ عمل کی تحریک

اگرچہ قیام پاکستان کی تحریک میں بے شمار خواتین نے حصہ لیا اور نمایاں کردار ادا کیا، پاکستان بننے کے بعد چند مفاد پرست رہنماؤں نے مذہبی بنیادوں پر خواتین کے حقوق کچلنے کی کوشش کی ۔ وہی علماء جو قیام پاکستان کے مخالف تھے، پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کی غرض سے طاقت حاصل کرنے کے چکروں میں پڑ گئے ۔ 1949ء کی قرار داد مقاصد کو آئین کا حصہ بنادیا گیا اور اسلام کی تشریح مفاد پرست عناصر نے اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر کی ۔

تاہم جنرل ایوب خان کے دور میں مذہبی علماء کو اس قدر طاقت حاصل نہ تھی چنانچہ 1961ء میں آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (APWA) کی کاوشوں کے نتیجے میں عائلی قوانین منظور کیئے گئے جن کے تحت عورتوں کی طلاق کا حق ملا اور بچوں کی تحویل کے معاملے میں کچھ حقوق ملے۔ شوہر کی دوسری شادی کے بارے میں بھی عورت کی اجازت لازمی قرار دی گئی اور شادی کا اندراج لازمی ہوگیا۔ یہ چند اقدامات عورتوں کے نقطہ نظر سے مثبت اور ترقی پسند تھے ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ علماء کی طاقت بڑھی اور یہ چند حقوق بھی ان کی مفاد پرستی کا نشانہ بننے لگے۔

ان رہنماؤں نے اسلام کی طرح تشریح کی کہ عورتوں کی شہری آزادیاں اور بنیادی حقوق خطرے میں پڑ گئے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ علماء جو اس ملک کے بنانے کے خلاف تھے، طاقتور ہوگئے اور جن عورتوں نے اس ملک کے قیام کے لیے جدوجہد کی اور سرگرم رہیں، وہ دوسرے درجے کی شہری بن گئیں۔ انہیں زبردستی پردے اور چار دیواری میں غائب ہو جانے کو کہا گیا۔ تحریک پاکستان میں ان عورتوں کی جدوجہد فراموش کر دی گئی جب انہوں نے پاکستان کے لیے سڑکوں پر ڈنڈے کھائے تھے۔

ایوب خان کے دور میں تو علماء کی طاقت کم رہی کیونکہ ایوب خان جدت پسند، ترقی پسند اور روشن خیال تھا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے ابتدائی مراحل میں علماء نے بہت طاقت حاصل کر لی اور انہیں خوش کرنے کی غرض سے دکھاوے کے اسلامی اقدامات کیے گئے مثلاً جمعہ کی چھٹی، شراب خانوں اور جوا خانوں پر پابندی ۔ بھٹو کی کمزوری کا فائدہ

MashalBooks.org

اٹھا کر علماء نے اس کے خلاف نظام مصطفیٰ نافذ کرنے کے لیے ۔ پی این اے کے نام سے محاذ قائم کیا۔ انتخابی بدعنوانیوں اور دھاندلی کے خلاف تحریک نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا اور جمہوریت کا خاتمہ کر دیا۔ جنرل ضیاء نے خودکو اسلام کا سب سے بڑا علمبردار اور امیر المومنین ظاہر کرنے کی خاطر عورتوں کی آزادی اور حقوق پر یلغار کردی۔ وہ معیشت اور دیگر امور میں تو اسلام نہ لا سکا' لیکن عورتیں اور مذہبی اقلیتیں اس کی اسلامائزیشن کا مرکزی نشانہ بن گئیں۔

اسلام کے نام پر یکے بعد دیگرے ایسے قوانین بنائے گئے جن کا مقصد عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید کرنا تھا۔ ان قوانین میں خاص طور پر 1979ء کا حدود آرڈی نینس بد نام ہے جو زنا اور زنا بالجبر میں تفریق نہیں کرتا۔ چنانچہ مرضی سے کیئے ہوئے فعل اور زبردستی کیئے ہوئے فعل میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ایک عورت جس پر زبردستی جنسی تشدد کیا گیا ہو اسی سزا کی حق دار ٹھہرائی جاتی ہے جو ایک ایسی عورت کو دی جاتی ہے جو اپنی مرضی سے زنا میں شامل ہوئی ہے۔ زنا بالجبر ثابت کرنا اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ عورتوں کے لیے یہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا کہ ان کے ساتھ زبردستی ہوئی اور ایک عورت نے خود رپورٹ لکھوائی تو وہ زنا کی مرتکب قرار دی گئی۔ یہ قانون انصاف کے تمام تقاضوں کے ایسے پامال کرتا ہے کہ سوچا بھی نہیں جاسکتا ۔ اس قانون کے آنے سے زیادہ سے زیادہ عورتیں جرائم کے دائرے میں پھنس گئیں۔ عورتوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد مجرم بن گئی کیونکہ اگر عورت تھانے میں رپورٹ نہ بھی لکھوائے تب بھی اس کا جسم حمل کے ذریعے اس بات کی گواہی دے دیتا ہے کہ جنسی فعل کا ارتکاب ہوا ہے ۔ اس طرح مرد' جو کہ اصل مجرم ہوتا ہے بچ جاتا ہے کیونکہ اس کا جرم ثابت کرنے کے لیے چار مرد مسلمان گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت جس پر تشدد کیا جاتا ہے گناہ گار بن جاتی ہے۔ یہ قانون اس قدر غیر منصفانہ ہے کہ جب سے اس کا اطلاق ہوا ہے جہاں دس عورتیں جیلوں میں نظر بند ہوتی تھیں' وہاں سو ہوگئی ہیں۔ (3)

ان عورتوں میں بیشتر وہ ہیں جو غریب طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں مثال کے طور پر گھریلو خادمائیں' لہٰذا یہ قانون نہ صرف صنفی اعتبار سے بلکہ طبقاتی نقطہ' نظر سے بھی بے حد غیر منصفانہ' ظالمانہ اور غیر اسلامی ہے۔ اس قانون کے تحت ایک نوجوان نابینا لڑکی صفیہ بی بی جو جاگیردار کے گھر کام کرتی تھی اور جس پر جاگیردار کے بیٹوں نے جنسی تشدد کیا تھا'

MashalBooks.org

کو سنگسار کرنے کی سزا سنائی گئی۔ اس نوجوان لڑکی کی عمر محض 16 برس تھی' وہ غریب اور بے بس بھی تھی اور نابینا بھی۔ عدالت کے فیصلے پر عورتوں کی تنظیموں اور باضمیر افراد نے اتنا احتجاج کیا کہ عدالت کو فیصلہ بدلنا پڑا' لیکن اس مشہور کیس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قانون میں طاقتور افراد کے طبقاتی اور صنفی مفادات پنہاں ہیں اور اس قانون کا مقصد انصاف فراہم کرنا نہیں ہے۔ بدقسمتی سے آج بھی یہ قانون رائج ہے اور اس کی زد میں سینکڑوں عورتیں پھنسی ہوئی ہیں۔ خدشہ ہے کہ پندرھویں آئینی ترمیم سے اس ظلمانہ قانون کو مزید تقویت ملے گی۔

حدود آرڈی نینس کے علاوہ ضیاء الحق کے دور میں' 1984ء میں قانون شہادت نافذ ہوا۔ اس کے تحت چند معاملات میں عورت کی گوہی مرد کی گواہی سے آدھی تھی یعنی دو عوتورں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دی گئی۔ اس کے خلاف بھی بہت احتجاج ہوا کیونکہ عورت کی عقل اور فہم و فراست کو مردوں کے مقابلے میں آدھا کہا جا رہا تھا جبکہ موجودہ زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی ذہانت اور عقل میں عمومی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ عورتوں کی زندگی کی قدر و قیمت کو بھی مردوں کی زندگی کی قدر و قیمت سے نصف بنا دیا گیا جب قصاص اور دیت آرڈی نینس کے مطابق عورت کی زندگی کی دیت نصف قرار پائی۔ اول تو انسانی زندگی کو پیسوں کے ترازوں میں تولنا ہی غیر انسانی بات ہے لیکن عورت کی زندگی کی قدر و قیمت کو کم کرنے عورت کی حیثیت بطور ایک فرد اور شہری کے ختم کرنے کے برابر ہے۔ اگر عورت قومی ریاست کی مکمل شہری نہیں ہے۔ نصف ہے' تو وہ ٹیکس کیوں اتنے ہی دے جتنے کی مرد' سزا کیوں اتنی ہی بھگتے جتنی کہ مرد۔ اس پر ٹیکس بھی آدھے اور سزائیں بھی نصف ہونی چاہیں۔ لیکن انسانوں کو اعداد و شمار کے بازاری کھیل میں ڈھال دینا انسانیت کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔

ضیاء الحق کے دور میں ان کالے قوانین کے علاوہ ذرائع بلاغ، تعلیم' عدالتی نظام اور کھیلوں کے میدان میں بھی متعدد ایسے اقدامات کئے گئے جو عورتوں کے بنیادی شہری کی حقوق تردید کرتے تھے۔ ٹیلی وژن کی اناؤنسروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھیں۔ اس طرح شخصی آزادی ختم کی گئی کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے یہ فیصلہ نہ کرے کہ وہ کیسا لباس پہننا چاہتا ہے۔ اشتہارات میں آنے والی خواتین کے روزگار کے مواقع پر پابندیاں لگائی

گئیں۔ گویہ سچ ہے کہ اشتہارات سرمایہ داری نظام میں خرید پیدا کرنے کی غرض سے عورت کے جسم کو بطور بے جان شے استعمال کرتے ہیں' لیکن جس معاشرے میں روزگار کے مواقع محدود ہوں اوور عورتوں کو خود کفالت کرنی پڑے' وہاں ان پر پابندیاں ان کا روزگار چھیننے کے برابر ہوتی ہیں۔ کئی عورتیں پورے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے کام کرتی ہیں اور اگر ان کی نوکری چلی جائے تو پورا کنبہ بھوک و افلاس سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ضیاء الحق کے دور ہی میں عورتوں کی ہاکی ٹیم کو بیرون ملک ہاکی کھیلنے سے روکا گیا۔ عورتوں کے لیے علیحدہ یونیورسٹی کے منصوبے بنائے گئے جن میں انہیں صرف امور خانہ داری اور چند ''نسوانی'' مضامین پڑھانے کا ارادہ تھا۔ اس طرح بہت سے اقدامات عورتوں کو سیاست' معیشت اور معاشرے کے اہم امور سے علیحدہ رکھنے کی غرض سے کئے گئے۔ ان تمام اقدامات کا مقصد تھا کہ عورتوں کو چند طے شدہ کرداروں میں ڈھال دیا جائے جو بنیادی طور پر صرف گھر کے اندر کی دنیا سے متعلق ہوں۔ تجارت' کاروبار اور سیاست کی اہم اور طاقتور سے عورتوں کو باہر رکھا جائے۔

انہی دنوں ڈاکٹر اسرار نے مطالبہ کیا کہ خواتین سے روزگار چھین لیا جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ صرف گھروں کے اندر کے کام کریں۔ بلامعاوضہ کام کی وجہ سے عورت کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ افغانستان میں طالبان نے جو اقدامات اٹھائے ہیں کوشش کی گئی کہ عورتوں کے ساتھ وہ اقدامات ہوں۔ لیکن حکومت اس بارے میں کچھ نہ کر سکی۔ کیونکہ خواتین کا معیشت میں اس قدر اہم کردار ہے کہ ان کے کام کے بغیر زراعت تباہ ہوسکتی تھی۔ چنانچہ عورتوں کو روزگار حاصل کرنے سے تو نہ روکا گیا لیکن ان پر ہر قسم کی بے جا پابندیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ نتیجے میں ایک ایسا ماحول قائم ہوا کہ عورتوں کے خلاف تشدد کی وارداتیں بڑھ گئیں اور خوف و ہراس کی فضا پیدا ہوگئی۔ ہر ایسا شخص جو خود کو اسلام کا علمبردار سمجھتا تھا۔ اپنا حق سمجھنے لگا کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے اور جیسے چاہے عورتوں کو ہراساں کرسکتا ہے اور ان پر تشدد کرسکتا ہے۔ اسلام کے نام پر ایک ایسا معاشرہ قائم کیا گیا جو اسلامی اقدار سے بہت دور تھا لیکن اس میں درندگی اور بربریت بھرپور تھی۔ اس گھٹن سے بھرپور ماحول میں پبلک کی جگہ پر عورتوں کو مارا پیٹا گیا' برہنہ حالت میں بازاروں سے گزارا گیا' سب کے سامنے بے آبرو کیا گیا اور ہراساں کیا گیا۔ اسلام کے نام پر بنائے گئے

قوانین کو ذاتی دشمنوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔

اس تشویشناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے 1981ء میں کراچی میں خواتین محاذ عمل کا قیام ہوا۔ جب فہمیدہ اور اللہ بخش کیس حدود آرڈی نینس کے تحت زیر سماعت ہوا تو عورتوں کو پوری طرح احساس ہوا کہ اب آواز بلند کرنی ہوگی کیونکہ عورتوں کے تھوڑے بہت حقوق پر بھی بدستور حملے ہو رہے تھے۔ اکتوبر 1981ء میں کراچی کے بعد خواتین محاذ عمل کی تحریک کا زیادہ زور امتیازی قوانین پر رہا اور اس نے حدود آرڈی نینس' قصاص اور دیت آرڈی نینس اور قانون شہادت کے خلاف بھرپور تحریک چلائی۔ اس میں زیادہ تر متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین شامل تھیں جنہیں اپنی نوکریاں اور بنیادی آزادیاں کھو دینے کا خوف تھا۔ لیکن اس تنظیم نے کئی ایسے مسائل کی نشاندہی کی اور ان کے خلاف جدوجہد کی جن کا اثر غریب طبقے کی خواتین پر تھا۔ مثال کے طور پر حدود آرڈی نینس کی زد میں کوئی بھی طاقتور طبقے کی عورت نہیں آئی ۔ اس قانون سے صرف کمزور طبقوں کی عورتیں متاثر ہوئی لیکن خواتین محاذ عمل نے اس قانون کے خلاف مسلسل کئی سال جدوجہد کی' آج تک اس کو ختم نہیں کیا گیا۔ ضیاء الحق کے دور کے امتیازی قوانین کو آئین کی آٹھویں ترمیم کا تحفظ حاصل ہے۔ جب نواز شریف نے آٹھویں ترمیم کے آرٹیکل بی (2) 58 کو ختم کر کے صدر کے اسمبلی برطرف کرنے کے اختیارات ختم کیے تو اس ترمیم کی دیگر شقوں کو بدستور قائم رکھا تا کہ اسلام کے نام پر نافذ کیے گئے کالے اور ظالمانہ قوانین کا خاتمہ نہ ہو۔ حدود آرڈی نینس نہ صرف عورتوں کے خلاف امتیازی ہے بلکہ مذہبی اقلیتوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ ان پر اس کا اطلاق ان کے مذہبی عقائد کے برعکس ہے۔ اسی طرح قانون شہادت کے تحت غیر مسلموں کی گواہی بھی مرد مسلمانوں کے مقابلے میں نصف ہے۔ چنانچہ خواتین محاذ عمل کی تحریک نے نہ صرف عورتوں کے بنیادی حقوق کے لیے آواز اٹھائی بلکہ مذہبی اقلیتوں کا ساتھ بھی دیا اور ان کے خلاف زیادتیوں کی مذمت بھی کی۔ مثال کے طور پر جب ناموس رسالت کا قانون مذہب کی آڑ میں ذاتی دشمنیوں کے لیے استعمال ہوا تو خواتین محاذ عمل نے اس کے خلاف بھی احتجاج کیا۔ نیز جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تو اس وقت بھی خواتین محاذ عمل نے اس خوفناک قدم کی پرزور مخالفت اور مذمت کی۔ جب نواز شریف نے کالا باغ ڈیم بنانے کا اعلان کیا تو خواتین محاذ عمل نے صوبوں کو ساتھ دیتے ہوئے وفاق کے اس

MashalBooks.org

یک طرفہ فیصلے کی شدید مذمت کی۔ چنانچہ خواتین نے نہ صرف ان امور پر مزاحمت کی' جن کا تعلق براہ راست خواتین سے تھا بلکہ تمام ایسے قومی بربریت پنہاں تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ خواتین محاذ عمل کی ارکان کو معلوم تھا کہ اسلحہ کی دوڑ ہو یا معیشت کی بربادی' صوبائی' خود مختاری کا مسئلہ ہو یا فرقہ واریت' علاقائی جھگڑے ہوں یا لسانی فسادات' ہر مسئلے کا عورتوں کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔عورتوں پر ہر مسئلے کے مخصوص اثرات پڑتے ہیں جو ان کے عورت ہونے کی وجہ سے دوگنے ہو جاتے ہیں۔عورتوں کو ملکی امور سے علیحدہ ہونا' یا ان کا خود ان سے علیحدہ کرنا ملک کی نصف آبادی کو تاریکیوں اور پسماندگی میں رکھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ خواتین محاذ عمل نے فرقہ واریت کی مذمت بھی کی' بنیاد پرستی' رجعت پسندی اور مذہبی عدم رواداری کی بھی شدید مخالفت کی۔ اس لیے یہ کہنا کہ یہ تحریک چندگنی چنی' مغرب زدہ' متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ عورتوں کی تحریک ہے' پوری طرح صحیح نہیں۔ اسکی رکنیت بنیادی طور پر متوسط طبقوں کی تعلیم یافتہ عورتوں پر مشتمل ہے لیکن اس کا نظریہ اور جدوجہد ملک کے تمام اہم امور سے متعلق ہے۔

خواتین محاذ عمل کی خواتین نے احتجاج کے مختلف طریقے استعمال کیے۔ اس تنظیم نے جلوس اور جلسے نکالے' مظاہرے کیے' قانون ساز اسمبلی کے ارکان سے ملاقاتیں کیں' مقالے لکھے' ثقافتی پروگرام مرتب کئے' جیلیں کاٹیں اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس برداشت کی۔ انہوں نے اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی کے لیے کوششیں کیں' ٹیلی گرام مہم چلائی اور عوامی نمائندوں پر دباؤ ڈالا کہ کالے قوانین ختم کئے جائیں اور عورتوں اور مذہبی اقلیتوں اور صوبوں کو ان کا جائز حقوق دیئے جائیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے عورتوں پر تشدد کے خلاف' ذرائع ابلاغ میں عورتوں کی منفی عکاسی کے خلاف اور تدریسی نصاب میں عورتوں کے خلاف تعصّبات کے خلاف بھی مہم چلائی' اخباروں میں لکھا' مقالے چھاپے اور بیانات دیئے۔ جب فرسٹ ویمن بینک کو 1997ء میں نجی تحویل میں دیا گیا تو خواتین محاذ عمل نے تب بھی بہت احتجاج کیا' جب شانتی نگر میں مسیحیوں کو نذر آتش کیا گیا اس وقت بھی عورتوں نے آوز اٹھائی اور جب سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو سزائے موت سنائی گئی تب بھی عورتوں نے اقلیتوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسی طرح جب صائمہ ارشد کیس میں عورتوں کے حقوق پامال ہوئے اور عورتوں کی پناہ گاہ ''دستک'' پر مولویوں کے حملے ہوئے تو عورتوں نے مل کر

یک جہتی سے اس کی مخالفت کی۔ جب ایوب مسیح کو سزائے موت سنائی گئی اور لاتعداد مسیحیوں کو لاہور کے مال روڈ پر پولیس کا تشدد برداشت کرنا پڑا' تو خواتین محاذ عمل نے بے حد مذمت کی اور مسیحیوں کو رہا کرنے کے مطالبات کیے۔ خواتین محاذ عمل نے ہر میدان میں انصاف اور برابری کے لیے جدوجہد کی اور ان عورتوں کی مزاحمت کی وجہ سے چند مزید امتیازی قوانین کا پروگرام معطل کر دیا گیا حالانکہ پرانے کالے قوانین ابھی موجود ہیں۔

اگرچہ بیشتر امتیازی قوانین آج بھی رائج ہیں لیکن عورتوں کی تحریک بھی بدستور موجود ہے۔ خواتین محاذ عمل کی جدوجہد کے نتیجے میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں شعور قومی سطح اور قومی اداروں تک پہنچا ہے۔ اسی تحریک کی وجہ سے ذرائع ابلاغ نے خواتین کے حقوق کو اہمیت دینی شروع کی اور ''حوا کے نام'' جیسے پروگرام ٹیلی وژن پر دکھائے جانے لگے۔ اسی تحریک کے زیر اثر متبادل تھیٹر نے عورتوں کے مسائل اٹھائے اور ان پر سٹریٹ ڈرامے کیے۔ سیاسی پارٹیوں کو احساس ہوا کہ انہیں نہ صرف عورتوں کے مسائل کو اپنے منشور کا حصہ بنانا ہوگا بلکہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کو انتخابات لڑنے کے لیے ٹکٹ دینا ہوں گے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی خواتین محاذ عمل کو مثبت عکاسی ملی اور حمایت حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں 1995ء میں بیجنگ میں ہونے والی عورتوں کی عالمی کانفرنس سے قبل پاکستان نے عورتوں کے خلاف ہر قسم کا امتیاز ختم کرنے کے معاہدے سی۔ ڈ (1979ء) پر مشروط دستخط کیے۔ اس تحریک کا ایک اثر یہ ہوا کہ وہ تمام قوانین جو اس وقت رائج ہیں' انکا اطلاق کرنا مشکل ہوگیا ہے اور عدالتیں عورتوں کے خلاف امتیازی فیصلے دینے سے گریز کرنے کی کوشش کرتی ہیں گو کہ اکثر ان کے فیصلے اب بھی تعصّبات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ منزل بے شک بہت دور ہے لیکن تحریک اس موقف کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ عورت بے جان شے نہیں ہے جو چپ چاپ ظلم برداشت کرنے پر راضی ہو بلکہ عورت ہر طرح کی ظلم و ناانصافی کا مقابلہ کرتی ہے اور ہر قسم کی مزاحمت کرتی ہے۔ بلکہ عورتوں کی اس پر جوش تحریک سے متاثر ہو کر مشہور شاعر عوام حبیب جالب مرحوم نے یہ شعر کہے جو آج بھی اس تنظیم کا ترانہ مانے جاتے ہیں۔

MashalBooks.org

اب دہر میں بے یارو مددگار نہیں ہم
پہلے کی طرح بے کس و لاچار نہیں ہم
تم ظلم کرو اور خدا بھی رہو اپنے
ساتھی ہیں برابر کے، پرستار نہیں ہم
آتا ہے ہمیں اپنے مقدر کو بنانا
ذی عقل ہیں، ذی روح ہیں، بیمار نہیں ہم
یہ وہم تمہارا ہے کہ بیدار نہیں ہم

سندھیانی تحریک

جنرل ضیاالحق کے دور میں جہاں ایک طرف خواتین محاذ عمل کی تحریک شروع ہوئی جس نے بنیادی طور پر قانونی اصلاحات کے لیے جدوجہد کی اور امتیازی قوانین کے خلاف آواز اٹھائی، وہاں دوسری طرف کسان عورتوں کی ایک بہت بڑی تحریک صوبہ سندھ میں شروع ہوئی۔ یہ سندھیانی تحریک کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی سرگرم ہے۔ آمریت کے دور میں صوبہ سندھ میں ریاست اور فوج کی مخالفت کی زبردست تحریک چلائی گئی جس کا بنیادی مطالبہ تھا کہ جمہوریت بحال کی جائے اور لوگوں کو ان کے حقوق واپس لوٹا دیئے جائیں۔ ایم۔آر۔ڈی، یعنی بحالی جمہوریت کی تحریک سندھ میں 1980ء کی دہائی میں عروج پر تھی۔ ہزاروں کو فوج نے ہلاک کر دیا تھا تاکہ اس تحریک کے جوش و جذبے کو ٹھنڈا کیا جائے۔

1980ء میں سندھیانی تحریک کا آغاز ہوا۔ ابتداء میں یہ صرف عوامی پارٹی کے خواتین ونگ کے طور پر ظہور پذیر ہوئی۔ اس وقت عوامی پارٹی علیحدہ سندھی شناخت اور سندھی قومیت کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ سندھیانی تحریک نے بحال جمہوریت کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ریاست اور فوج کی حکمرانی کی پرزور مخالفت کی۔

سندھیانی تحریک کی ابتدائے ٹھٹھہ اور بدین سے ہوئی لیکن بعد میں یہ صوبہ سندھ کے تمام اضلاع میں پھیل گئی۔ اس کے شاخیں سندھ کے ہر ضلع میں قائم ہوگئیں۔ اس کے

جلسوں میں ہزاروں کی تعداد میں کسان عورتوں نے شرکت کی۔

اس تحریک نے نہ صرف فوجی آمریت کے خلاف اور سندھی قومیت کے حق میں آواز اٹھائی' بلکہ عورتوں کے مخصوص مسائل پر بھی توجہ دی۔ مثال کے طور پر اس تنظیم نے ایسے قدیم رسم رواج کی مخالفت کی جو سندھ میں صدیوں سے رائج تھے اور بے حد ظالمانہ تھے۔ ان میں خاص طور پر کارو کاری کی رسم شامل ہے جس کے تحت شمالی سندھ کے بلوچ قبائل میں ایک عورت اور مرد کو محض شک وشبے کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ کسی شخص کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اپنے ہی خاندان کی کسی عورت پر بدکاری یا سیاہ کاری کا الزام لگا کر دونوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور جائیداد ہتھیالی جاتی ہے۔ یہ رسم بوڑھی یا بانجھ یا غیر شادی شدہ ادھیڑ عمر عورتوں سے جان چھڑانے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ کئی دفعہ قرض اتارنے کے لیے بھی پوری برادری افراد کو اس رسم میں پھنسا دیتی ہے اور جس شخص کا قرض ادا کرنا ہو اس کے ساتھ اپنے قبیلے کی کسی عورت پر الزام لگا کر قرض سے نجات حاصل کر لی جاتی ہے۔ یہ قتل نہایت بیدردی سے کئے جاتے ہیں۔ ان میں کلہاڑیوں اور زرعی اوزاروں سے قتل کیا جاتا ہے۔ سندھیانی تحریک کی کسان عورتوں نے اس غیر انسانی رسم کی شدید مذمت کی۔

اس کے علاوہ حق بخشوانے کی رسم کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی۔ جس کے تحت ایک نوجوان لڑکی کی جائیداد کو گھر میں رکھنے کی غرض سے اس کی قرآن مجید سے شادی کر دی جاتی ہے تاکہ خاندان کی جائیداد باہر نہ چلی جائے۔ بہت سی ایسی رسومات کے پس پردہ دراصل مالی مفادات ہوتے ہیں جو رسم کا سہارا لے کر پورے کئے جاتے ہیں۔

سندھیانی تحریک نے لڑکیوں کی ان کی مرضی کے خلاف زبردستی کی شادی کی بھی مخالفت کی ہے۔ اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلمان' مسیحی اور ہندو تینوں مذاہب کی خواتین بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ انہیں اس بات کو شعور ہے کہ مذہب' رنگ ونسل' طبقے اور علاقے سے قطع نظر عورتوں کے آپس میں کچھ یکساں مسائل ہوتے ہیں۔ ان مسائل سے ہر علاقے' طبقے' زبان' رنگ ونسل اور مذہب کی خواتین دوچار ہوتی ہیں۔

سندھیانی تحریک اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ عورتوں کے حقوق کا شعور صرف متوسط مزاحمت کا عظیم جذبہ ہے اور بوقت ضرورت وہ بختاور کی طرح بندوق بھی

MashalBooks.org

اٹھالیتی ہیں۔ کراچی میں ایم ۔ کیو۔ایم یعنی متحدہ قومی تحریک کی خواتین نے بھی پولیس اور فوج کی گولیوں کا مقابلہ کیا اور بندوق اٹھائی۔ ان دونوں تحاریک میں عورتوں کے کردار کا تفصیلی جائزہ خاور ممتاز نے اپنے مقالے میں دیا ہے جو انہوں نے دونوں تحاریک کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا۔ (5)

مزدور خواتین کی تحریک

جہاں کسان عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی وہاں فیکٹریوں میں کام کرنے والی مزدور خواتین نے بھی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی اور استحصال کے خلاف مزاحمت کی۔ پوری دنیا میں مزدور خواتین نے مزدور مردوں کے ہمراہ بھی اور علیحدہ بھی تحریکیں چلائیں جو اس قدر کامیاب ہوئی کہ آج انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کے تمام عالمی معاہدے مزدوروں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور انکو یقینی بنانا ہر قومی ریاست کا فرض تصور کیا جاتا ہے۔

پوری دنیا میں معیشت کے ہر شعبے میں مزدور خواتین کی بے شمار تعداد کام میں شامل ہے۔ فیکٹریوں اور دفتروں میں' مصنوعات تیار کرنے اور خدمات دینے میں' رسمی اور غیر رسمی شعبوں میں ہر جگہ مزدور خواتین کثرت سے نظر آتی ہیں۔ چاہے بینک ہوں یا سکول' سرکاری دفاتر ہوں یا نجی شعبہ' عورتوں کی ایک بڑی تعداد مشقت کرتی نظر آتی ہے۔ پیکنگ سے لے کر دواؤں کی فیکٹریوں تک اور اوڈنیوں سے لے کر گھریلو ملازماؤں تک' غیر سرکاری تنظیموں سے لے کر سرکاری شعبوں تک عورتوں کی معیشت میں نمایاں کارکردگی نظر آتی ہے۔ جو عورت بلا معاوضہ وہ مفت خدمات سرانجام دے کر کنبے کے پیسے بچاتی ہے جو دوسری اشیاء پر خرچ ہوسکتے ہیں۔ اگر گھریلو خواتین کے کام کو سرکاری اعداد و شمار میں شامل نہیں کیا جاتا' یہ غلط ہے کیونکہ ان کا کام سورج کے طلوع ہونے پر شروع ہوتا ہے اور اسکے غروب ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہر عورت مزدور ہے خواہ وہ تنخواہ یافتہ ہو یا بلا معاوضہ کام کرتی ہو۔

عورتوں کو سماجی طور پر کمتر اور حقیر سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کام کی معقول اجرت نہیں ملتی۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر مرد وہی کام کر رہا ہے تو اس کی صلاحیت زیادہ

ہے یا وہ زیادہ قابل ہے ۔ یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ عورت محض شوق کی خاطر کر رہی ہے اور مرد کنبے کی کفالت کے لیے۔ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں کیونکہ نہ تو عورتوں کی پیداواری صلاحیت عمومی طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے اور نہ ہی وہ محض شوق کے لیے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ اکثر عورتیں مجبوریوں اور ضرورت کے تحت معاشی کام میں حصہ لیتی ہیں۔ کئی کام تو ایسے بھی ہیں جو عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور زیادہ پھرتی سے کر لیتی ہیں۔ لیکن مردوں کو کیونکہ کنبے کی کفالت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے' اسے برابر کے کام کی زیادہ اجرت ملتی ہے۔

برابر کام کی کم اجرت کے علاوہ تاریخی طور پر عورتوں کو زچگی کی چھٹیاں بمع تنخواہ بھی دی جاتی تھیں۔ یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ صرف عورت کی ذمہ داری ہے نہ کہ معاشرے کی ۔ معاشرہ بچوں کے لیے کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ عورتوں کو زچگی کے دوران اور ویسے بھی طبی سہولیتں میسر نہیں تھیں۔ اگر کوئی صنعتی حادثہ ہو جائے تو وہ مزدور کی اپنی ذمہ داری مانا جاتا تھا۔ تولیدی صحت کے اصولوں کے کام کی جگہ پر مدنظر نہیں رکھا جاتا تھا اور نہ ہی بچوں کی نگرانی کا کوئی انتظام موجود ہوتا تھا۔

ان تمام مسائل کے پیش نظر دنیا بھر کی مزدور عورتوں نے محسوس کیا کہ ان کے چند مسائل ایسے ہیں جو مرد مزدوروں سے مختلف ہیں اور عورتوں سے مخصوص ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مزدوروں کے حقوق کی تحریک میں خواتین مزدوروں کے مخصوص مسائل کو سامنے رکھا جائے۔ ان کے مطالبات تھے کہ برابر کام کی برابر اجرت دی جائے' زچگی کی چھٹی بمع تنخواہ دی جائے' کام کے اوقات کم کئے جائیں' تولیدی صحت کے اصول اپنائے جائیں' کام کی جگہ پر جنسی ہراسانی کی روک تھام کی جائے اور بچوں کی نگرانی کے انتظامات کئے جائیں۔

دنیا کے چند ممالک مثلاً ناروے' سویڈن' ڈنمارک وغیرہ میں یہ تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے اور چونکہ وہ فلاحی مملکتیں کہلاتی ہیں ان میں بچہ ریاست کی ذمہ داری ہوتا ہے اور دونوں والدین کی اس کی دیکھ بھال کے لیے بمع تنخواہ چھٹی اور سرکاری امداد ملتی ہے۔سی ۔ڈو (Cedaw) میں بھی ان حقوق کا نمایاں طور پر ذکر ہے اور ان میں سے چند اصول فرانس' برطانیہ اور جرمنی اور امریکہ وغیرہ نے بھی اپنائے ہیں۔ تاہم تیسری دینا کے

بیشتر ممالک میں ابھی تک مزدور خواتین مسائل کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

لیکن یہ حقوق عورتوں کو خیرات میں نہیں ملتے۔ ان کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ مغرب کی ممالک کی خواتین نے ان حقوق کے لیے بہت قربانیاں دیں اور پرزور مزاحمت کی۔ 1980 میں نیویارک میں کپڑے کے کارخانے میں کام کرنے والی مزدور خواتین نے اپنے مطالبات کے لیے سڑکوں پر جلوس نکالا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اوقات کار 12 یا 14 گھنٹوں سے گھٹا کر 10 گھنٹے کر دیئے جائیں اور کام کی اجرت منصفانہ دی جائے۔ ان عورتوں کو گھڑ سوار پولیس والوں نے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا اور لاٹھیوں سے مارا۔ ریاست نے مزدور طبقے کے خلاف اپنی پوری طاقت استعمال کی۔ نتیجتاً بہت سی عورتیں ہلاک ہوگئیں اور لاتعدا زخمی ہوئی۔ مزدور خواتین کی اس عظیم الشان قربانی کو یاد رکھنے کے لیے 1910 میں سوشلسٹ یا بائیں بازو کے افراد کے اجلاس میں جرمن خاتون کلارا زٹکن نے تجویز دی کہ 8 مارچ مزدور خواتین کی جدوجہد کا دن قرار دے دیا جائے۔ لہٰذا بہت عرصے تک یہ دن عورتوں کے دن کے طور پر سوشلسٹ ممالک میں منایا جاتا رہا۔ بعدازاں اسے دوسرے ممالک نے بھی قبول کر لیا اور اب پوری دنیا میں 8 مارچ کا دن عورتوں کے حقوق کا دن کہلاتا ہے اور پر جوش طریقے سے منایا جاتا ہے۔ نیو یارک میں جاں بحق ہونے والی مزدور عورتوں کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی اس جدوجہد کے نتیجے میں ہی آج اوقات کار کم ہیں۔ تنخواہیں قدرے بہتر ہیں اور زچگی کی تعطیل وغیرہ کے تصورات کی اہمیت کو قبول کر لیا گیا ہے۔ کپڑے کی فیکٹری میں کام کرنے والی خواتین کی یہ مثال دنیا بھر کی مزدور خواتین کے لیے مشعل راہ ہے اور امید کی جاتی ہے کہ دنیا بھر میں تمام مزدور خواتین کے اپنے جائز حقوق ملیں گے۔

پاکستان کی مزدور خواتین کی صورت حال پر اگلے ابواب میں تفصیلی بات ہوگی۔ یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ یہاں بھی مزدور عورتوں کی تحریک سرگرم ہے۔ اس کی جیتی جاگتی مثال ورکنگ ویمن آرگنائزیشن ہے جو مزدور خواتین کو طبقاتی استحصال اور صنفی تعصّبات دونوں عوامل کے بارے میں بیدار کرتی ہے اور ان کے حقوق کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ ورکنگ ویمن آرگنائزیشن (wwo) کے علاوہ پائلر (PILER) بھی ایک ایسی تنظیم ہے جو مزدوروں کو اپنے حقوق کی آگاہی دلانے میں مصروف ہے اور اس کے پروگرام میں عورتوں

کی بیداری اور ان کی تحریک کا عنصر نمایاں ہے۔

مزدور عورتوں کی تحریکوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں زور وشور سے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ مزدور عورتیں اپنے حقوق کی خاطر جان تک دینے سے باز نہیں آتیں۔ انہوں نے کسی بھی قربانی سے گریز نہیں کیا۔ اس سے عورتوں کے بارے میں یہ عام تاثر غلط ثابت ہوتا ہے کہ عورت بزدل ہے' ڈرپوک ہے' اسے دبانا آسان ہے اور وہ اپنے حقوق کے لیے نہیں لڑسکتی۔ پاکستان میں وائتھ لیبارٹری جو کہ دوائیں بنانے والی فیکٹری ہے' کی کئی عورتوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے نوکری کھو دی لیکن اس سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ان عورتوں میں روبینہ جمیل کا نام سرفہرست ہے اور آج وہ ورکنگ ویمن آرگنائزیشن کی متحرک کارکن ہے۔ عورت کی کمزوری' بے بسی اور بیچارگی کے مفروضے محض اسے کمزور اور بے بس بنانے کی خاطر بنائے جاتے ہیں۔ عورتوں نے بارہا تاریخی طور پر ثابت کیا ہے کہ نہ صرف وہ اپنے حقوق کے لیے لڑنے کو تیار ہیں بلکہ ان تک دے سکتی ہیں۔ عورت کی مزاحمت اجتماعی اور انفرادی دونوں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔

تعلیم کے حق کی جدوجہد

جدید قومی ریاست کے قیام کے ساتھ جدید تعلیم نظام ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کیونکہ اس نظام کے ذریعے عام لوگوں کو ریاست کا باشندہ ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے اور قومیت کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں جب جدید قومی ریاستیں قائم ہوئیں تو ساتھ ساتھ عام تعلیم کے نظام تشکیل دیئے گئے۔ یہ تعلیم شروع میں صرف مردوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی کیونکہ ایک تو عورت کی عقل اور سمجھ مردوں سے کمتر سمجھی جاتی تھی' دوسرے عورتوں کو امور خانہ داری سے منسوب کیا جاتا تھا اور تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ مرد کو نوکری حاصل کرنے کے لیے اور دنیاوی' سیاسی' معاشی' تجارتی اور کاروباری امور سمجھنے کے لیے تعلیم دی جاتی تھی اور یہ تمام امور عورتوں کے لیے غیر موزوں اور غیر ضروری سمجھے جاتے تھے۔ یہ تصور کیا جاتا تھا کہ مرد باہر کی دنیا سے منسلک ہوتا ہے جہاں تعلیم' سائنس اور علوم کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کا تعلق گھر سے ہوتا ہے جہاں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا عورتوں کے لیے تعلیم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عام سوچ تمام ممالک میں یہی

تھی کہ عورت تو صرف ماں' بیوی اور بیٹی ہے اور ان رشتوں کے لیے اسے تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف مرد ہوا کرتے تھے اور عورتوں کو چند گھریلو ہنر سکھا دیئے جاتے تھے۔ یورپی اور امریکی ممالک میں گھریلو علوم کے علاوہ عورتوں کو فنون لطیفہ یعنی مصوری' رقص و موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں عورتوں کو صرف کشیدہ کاری' سینا پرونا' کھانا پکانا اور بچوں کی نگہداشت کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسوی صدی کے آغاز میں یورپ اور امریکہ میں ترقی پسند دور آیا۔ اس دوران ہر قسم کی سماجی و سیاسی اصلاحات ہوئیں ان میں نمایاں اصلاحات عورتوں کی تعلیم اور ووٹ کے حق سے متعلق تھیں۔ تعلیم اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا ذریعہ بن چکی تھی۔ ہر کوئی اس نئے سرمائے سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ نفسیات اور دیگر معاشرتی علوم نے ثابت کر دیا تھا کہ عورتوں کی ذہانت اور قابلیت کسی طور بھی مردوں سے کم نہیں ہے اور وہ مشکل چیزیں سمجھ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تعلیم نیا سرمایہ تھی جو طاقت حاصل کرنے کا طریقہ بن گئی۔ وقت کے ساتھ تقریباً 1920ء تک امریکہ اور یورپ کی خواتین نے بڑی تعداد میں سکولوں اور کالجوں میں داخلہ لینا شروع کر دیا۔

برطانیہ کی نو آبادی ہندوستان میں بھی اس تحریک کے اثرات ہوئے اور انیسویں صدی کے نصف میں عورتوں نے تعلیم کے میدان میں آنے کے مطالبات شروع کر دیئے۔ چند امراء کی لڑکیاں گھروں میں ٹیوشن لے کر پڑھنے لگیں۔ مثال کے طور پر بنگال کی دو بہنیں آرو اور تورو دت پہلی خواتین تھیں جنہوں نے انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی۔ لیکن عام اور غریب طبقوں کی عورتوں میں بھی تعلیم کا شوق تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہندوستان میں پنڈا راما بائی مشہور ہیں۔ انہوں نے تعلیم حاصل کر کے امریکہ اور ہندوستان کے دورے کئے اور پہلے اپنے ہندو مذہب سے بغاوت کر کے عیسایت اختیار کر لی اور بعدازاں عیسائی مبلغوں اور چرچ کے حکام سے بھی اختلافات پیدا کئے۔ پنڈا رامابائی ایک منفرد عورت تھی جو بہت غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن جس کی سوچ دوسروں کے بنائے ہوئے خاکوں' ڈھانچوں اور خانوں میں نہ سمائی۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے اور حقوق کے لیے نمایاں جدوجہد کی۔ ان کے علم کا ذخیرہ اس قدر وسیع تھا کہ انہیں پنڈا کا خطاب ملا جو عموماً

عورتوں کو نہیں ملتا۔

ہندوستان کے مسلمان ابتداء میں تو مغربی طرز کی سائنسی اور سیکولر تعلیم سے دور رہے لیکن بعد میں انہوں نے پسماندگی سے بچنے کے لیے سر سید احمد خان کی کوششوں کے نتیجے میں تعلیم میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن سر سید احمد خان عورتوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے جو انہوں نے اپنی تقاریر اور خطبوں سے صاف ظاہر کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی لڑکیاں انگریز، سکھ یا ہندو عورتوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کریں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح سے گمراہ ہو جائیں گی اور مذہب سے بدظن ہو جائیں گی۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم کی پرزور مخالفت کی اور کہا کہ اگر مسلمان عورتوں کو تعلیم دینا ہی ہے تو وہ مذہبی اور روایتی تعلیم ہونی چاہیے۔ (6)

سر سید احمد خان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد بھی امور خانہ داری کی تعلیم کے حامی تھے اور عورتوں کی تعلیم صرف بہتر مائیں، بیویاں اور بیٹیاں بنانے کے لیے دینے کے طرفدار تھے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے مسلمان عورتوں کو بچانے کے لیے مراۃ العروس جیسے اصلاحی ناول لکھے جو سرکار نے تعلیمی نصاب میں شامل کر دیئے اور ڈپٹی نذیر احمد کو اس کتاب پر انعام و اکرام دیا۔ عورتوں کو تعلیم و ترقی دینے کی شدید ترین مخالفت مشہور شاعر اکبر الہ آبادی تھے جن کے کام کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے بہت بڑے حصے میں عورتوں کی جدید تعلیم کی سخت مذمت کی اور ان کا خیال بھی یہی تھا کہ عورتوں کو روایتی تعلیم کے علاوہ کوئی اور تعلیم نہ دی جائے ورنہ وہ باغی اور خودسر ہو جائیں گی اور قوم و ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ (7) ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی موضوع پر ہے۔ انہوں نے پوری پوری نظمیں عورتوں کی تعلیم اور پردے کے موضوع پر لکھیں۔

جہاں اکبر الہ آبادی نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کی، وہاں مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی مشہور کتاب ''بہشتی زیور'' میں عورت کے کردار کو قطعی طور پر ماں، بہن اور بیٹی کے رشتوں میں ڈھال دیا۔ مولانا نے یہاں تک بتا دیا کہ کس قسم کی کتابیں عورتوں کو پڑھانا چاہیے اور کس قسم کی نہیں۔ (8) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے خلاف کس قدر تعصّبات تھے اور اس کی کتنی پُرزور مخالفت کی گئی۔

لیکن تاریخ کے دھارے میں یہ سب کچھ بہہ گیا۔ انگریزوں کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں قوم عورتوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے شروع میں جب سکول کھولے تو عورتوں کے لیے تعلیمی مواد پر کڑی نظر رکھی گئی اور اس میں صرف ایسے مضامین شامل کئے گئے جو مسلمان عورتوں کے لیے موزوں سمجھے گئے ۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ عورتوں نے ہر قسم کی تعلیم میں بھرپور حصہ لیا اور چند امراء نے لڑکیوں کو یورپ میں بھی پڑھایا۔ بعدازاں انہیں تعلیم یافتہ خواتین نے قومی آزدی کی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ آج بھی عورتوں کی خواندگی کی شرح تقریباً24فی صد ہے جبکہ مردوں کی لگ بھگ 49فیصد ہے' لیکن عورتوں کے تعلیم کے حق کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ خاص طور پر غیر رسمی تعلیم کا مرکز دور دراز کے پسماندہ علاقوں کی لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ غیر رسمی تعلیم کے ذریعے ایسی بچیاں بھی اب سکول جانے لگی ہیں جنہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انہیں یہ مواقع حاصل ہوں گے۔ سرکاری تعلیمی پالیسی نے بھی لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کا اقرار کر لیا ہے اور اب عورتیں تعلیم کے ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ان کے نتائج ایسے مضامین میں بہت اچھے آ رہے ہیں جو روایتی طور پر مردانہ مضامین سمجھے جاتے ہیں۔عورتوں کی ذہانت اور قابلیت کے بارے میں اب کوئی شک نہیں رہا اور یہ تیزی سے ہر میدان میں قدم رکھ رہی ہیں۔ بلکہ عورتوں کی قابلیت اس قدر نمایاں ہے کہ مراکش کی مشہور مفکر فاطمہ مرنیسی کا نظریہ ہے کہ گاؤں کے نوجوان شہر کی عورتوں کی کارکردگی اور صلاحیت سے اس قدر خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور اس قدر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ مذہبی جماعتوں کے رکن بن کر عورتوں کی تعلیم اور ملازمت پر پابندی کے مطالبات کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان قابل اور ذہین عورتوں کے مقابلے میں بہتر کارکردگی سرانجام نہیں دے سکتے۔ (9)

تعلیم کا حق جیتنے اور اس میں نمایاں کارکردگی دکھانے سے یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا ذہن نہیں ہوتا' وہ بیوقوف ہوتی ہیں' کند ذہن ہوتی ہیں اور مشکل تصورات نہیں سیکھ سکتیں کیونکہ ان کی عقل کم ہوتی ہے۔طبی کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں میں جب عورتوں کے نتیجے بہتر آنے شروع ہوگئے تو ان کی مخصوص نشستیں منسوخ کر کے اوپن میرٹ پر آنے کے مطالبات کئے گئے۔ جدید دور کا مرد عورت کی قابلیت' ذہانت' بہادری'

MashalBooks.org

جوانمردی' جرات اور خود اعتمادی سے خوفزدہ ہے کیونکہ عورتوں نے ہر میدان میں نہ صرف اپنی کمتری کو غلط ثابت کیا ہے بلکہ کئی میدانوں میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے ۔ کیونکہ عورت دوہرے اور تین گنا بوجھ سے بھی نمٹ لیتی ہے۔ گھر اور باہر دونوں میدانوں میں بہت اچھی طرح سما جاتی ہے اور تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھالیتی ہے' مرد ڈرتا ہے۔ کیونکہ مرد کا کردار جدید دور میں محدود ہوگیا ہے اور صرف مردانہ بیج مہیا کرنے تک رہ گیا ہے جبکہ عورت دوہرا اور تین گنا کردار ادا کر رہی ہے۔ مردانگی کا بحران نسوانیت کے بحران سے زیادہ ہے۔ جن سائنسی میدانوں میں مرد اپنی برتری یقین سمجھتے تھے۔ ان میں بھی عورتوں کی زبردست کارکردگی کی وجہ سے مرد کی برتری کی کوئی دلیل باقی نہیں رہی۔ وہ کس میدان میں اور کیونکہ برتری دکھائے سوائے اس کے کہ وہ تشدد کرے۔ لہٰذا دونوں مردوں اور عورتوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے ہیں۔ مردوں کو سمجھ نہیں آ رہا کہ کون سے میدان میں خود کو برتر ثابت کر کے مرد کے افضل ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ چنانچہ موجودہ بحران نسوانیت کا نہیں' مردانگی کا ہے جو کبھی بہادری پر اپنی برتری کا دعویٰ کرتی تھی اور کبھی ذہانت پر ۔ اب عورتوں کی بہادری اور ذہانت دونوں مرد کے برابر ثابت ہو جانے کے باعث' مرد کچھ کھو سا گیا ہے اور دنیا میں اپنے کردار اور اپنی اہمیت کے بارے میں پریشان ہے۔ مردانہ خوف اور احساس کمتری' افغانستان میں طالبان کے عورتوں کی جانب رویے سے صاف ظاہر ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور معاشی خود مختاری سے بے حد خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے وہ مذہب کا جھوٹا سہارا لیتے ہیں کیونکہ مذہب نے نہ تو عورتوں کو روزگار سے منع کیا ہے اور نہ تعلیم حاصل کرنے سے۔

ماحول کی تباہی کے خلاف عورتوں کی مزاحمت

موجودہ دور میں ترقی کے نام پر قدرتی وسائل کا بیدردی سے استحصال کیا جاتا ہے۔ زمین کی گود میں قدرتی وسائل اور سبزے کو بڑے شہروں اور امراء کی عمارتیں اور بنگلے سجانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سنگ مرمر سے گھر اور ہوٹل سجائے جاتے ہیں' مہنگی لکڑی سے دفاتر اور دیگر عمارات کو آراستہ کیا جاتا ہے اور زمین کی طاقت دیگر وسائل کی کان کنی کر کے کم کر دی جاتی ہے ۔ ان سرگرمیوں سے انسان کا زندہ رہنے کا

ماحول تباہ ہورہا ہے۔ تیسری دنیا کے غریب ممالک کے انمول قدرتی سرمائے کو غیر ملکی کمپنیاں کوڑی کے داموں لے جا کر ترقی یافتہ ممالک کے افراد کے شوق پورے کرتی ہیں۔ اس طرح ماحول بدستور کمزور اور خراب ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ زرخیز زمین بنجر ہو جاتی ہے' گھنے اور ہرے بھرے جنگلات ویران ہو جاتے ہیں' پانی کی ندیاں اور دریا خشک ہو جاتے ہیں اور ماحول کی آلودگی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ آبادیاں جو اس ماحول پر انحصار کرتی ہیں اور اس کو ذریعہ حیات بناتی ہیں تباہ ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ درخت کٹنے سے گرمی بڑھ جاتی ہے' بارش کم ہو جاتی ہے اور پہاڑ پھسل کر گرنے لگتے ہیں ۔ کیونکہ ان کی جڑیں پہاڑوں کی مٹی کو اکٹھا رکھتی ہیں۔ کیڑے مار دواؤں اور زیادہ پیداوار کرنے والے بیجوں کی وجہ سے زرخیز زمین کی طاقت ماند پڑ جاتی ہے اور قدرتی اقسام ختم ہو جانے سے ماحول کی بائیوڈائیورسٹی' یعنی طرح طرح کی مخلوق کی اقسام ختم ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ ماحول کی تباہی کے اثرات براہ راست عورتوں پر ہوتے ہیں کیونکہ دیہات کی عوتیں گھریلو استعمال کے لیے پانی لانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں اور درختوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں تاکہ گھر میں چولہا جلاسکیں۔ جب ماحول تباہی کا شکار ہوتا ہے تو دیہاتی عورتوں کے کاموں میں مزید اضافہ ہوتا ہے کیونکہ انہیں ایندھن اور پانی کی تلاش میں طویل مسافت طے کرنے پڑتی ہے۔

صوبہ سرحد کے کئی علاقوں میں عورتوں کو جنگلات کٹ جانے کے باعث آٹھ گھنٹے صرف ایندھن اور پانی لانے میں صرف کرنا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا سولہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے جس میں کھانا پکانا' صفائی اور دیگر کام ہوتے ہیں۔ جیسے مویشیوں کو چارہ دینا وغیرہ۔

جنگلات کسی بھی ملک کے اہم ترین وسائل ہوتے ہیں۔ یہ دیہی آبادی کے لیے خوراک' ایندھن اور مویشیوں کے چارے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ پانی اور زرخیز مٹی کے وسائل کا اتحفظ بھی کرے ہیں۔ متعدد جنگلات تجارتی اور صنعتی ترقی کے نام پر برباد کر دیئے گئے ہیں۔ جنگلات دیہی آبادی کے زندہ رہنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی دیہی عورتوں نے تشدد کا ذریعہ استعمال کئے بغیر اپنے اس ذریعہ معاش کی حفاظت کے لیے تحریک چلائی جو پوری دنیا میں چپکو تحریک کے نام سے مشہور

ہوئی۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں ہندوستان کی دیہی خواتین کی جنگلات کی تباہی کے خلاف تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔

1974ء میں اتر پردیش کے ضلع چمولی میں ایک تجارتی کمپنی نے 2500 درخت کاٹنے کا منصوبہ بنایا۔ جس وقت کمپنی کے کارندے آئے تو عورتیں اکیلی تھیں۔ گھروں کے مرد روزگار کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ جب کمپنی کے ٹھیکیدار درخت کاٹنے آئے تو عورتیں جنگل میں گئیں اور درختوں کا گھیراؤ کر لیا۔ انہوں نے درختوں کے گرد خود کو لپیٹ لیا اور ان سے چپک گئیں تاکہ کمپنی انہیں کاٹنے میں ناکام ہو جائے۔ انہوں نے ٹھیکیداروں سے کہہ دیا کہ درخت کاٹنے کے لیے انہیں ان عورتوں کے سر کاٹنے ہوں گے۔ یہ سن کر ٹھیکیدار واپس لوٹ گئے اور جنگل محفوظ ہو گیا۔

مزاحمت کا یہ بہادرانہ اور دلیرانہ انداز بہت جلد کوہ ہمالیہ کے دوسرے دیہاتوں میں بھی پھیل گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے درختوں کی حفاظت کے لیے روزے رکھے اور جن درختوں کے کٹنے کا خطرہ تھا' ان کے گرد خود کو لپیٹ لیا۔ گاؤں والوں نے اپنے جسم کو ٹھیکیداروں کی کلہاڑیوں اور درختوں کے درمیان میں ڈال دیا۔ یہ لوگ اپنے ذریعہ حیات کو بچانے کے لیے جان دینے کو تیار تھے۔

اس مزاحمتی تحریک کے نتیجے میں 1980ء میں سرکار نے اتر پردیش میں 15 برس تک درخت کاٹنے پر پابندی لگا دی۔ بعدازاں یہ تحریک بہت سے دوسرے صوبوں میں پھیل گئی۔

اس طرح حکومت پر یہ دباؤ پڑا کہ ایسی پالیسیاں مرتب کی جائیں جو لوگوں کی ضروریات کے خلاف نہ ہوں اور جو ماحول کو مدنظر رکھ کر بنائی جائیں۔ چپکو تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک خود ساختہ تحریک تھی جو مقامی لوگوں نے بغیر کسی بیرونی رہنمائی کے چلائی۔ دیہات کے لوگوں کا نعرہ تھا کہ جنگل ہماری ماں کا گھر ہے' ہم اسے تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ اس تحریک میں متحرک خواتین دیہاتی عورتیں تھیں جنہوں نے اپنے ذریعہ معاش اور کمیونٹی کی بقا کی خطر یہ مشہور زمانہ جدوجہد کی۔

اگرچہ یہ تحریک ہندوستان میں چلی' دنیا بھر میں دیہات کی عورتیں ماحول کو تباہی سے بچانے کی تحریک میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ تحریک ان تمام تحریکوں کے لیے مشعل راہ ہے'

ایک علامت ہے عزم وحوصلے کی ایک عالیشان مثال ہے جسے دنیا کبھی نہیں فراموش کر سکے گی۔

اس تحریک سے بھی چند عام مفروضے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عورت بزدل اور ڈرپوک ہے۔ دیہات کی عورتوں نے ثابت کر دیا کہ اپنا ماحول بچانے کی خاطر وہ مرنے کو تیار تھیں۔ عورت کی بہادری کی اس سے بہتر کیا مثال ہوسکتی ہے؟ دوسرے اس تحریک سے یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ دیہات کی عورت غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باعث بیوقوف اور سیدھی سادی ہے۔ چپکو تحریک کی عورتوں نے پوری طرح یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مفادات سے پوری طرح واقف ہیں اور اپنے حقوق سے آگاہی رکھتی ہیں۔ ان کی عقل وسمجھ پر کون شک کرسکتا ہے کیونکہ انہیں یہ واضع طور پر معلوم تھا کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے اور ان کا اچھا برا کس قدم میں ہے۔ عقل، فہم وفراست اور دانشمندی کا کوئی اور ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ ان عورتوں کو ماحول کی تباہی کا شعور تھا اور وہ جانتی تھیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور وہ اپنے نصب العین میں پوری طرح کامیاب ہوئیں۔

ایک اور مفروضہ جو اس تحریک سے غلط ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ کسی خاص رہنما کے بغیر تحریک نہیں چل سکتی۔ دیہات کی عورتوں نے ثابت کیا کہ چاہے کوئی لیڈر ہو یا نہ ہو، چاہے کوئی رہنمائی کرنے والا ہو یا نہ ہو، ہر شخص اپنی بہتری خود جانتا ہے اور ہر شخص کے اندر مزاحمت کے جذبات ہوتے ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دیہات کے لوگ جاہل ہوتے ہیں اور اپنا برا بھلا نہیں جانتے اور انہیں کسی پڑھے لکھے شہری کی ضرورت ہے جو انہیں ان کی بہتری کا سبق سکھائے۔ لیکن چپکو تحریک نے ثابت کر دیا کہ عقل اور شعور کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی شہری دانشوروں کی ضرورت ہے۔ وقت پڑنے پر لوگوں میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے اور شعور بھی۔ یہ شعور مردوں اور عورتوں دونوں میں ہوتا ہے اور یہ مزاحمتی جذبہ انسان کی میراث ہے۔ (10)

یہاں پر صرف چند مخصوص تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ تحریکیں نہیں تھیں۔ بلکہ انسان کی تاریخ یورپ سے لے کر ایشیا تک اور افریقہ سے امریکہ تک عام لوگوں کی مزاحمتی تحریکوں سے بھرپور ہے۔ لوگوں نے ظلم برداشت کیے، اذیت برداشت کی، جانیں دیں لیکن مزاحمت کا جذبہ نہیں ٹوٹا جس کی وجہ سے آج بھی

دنیا قائم ہے اور حکمران طبقوں کی طاقت کے باوجود اس میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب بھی انسانی تاریخ لکھی گئی اسے مردوں نے قلم بند کیا جس کی وجہ سے عورتوں کے کارناموں کو درگزر کر دیا گیا اور تاریخ کے صفحات صرف مردانہ کارناموں کے آئینہ دار بن گئے ۔ البتہ جیسے جیسے عورتیں تاریخ لکھنے لگی ہیں' تاریخ ان کے عظیم الشان کارناموں کی گواہی دینے لگی ہے۔ (11)

ان تمام تحریکوں میں طبقاتی تفریق کے علاوہ پدرسری کے عوامل بھی کارفرما ہیں ۔ بہت سی تحریکیں پدرسری اقدار کے خلاف اٹھیں۔ یہاں پر پدرسری نظام کی کچھ وضاحت اس لیے ضروری ہے کیونکہ یہ لفظ بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے اور سوچ اور تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی اجزا کا جائزہ لیا جائے اور اسے سمجھا جائے۔

پدرسری نظام کے بنیادی اجزاء

پدرسری کی اصطلاح بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔ پدرسری کے لفظی معنی ہیں ''والد کی حاکمیت'' لیکن عام طور پر اس کا استعمال ہر ایسی صورت کے لیے ہوتا ہے جہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت دی جاتی ہو اور انہیں عورتوں کے مقابلے میں افضل و برتر تسلیم کیا جاتا ہو۔ برتر تصور کیے جانے کے باعث مردوں کے ہاتھوں میں تمام وسائل کا کنٹرول ہوتا ہے خواہ وہ مالی یا مادی وسائل ہوں یا نظریاتی' ثقافتی اور تہذیبی وسائل ہوں ۔ ان وسائل کے استعمال سے متعلق تمام فیصلوں کا حق مردوں کو ہوتا ہے۔ چنانچہ پدرسری سے مراد ایک انفرادی باپ کی حاکمیت نہیں ہے بلکہ یہ نام اس نظام کو دیا جاتا ہے جو مردوں کو افضل اور برتر تسلیم کرتے ہوئے مالی' سیاسی' معاشی اور فیصلہ کرنے کی تمام طاقت ان کے ہاتھ میں ڈال دیتا ہے۔ اسی نظام کے تحت عورتوں کو کمتر' حقیر کم عقل' جذباتی اور مرد کی تابع و خدمت گار سمجھا جاتا ہے۔

پدرسری نظام کی بنیاد صنفی تفریق ہے جس کے چار بنیادی اجزاء ہیں: (1) تصورات کی دو یا دو سے زائد خانوں میں تقسیم ۔ (2) اس تقسیم کے دونوں خانوں کو ایک دوسرے سے مکمل متضاد قرار دینا۔ (3) ان متضاد خانوں میں درجہ بندی پیدا کرنا۔(4) متضاد خانوں کو اندر اور باہر کی تفریق سے منسلک کرنا۔ (5) درجہ بندی کے نتیجے میں طاقت

اور عدم برابری کے رشتے پیدا کرنا۔ ان پانچ اجزاء کی وضاحت کچھ یوں ہے:

1۔تصورات کی خانوں میں تقسیم

صنفی تفریق کے تحت عورتوں اور مردوں کو بالکل علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی دنیا ہی بدل دی جاتی ہے۔ ان دونوں خانوں یعنی ''نسوانیت'' اور ''مردانگی'' کو اس قدر علیحدہ کر دیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی امتزاج ممکن نہ رہے۔ کوئی بھی ایسی صنعت نہ ہو جو زنانہ اور مردانہ دونوں پر مشتمل ہو اور ان دونوں کا امتزاج ہو۔ نسوانیت کے خانے میں صرف اور صرف نسوانی صفات شامل ہو سکتی ہیں یعنی شرمانا' بزدل ہونا' بیوقوف ہونا' گھریلو امور میں سگھڑ ہونا' اطاعت گزار ہونا' تابعدار ہونا وغیرہ۔ حسن' دلکشی اور خوبصورتی کو بھی اس خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مردانگی کے خانے میں بہادری' جوانمردی' جرات' حاکمیت' غرور تمدن جیسے تصورات کو بھر دیا جاتا ہے۔ اس سوچ کے مطابق یہ سمجھنا ممکن نہیں ہوتا کہ مرد بھی بزدل ہو سکتا ہے' عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ اس سوچ کے سخت خانوں میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی ایک وقت بہادر ہو سکتا ہے اور کسی دوسری صورت حال میں بزدل۔ ان صفات کو مردانہ اور زنانہ خانوں میں اس طرح قید کر دیا جاتا ہے کہ یہ منجمد نظر آتی ہیں اور مختلف اوقات میں کوئی شخص بدل نہیں سکتا بلکہ انسان منجمد ہوتا ہے جس کی شخصیت ایک ہی سی رہتی ہے' جس میں تبدیلی کا امکان ہوتا۔ شخصیت کی پیچیدگی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

2۔ دونوں کو متضاد قرار دینا

صنفی تفریق کا دوسرا اہم جزو یہ ہے کہ نسوانیت اور مردانگی کو علیحدہ خانوں میں قید کر دینے کے بعد انہیں صرف ایک دوسرے سے مختلف نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک دوسرے کا مکمل تضاد مانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مردانگی کی صفات میں بہادری' عقلمندی اور غرور شامل ہیں تو نسوانی صفات میں بزدلی' بے عقلی اور انکساری و عاجزی ہے۔ اگر مرد حاکم ہے تو عورت محکوم' اگر مرد جابر ہے تو عورت رحمدل اور نرم دل وغیرہ۔ یہ تاثر ملتا ہے کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کا توڑ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹکر ہیں۔ جو صفت ایک میں نہیں ہے وہ دوسرے میں ہے۔ کسی ایک شخص میں دونوں قسم کی صفات کی موجودگی کا امکان خاطر میں

نہیں لایا جاتا۔ اگر کوئی مرد رحمدلی، ہمدردی یا نزاکت کا مظاہرہ کرے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسے چھیڑا جاتا ہے اور اگر وہ اپنی بیوی کی کسی کام میں مدد کر دے تو اسے زن مرید کا رن مرید کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ لہٰذا معاشرہ صنفی خانوں کو عبور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر کوئی عورت کام کرتی ہو، خود مختار ہو، اعلیٰ عہدے پر فائز ہو اور غیور ہو تو اسے چھیڑا جاتا ہے کہ یہ تو مرد بننا چاہتی ہے۔ اس طرح معاشرہ اپنی لعنت ملامت کے ذریعے تفریق کے ان خانوں اور ڈبوں کو برقرار رکھتا ہے اور اس میں تہذیبی عظمت سمجھی جاتی ہے۔

3۔ متضاد خانوں میں درجہ بندی پیدا کرنا

صنفی تفریق کا تیسرا اور بہت اہم جزو یہ ہے کہ نسوانیت اور مردانگی کے خانوں کو نہ صرف علیحدہ اور متضاد قرار دیا جاتا ہے بلکہ ان میں اونچ نیچ اور درجہ بندی کا رشتہ پیدا کیا جاتا ہے۔ مردانہ صفات اور خصوصیات کو بہتر، برتر اور افضل قرار دے کر ان صفات کو اہمیت دے دی جاتی ہے اور نسوانی صفات کو ادنیٰ، کمتر اور حقیر قرار دے کر ان کی اہمیت کم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح مردوں اور عورتوں میں عدم برابری کا تصور مستحکم ہوتا ہے اور یہ تاثر ملتا ہے کہ مرد ہر لحاظ سے بہتر ہیں یعنی کہ وہ عاقل ہیں، دانشمند ہیں، بہادر ہیں، عظیم ہیں، باوقار ہیں اور بہادر ہیں۔ اس کے مقابلے میں عورتیں کند ذہن ہیں، بے عقل ہیں، بزدل ہیں، حقیر ہیں اور ان کی معاشرتی حیثیت اور رتبہ مرد سے کم ہے۔

4۔ نسوانیت اور مردانگی کی تقسیم اور اندر، باہر کی تفریق

نسوانیت اور مردانگی کے خانوں کے متضاد بنا کر اور ان میں درجہ بندی پیدا کر کے، ان خانوں کو ایک اور تقسیم کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اندر اور باہر یا گھر اور باہر کی دنیا کی تفریق۔ گھر اور باہر یا پبلک اور پرائیویٹ کی تقسیم ہمیشہ سے نہیں تھی بلکہ تاریخی طور پر ابھری۔ اس تقسیم کے تحت گھر کو نجی کاموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تقسیم کو ازلی اور ابدی مانا جاتا ہے، یہ چند سو سال پہلے کی پیداوار ہے اور قدیم زمانوں میں اس کا وجود نہیں تھا۔ اس تقسیم کے تحت عورتوں کو تمام ان کاموں سے منسلک کر دیا جاتا ہے جو بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے تعلق رکھتے ہیں اور افزائش نسل سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس دنیا کو دائرہ افزائش کہا جاتا ہے یعنی جہاں انسانوں کی پیداوار ہوتی ہے اور ان کی پرورش اور

نگہداشت کی جاتی ہے۔ اس طرح عورت کو ان تمام کاموں سے منسوب کر دیا جاتا ہے جو ایک انسان کے زندہ رہنے اور پروان چڑھنے سے متعلق ہوتے ہیں۔ گھروں میں عورتیں نہ صرف انفرادی طور پر انسان کے زندہ رہنے کا انتظام کرتی ہیں' مثال کے طور پر کھانا پکانا وغیرہ بلکہ نسل کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا انتظام بھی کرتی ہیں مثلاً بچے کو پیدا کرنا' دودھ پلانا اور پروان چڑھانا۔ اس طرح عورت پر پود آگے بڑھانے اور خاص طور پر بیٹے پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے اور کنبے کی جسمانی ضرورت کی دیکھ بھال بھی۔ اسی طرح مردوں کو باہر کی' بازاروں کاروبار کی دنیا سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اسے دائرہ پیداوار کہا جاتا ہے جہاں سے پیسہ کما کر لایا جاتا ہے اور گھر کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں ۔ عورتوں کا مردوں کی دنیا میں قدم رکھنا برا سمجھا جاتا ہے اور مردوں کا بہت زیادہ گھریلو ہونا بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دونوں کی صفات بھی علیحدہ اور متضاد خانوں میں ڈال دی جاتی ہیں اور دونوں کی دنیا بھی علیحدہ کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ نسوانیت اور مردانگی کی اقدار اور صفات میں درجہ بندی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے' اس لیے مرد کی باہر کی دنیا کو عورت کی گھر کی دنیا پر فوقیت حاصل ہوتی ہے' اس کے باہر کے کام کو زیادہ اہم اور ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس کی برتری مان لی جاتی ہے۔ جب وہ گھر آتا ہے تو اس کی خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ عورت کے گھریلو کام کو غیر اہم سمجھا جاتا ہے اور اس کے دن رات کے کام کو کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اس کے کام کو محبت کا تحفہ سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ سورج طلوع ہونے سے غروب ہونے تک متواتر کام میں مصروف رہتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے موجودہ دور میں یہ روایتی رشتے تبدیل ہو رہے ہیں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد گھر سے باہر جا کر کما کر لانے میں مصروف ہوگئی ہے کیونکہ کنبے آج کی مہنگائی میں صرف ایک تنخواہ پر گزارا نہیں کر پاتے۔ اس سے مرد کی اہمیت کم ہونے کا ڈر ہے جس سے تلخی اور کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ نتیجتاً تشدد میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن عورتوں کے کمانے سے ان کے سماجی رتبے اور حیثیت میں عمومی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی اور انہیں آج بھی کمتر ہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ معاشرتی قدریں نہیں تبدیل ہوئی۔ اگرچہ عورت کا بوجھ بڑھ گیا ہے اور اب وہ دوہرا بوجھ اٹھاتی ہے' لیکن اس کے سماجی مقام میں بہتری ابھی تک نظر نہیں آئی۔ اس کی پیچیدہ وجوہات ہیں جو اس کتاب کے دائرہ بحث سے باہر

MashalBooks.org

ہیں لیکن اور جگہ کہی جا چکی ہیں ۔ مردوں کے روایتی کردار میں کمی کے باوجود ان کا رتبہ' مقام اور حیثیت متاثر نہیں ہوئے۔ ان چیزوں کے لیے مذہب وروایت کا سہارا لیا جاتا ہے جو کہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ مردوں کو اب بھی افضل اور برتر ہی مانا جاتا ہے اور اگر کوئی عورت اس سے انکار کرنے کی جرات کرے تو تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔

5۔ طاقت کے رشتوں کی تشکیل

گھر اور باہر کی تقسیم اور عورت اور مرد کی عدم برابری کے نتیجے میں ہر سطح پر طاقت اور ناہمواری کے رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ طاقت کے رشتے بالآخر سیاسی رشتے ہوتے ہیں۔ یہ رشتے خود کو معاشرے کے ہر ادارے میں ظاہر کرتے ہیں' خاندان سے لے کر سکول تک' سکول سے لے کر کام کی جگہ تک اور کام کی جگہ سے لے کر تمام سیاسی' سماجی اور معاشی اداروں میں ان طاقت کے رشتوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر خاندانوں میں اکثر لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے' لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر خوراک' بہتر لباس' زیادہ آزادی' بہتر تعلیم اور صحت کی بہتر سہولت فراہم کی جاتی ہیں۔ اسی طرح کام کی جگہ پر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو کم اجرت دی جاتی ہے' انہیں کم اہمیت والے عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے اور فیصلہ سازی کی سطح سے دور رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ملکی قوانین میں عورتوں کے خلاف امتیاز نظر آتا ہے اور جمہوریت کے نمائندہ اداروں مثلاً قومی اسمبلی' صوبائی اسمبلیوں اور بلدیاتی اداروں میں عورتوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ صنفی تفریق اور اس کی قدریں گھر اور خاندان سے شروع ہو کر عوامی زندگی اور سیاسی و معاشی زندگی کی ہر سطح تک جاتی ہیں اور پھر واپس خاندان تک آتی ہیں کیونکہ سرکاری پالیسیوں میں اس تفریق کی بنا پر اہم فیصلے کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں اور مردوں کے لیے مختلف قوانین بنتے ہیں' مختلف پالیسیاں بنتی ہیں۔ پبلک زندگی کی کئی اہم پالیسیوں میں عورتوں کے مفادات کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی گو ان پالیسیوں کے عورتوں پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ چنانچہ صنفی تفریق' جو کہ پدرسری نظام کی جڑ ہے' ہمیں گھر سے لے کر باہر کی دنیا کی ہر سطح پر واضح طور پر نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا صنفی تفریق کے پانچ اجزاء پدرسری نظام کی جڑ ہیں اور کسی نہ کسی شکل

میں ہر تہذیب اور معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ پدر سری اگرچہ ایک قدیم ڈھانچہ ہے لیکن اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ یہ ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ اسے تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار نے بدلا ضرور ہے لیکن ختم نہیں کیا۔ قدیم اور جدید نوعیت کی پدر سری میں فرق ضرور ہے لیکن اس کے بنیادی اجزاء بدستور قائم ہیں۔ یہ قبائلی معاشروں میں بھی پائی جاتی ہے' جاگیردارانہ معاشروں میں بھی شدت سے موجود ہوتی ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں۔ اسے نہ تو صنعتی دور ختم کر سکا اور وہ جدت پسندی یا ترقی پسندی۔ اس کی جڑیں گہری ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حد تک پدر سری کی بنیاد انسان کی جسمانی ساخت میں بھی ہے۔ کیونکہ عورت بچہ پیدا کرتی ہے' اس کی وجہ سے ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی نظریاتی سوچ کی حاکمیت کو قائم رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پدر سری کی جڑ ہی اس بات میں ہے کہ مرد کو کبھی مکمل طور پر یقین نہیں ہوسکتا کہ پیدا ہونے والا بچہ اس کا اپنا ہے یا نہیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کسی دوسرے شخص کی اولاد اس کی وارث بنے اور اس کی جائیداد کی مالک ہو۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بچہ مرد کا اپنا ہے' عورتوں کے جسم و حرکت پر کڑی نظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے چار دیواری اور عورت کی عزت و عصمت کے بارے میں سخت قسم کی اقدار کی تعمیر کی جاتی ہے اور مرد کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ جان دے کر بھی عورت کی عصمت کی حفاظت کرے اور غیرت مند ہو تاکہ نسل پاک رہے اور دوسروں کی ملاوٹ اس میں نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عورت کو فتنہ کہا جاتا ہے کیونکہ مرد کو عورت پر اعتبار کرنا پڑتا ہے کہ واقع ایک بچہ اس مرد کا ہے کسی اور کا نہیں۔ اسی وجہ سے مرد بے بس اور کمزور محسوس کرتا ہے اور عورت کا مرہون منت ہوتا ہے جو اگر چاہے تو آسانی سے مرد کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اس لیے عورت کے لیے اطاعت گزاری' فرمانبرداری اور تابعداری کی قدروں کی تشکیل کی جاتی ہے تاکہ وہ مرد کو خدا سمجھیں اور کوئی دھوکہ نہ کریں۔ پدر سری کی اس حیاتیاتی وجہ کو عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا اور آج کل عورتوں کے حقوق کی علمبردار خواتین اس قسم کی بحث کو رجعت پسندی کہتی ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی ساخت اور صلاحیت کو انسانی سوچ' نظریات اور اقدار سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جنسی صلاحیت طاقت کا سرچشمہ بھی ہوتی ہے اور عورت کو قابو میں رکھنے کا جواز بھی۔ بے شمار روایات اور رسم و رواج کی تہ میں عورت کی جنسی صلاحیت کو مقفل

رکھنا مقصد ہوتا ہے۔ اس صلاحیت سے مرد خوفزدہ رہتا ہے۔ نیلم حسین لکھتی ہیں کہ ''عورت خوف اور ہوس دونوں کی علامت ہے لہٰذا مرد کی جارحیت کا نشانہ بنتی ہے۔ (12)لیکن میرا موقف یہ ہے کہ خوف اور شہوت کے جذبات کی علامت ہونے کے علاوہ' عورت کی قابلیت بھی مرد کے لیے قبول کرنا مشکل ہے جس کی وجہ سے وہ جارحانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ خاص طور پر جدید زمانے میں مرد کا روایتی کردار کم ہوا ہے اور مردانگی کا بحران ہے کیونکہ عورت کی ذہانت' جرات اور بہادری ثابت ہو چکے ہیں اور اس کی کنبے کی کفالت کرنے کی قابلیت ثابت ہو چکی ہے' اسے کنٹرول میں رکھنے اور دبانے کا صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے اور وہ ہے جارحیت اور تشدد۔

پدر سری نظام کے بارے میں کچھ اور مفروضوں کو غلط ثابت کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے غلط مطلب کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اس بات کا ذکر تو ہو چکا ہے کہ پدر سری نظام آفاقی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ہر معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ پدر سری نظام صرف اقدار اور نظریات کا نظام ہی نہیں ہے بلکہ اس کی مادی وجوہ ہیں۔ ان وجوہ میں عورت کی بچہ پیدا کرنے کی اور جنسی صلاحیت ہے' عورت کے بلا معاوضہ کام کی نفی ہے اور مردوں کی کفالت کی صلاحیت کی کمی ہے جو کہ موجودہ دور کے معاشی دباؤ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اس نظام کی تہہ میں طاقت ور معاشی ڈھانچے پنہاں ہیں۔

پدر سری نظام کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ یہ صرف مردوں کا بنایا ہوا ہے اور صرف مرد اس پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔ اگرچہ اس نظام کی اقدار کا مردوں کو عورتوں سے زیادہ فائدہ ہے' لیکن یہ فائدہ زیادہ تر اعلیٰ یا حکمران طبقوں کے مردوں کو ہے۔ غریب' کسان، مزدور اور پسے ہوئے طبقوں کو پدر سری کے فوائد بہت کم ہیں۔ ان طبقوں کے مرد بھی بہت دبے ہوئے ہیں اور حکمران طبقوں کے مردوں کے بالمقابل ان کی حیثیت وہی ہے جو عورتوں کی مردوں کے بالمقابل ہے۔ پدر سری نظام کی پیرو عورتیں بھی ہیں۔ عورتیں بھی ان اقدار اور خیالات کو فروغ دیتی ہیں جو پدر سری کے تحت تشکیل دیئے گئے۔ طاقتور عہدوں پر فائز عورتوں کے رویے عین پدر سری قدروں کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ اپنے ماتحت افراد کے ساتھ ویسا

ہی سلوک کرتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔عورتیں بھی پدرسری کا ستون ہوتی ہیں خاص طور پر طاقتور طبقوں کی عورتیں جو انہیں اقدار اور حرکات پر یقین رکھتی ہیں جو مردوں نے بنائے یا جن سے ان کو فائدہ ہے۔اس طرح پدرسری اشخاص کے رویوں اور عادات سے ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ کسی ایک انسان کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے بلکہ عورتوں اور مردوں دونوں کا بنایا ہوا ہے۔ دونوں اس کی قدروں کے تحت خود کو ڈھال لیتے ہیں اور یہ نظام دونوں کے رویوں میں نمایاں ہوتا ہے۔کوئی بھی مرد یا عورت پدرسری کی اقداد کے تحت عمل کرتا ہے جب وہ کسی دوسرے کو ماتحت یا کمزور کو خود سے کم تر تصور کرتا ہے اور اس بنیاد پر اپنی طاقت کا استعمال کر کے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ یہ سب کچھ طاقتور عہدوں پر فائز یا حکمران طبقوں کی خواتین بھی اسی باقاعدگی سے کرتی ہیں جس باقاعدگی سے مرد اس نظام میں حصہ لیتے ہیں۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی علمبردار خواتین بھی اس نظام سے متاثر ہیں اور اس کی لپیٹ میں ہیں ۔ان کا سلوک اور رویہ ماتحتوں سے ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ مردوں کا۔ چنانچہ پدرسری نظام صرف مردوں کا نظام نہیں گو کہ اس کی قدروں کا زیادہ مردوں کو ہوتا ہے۔

پدرسری نظام کے بارے میں ایک اور عام غلط فہمی یہ ہے کہ یہ انفرادی اعمال پر مشتمل ہوتا ہے یعنی اس کے اثرات افراد کے رویوں اور اعمال سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پدر سری کا ڈھانچہ اجتماعی اقدار کی صورت میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی جھلک ہمیں قومی ریاست، قوم پرستی، عسکریت، سامراجیت حتی کہ ہر سماجی، سیاسی وہ معاشی ڈھانچے میں نظر آتی ہے۔ پدرسری کی ایک نمایاں شکل بنیاد پرستی کے ایجنڈے میں بھی موجود ہے۔لہٰذا یہ صرف مردوں کی حاکمیت کا نظام نہیں ہے بلکہ تمام سماجی رشتوں میں اس کے عناصر موجود ہیں ۔اس کی جھلک گھر میں، کام کی جگہ پر، سیاسی سطح پر، سکولوں میں، تدریسی نصاب میں، فوج میں، پولیس میں عدلیہ کے نظام میں، حتی کہ ریاست اور معاشرے کے ہر ادارے میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ پدرسری سوچ اقدار، نظریات اور سماجی تعلقات کا یک ٹھوس نظام ہے جس کی کئی صورتیں اور اشکال ہیں، جنہیں ایک دم پہچانا نہیں جاسکتا لیکن غور کرنے پر زندگی کے ہر شعبے میں پدرسری کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ پدرسری کی تعریف کرتے ہوئے سری لنکا کی مفکر سہیلا ابیسیکر الکھتی ہیں کہ

پدر شاہی ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس کے مفہوم کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ پدر شاہی کا مطلب صرف باپ کی حاکمیت نہیں ہے۔ یہ تو اس لفظ کے کلاسیکی معنی ہیں۔ جب ہم پدر شاہی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد کنٹرول کا وہ نظام ہے جو معاشرے کی ہر سطح پر کارفرما ہوتا ہے۔ یہ نظام مردانہ حاکمیت اور نسوانی ماتحتی اور محکومیت کے اصولوں پر استوار کیا گیا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ نظام ہر جگہ موجود ہے، سرمایہ داری میں، سامراجیت میں، سوشلزم میں اور طبقے، ذات پات، صنف اور لسانیت کے ڈھانچوں میں۔ ہمارے معاشرے کی ہر قسم کی تقسیم میں پدر شاہی کی قدریں رچی ہوئی ہیں۔(13)

چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نظام کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور اثرات دوررس۔ کیونکہ عورتوں کی زندگی پر اس نظام کے دیرپا اثرات ہوتے ہیں یہاں اس کی وضاحت ضروری تھی۔ آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اگرچہ پدر شاہی کا ڈھانچہ آفاقی ہے اور ہر معاشرے میں موجود ہے، اس کی کون سی اور کیسی شکل نمودار ہوگی، اس بات کا انحصار معاشرتی فرق پر ہے۔ ہر معاشرہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے اور ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ چیزیں یکساں ہوتی ہیں اور پدر شاہی کا نظام ان میں سے ایک ہے۔ فریدہ شہید کا کہنا ہے کہ پدر سری نظام کی کیا شکل ہوگی، اس کا دارومدار تہذیب و ثقافت پر ہے۔ ہر تہذیب اور ہر ثقافت میں پدر شاہی خود کو مختلف اور منفرد طریقے سے ظاہر کرتی ہے۔(14) آگے چل کر عورتوں کے مزاحمتی انداز کو توڑنے کے طریقوں میں ہم دیکھیں گے کہ پدر سری کا نظام مزدوروں اور کارکنوں کی جدوجہد کو توڑنے اور کمزور کرنے میں کیونکر استعمال کیا جاتا ہے اور صنعتی انتظامیہ کس طرح پدر شاہی کی قدروں کو بروئے کار لا کر عورتوں پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ نظام کیونکہ ہماری رگوں میں سرایت کر چکا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ لینا اہم تھا اور اس سے اجتماعی مزاحمت کی جن تحریکوں کا ذکر ہوا، وہ سب بنیادی طور پر پدر سری نظام ہی کے خلاف تھیں اور اس کی مختلف شکلوں کی مخالفت سے ابھریں۔ اب وقت ہے کہ انفرادی طرز کی مزاحمت کا جائزہ لیا جائے کیونکہ عورتوں نے نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی سطح پر بھی مزاحمت کے عظیم مظاہرے کئے ہیں۔

MashalBooks.org

انفرادی طرز مزاحمت

جہاں عورتوں نے اجتماعی طور پر مل جل کر مزاحمتی تحریکیں چلائی ہیں وہاں ان کی جرات اور بہادری کے ایسے کارنامے بھی تاریخ میں ملتے ہیں جہاں کسی اکیلی عورت نے بغیر اپنی جان کی پرواہ کیے کسی طاقتور یا ظالم کا مقابلہ کیا اور سرخرو ہوئی۔ تاریخ زیادہ مردوں نے لکھی' انہوں نے عورتوں کے کارنامے تحریر نہیں کیے اور تاریخ کے صفحات مردوں کے جنگی کارناموں اور خونریزی کی داستانوں سے بھر دیئے، عورتیں کہیں تاریخ میں روپوش ہو کر رہ گئیں۔ نہ تو قومی ریاستوں نے عورتوں کے بت بنائے کیونکہ ریاست بھی پدر سری کی عکاسی کرتی ہے اور نہ ہی عورتوں کے کارناموں کو یاد رکھنے کے لیے بڑی بڑی یادگاریں تعمیر کی گئیں۔ نیلسن' نپولین' گاندھی' نہرو اور جارج واشنگٹن یا لنکن کے بت بنے' لیکن فلارنس نائٹنگیل جس نے کرائمیا کی جنگ میں ہزروں فوجیوں کو دیکھا' کا بت نہیں بنا] جون آف آرک جس نے نذر آتش ہونا قبول کیا لیکن مذہبی بنیادوں پر ظلم کے خلاف لڑی' اس کا بت نہیں بنا۔ مادم کیوری جس نے ریڈیم کی دریافت کی' اس کا بت نہیں بنا'۔ عورتیں نہ بت بناتی ہیں' نہ یادگاریں اور درگاہیں تعمیر کرتی ہیں اور نہ بڑے بڑے الفاظ میں اپنی عظمت کے قصے قلم بند کرواتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی ایسی عورتیں گزری ہیں جنھوں نے ظلم کے خلاف مزاحمت کی اور اپنی جان دے دی۔ عورتوں نے مزاحمت طاقتور افراد کے خلاف کی اور اکثر یہ جانتے ہوئے کی کہ انہیں کڑی سزا دی جائے گی لیکن انہوں نے پروا نہیں کی۔ تاریخ دانوں نے ان کے قصے تاریخ سے شاید اس لیے غائب کر دیئے کہ پدر سری کی قدروں کے تحت عورت بہادری کے جوہر میدان جنگ یا باہر کی دنیا میں نہیں دکھاتی بلکہ گھر کی چار دیواری کے اندر ظاہر کرتی ہے۔ اگر کسی عورت نے اپنے جوہر میدان جنگ یا باہر کی دنیا میں دکھائے تو وہ پدسری کے نسوانیت کے تصور میں نہیں سماپاتی اور اسے مرد بنا دیا جاتا ہے جیسا کہ رضیہ سلطانہ کے ساتھ ہوا۔ نسوانیت اور بہادری کو پدر سری کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے جوڑا نہیں جاسکتا۔

نہ صرف یہ کہ عورتوں نے اپنے شاندار کارنامے میدان جنگ یا پبلک کی سطح پر دکھائے بلکہ مصوری' ادب' فنون لطیفہ' موسیقی اور رقص کے میدانوں میں بھی کارنامے

MashalBooks.org

دکھائے اور یہ اس لیے مزاحمت میں شامل کئے جاسکتے ہیں کیونکہ عورت کا لکھنا پڑھنا ' مصوری کرنا ' موسیقی یا رقص میں حصہ لینا اکثر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہر میدان میں تاریخ طور پر اور آج کل عورتیں جرات اور ہمت کی ایسی مثالیں قائم کر رہی ہیں کہ مظلوم اور بیچاری عورت کے تصور کے برعکس حالات سے مقابلہ کرتی ہوئی متحرک عورت نظر آتی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں دی جائیں گی۔ بہت سی ایسی ہیں جو بذات خود ایک کتاب بن سکتی ہیں۔ اس کتاب میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ ہر کارنامے کی تفصیل لکھی جائے۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ عورتوں نے خاموش رہ کر ظلم برداشت نہیں کئے۔ خاموش' منجمد اور مظلوم اور غیر متحرک عورت ایک متھ ہے جو پدر سری نظام کے تحت تشکیل دی گئی اور پدرسری معاشرے کی لاشعوری خواہشات کے تحت بنائی گئی۔

صوبہ سندھ کی ہاری تحریک مشہور ہے۔ ہاریوں کے ساتھ ظلم بربریت کی داستان مسعود کھدر پوش کی ہاری رپورٹ میں قلم بند ہو کر تاریخ میں محفوظ ہوچکی ہے۔ لیکن سندھ کی مشہور کسان بختاور کا ذکر اتنا سننے میں نہیں آتا۔ اس دور میں قانون یہ تھا کہ ان کا نصف حصہ ہاری کا ہوگا اور باقی نصف حکومت کا۔ لیکن حکومت کے کارندے اکثر غریب ہاریوں سے اپنے حصہ سے زائد اناج بندوق دکھا کر اور خوف و ہراس پھیلا کر لے لیا کرتے تھے۔ ایک دن جب تمام مرد کسان ہاری کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے گئے ہوئے تھے اور کسان عورتیں اناج کی حفاظت کر رہی تھیں۔ کہ اتنی دیر میں حکومت کے کارندے اناج چھیننے کی غرض سے آپہنچے۔ بختاور نے ان کا سامنا کیا۔ جب انہوں نے اپنے حصے سے زائد اناج دینے کو کہا تو بختاور نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جتنا حصہ بنتا ہے لے جاؤ۔ مگر سرکاری افسر نے اس کسان عورت کو اہمیت نہیں دی اور بندوق دکھائی اور اپنے کارندوں سے کہا کہ جتنا اناج چاہیں اٹھالیں۔ اس پر بختاور نے زرعی اوزار اٹھا لیا اور کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے ایسا نہیں ہوگا۔ اس پر گولی چلا دی گئی اور بختاور جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ آج تک سندھ کی خواتین بختاور کی بہادری کے قصے سناتی ہیں لیکن افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ جہاں ہماری تدریسی کتابیں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے بھری ہوئی ہیں' وہاں ہاری تحریک اور بختاور کا نام تک نہیں آتا۔ یہ مزاحمت اور بہادری کی عظیم ترین مثالوں میں سے ہے لیکن جہاں تاریخ صرف پدر سری بلکہ اعلیٰ طبقوں کے مفاد کے تحت لکھی گئی ہو وہاں کسانوں کی

تحریک اور اسی کی کسان عورت کی بہادری کا ذکر کون کرے۔

انفرادی مزاحمت کی ایک اور عظیم الشان مثال کا تعلق امریکہ کے شہر مونٹگمری' الاباما سے ہے۔ 1950ء کے عشرے میں وہاں سفید فام اور سیاہ فام افراد کی علیحدہ گی کا رواج تھا۔ بسوں پر ان کی علیحدہ نشستیں ہوا کرتی تھیں اور سیاہ فام افراد کو سفید فام لوگوں کی نشستوں پر بیٹھنے کی قانونی طور پر اجازت نہیں تھی۔ یہ نسل پرستی انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثال تھی۔ ایک دن' دسمبر کے سرد مہینے میں ایک غریب سیاہ فام عورت' روزا پارکنز پورے دن کی مشقت کے بعد بس پر چڑھی تو سیاہ فام افراد کی کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ سفید فام افراد کے لیے مختص سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اگلے سٹاپ پر ایک سفید فام مرد بس پر چڑھا اور روزا پارکنز سے سیٹ خالی کرنے کو کہا۔ بس میں بہت سی اور سیٹیں خالی تھیں جو سفید فام افرد کے لیے مختص تھیں۔ روزا پارکنز نے سیٹ چھوڑ نے سے انکار کر دیا۔ سفید فام شخص مصر تھا کہ اسے یہی سیٹ چاہیے جس پر روزا بیٹھی تھی۔ جب روزا نے مسلسل انکار کیا تو لڑائی جھگڑا اور نسلی فساد شروع ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں روزا پارکنز کو گرفتار کر لیا گیا اور نظر بند کر دیا گیا۔ اسی رات سیاہ فام افراد پر مشتمل کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی اور شہری حقوق حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ کئی دن تک تمام سیاہ فام افراد نے پیدل چلنا قبول کیا لیکن بسوں کا بائیکاٹ کیا۔ کئی ہفتوں کی جدوجہد کے بعد علیحدہ سیٹوں والا قانون گیر منصفانہ قرار دے دیا گیا اوار روزا پارکنز کی فتح ہوئی۔ اس کے بعد نسل پرستی کے خلاف ایک طویل مہم مارٹن لوتھر کنگ نے چلائی جس کے نتیجے میں شہری آزادیوں کے تحریک کو مزید فروغ ملا۔ روزا پارکنز نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک اکیلی غریب عورت طاقتور افراد کے خلاف مزاحمتی قدم اٹھا سکتی ہے اور جب قانون انصاف کی بجائے بے انصافی کا محافظ ہو تو ایسے قانون کو توڑنا بہتر ہے نا کہ اس کی اطاعت کرنا۔ جب بھی شہری آزادیوں کا ذکر ہوتا ہے روزا پارکنز کے اس جرات مندانہ قدم کو یاد کیا جاتا ہے جو اس نے دسمبر کی اس سرد رات کو اٹھایا۔

ایک اور واقعہ جس میں ایک عورت نے انفرادی جرات کا مظاہرہ کیا' شمالی امریکہ کے شہر روچسٹر سے تعلق رکھنے والی خانون سوزن بی۔ ایتھونی کا ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں عورتوں کے سیاسی حقوق' خصوصاً ووٹ کے حق کے لیے جدوجہد جاری تھی۔

MashalBooks.org

اس وقت امریکہ میں عورتوں کو مکمل شہری حقوق حاصل نہیں تھے اور عورتیں ووٹ نہیں دے سکتی تھیں۔ جب انتخابات ہوئے تو سوزن بی ایتھونی پولنگ اسٹیشن میں زبردستی داخل ہوئی اور اپنا ووٹ کا حق استعمال کیا۔ سوزن بی ایتھونی کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ بعدازاں عورتوں کو انتخابات میں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگیا۔ سوزن بی ایتھونی نے بھی ایک ایسا قانون توڑا جو بذات خود بے انصافی پر مبنی تھا۔ اس نے بھی سزا کی پرواہ نہ کی اور ایک ایسا عمل کیا جو آج تک یاد کیا جاتا ہے اور اس کی جرات کو سراہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پدرسری نظام نے ہر ملک میں' ہر معاشرے میں عورت کو قابو میں رکھنے اور دبانے کی پوری کوشش کی' عورت کے خلاف پولیس کا استعمال کیا' جیلوں میں بھیجا اور عدالتی نظام کو بروئے کار لایا گیا لیکن کسی ایک عورت کے عمل سے ایک جمود ٹوٹا اور بہت سے حقوق انہیں مل گئے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بہادر اور مختار عورتوں کی لاتعداد مثالیں ہیں۔ جھانسی کی رانی نے انگریزوں کے خلاف غدر کے دوران لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کردی۔ تیرھویں صدی میں سلطان التمش نے اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا لیکن مردوں سے بھرپور دربار اور مرد امراء نے عورت کی قیادت کو منظور کرنا اپنی ہتک سمجھا۔ رضیہ کے مقابلے میں اس کے گیارہ بھائی بے انتہا نا اہل اور عیش پرست تھے۔ ان کے والد نے رضیہ کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے اسے جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ نہ صرف اچھی گھڑ سوار اور سماں باز تھی بلکہ ایک بہترین حکمران اور بہادر عورت تھی۔ رضیہ سلطنت دہلی میں واحد حکمران تھی جس نے جمہوری راستہ اختیار کرتے ہوئے جمعہ کے روز نمازیوں کے وسیع مجمع سے فیصلہ کرنے کو کہا کہ وہ کس کی حکمرانی چاہتے ہیں' رضیہ کے قاتل بھائی کی یا رضیہ کی۔ نمازیوں نے اس کی تقریر سے متاثر ہو کر رضیہ کے حق میں فیصلہ دیا اور وہ حکمران بنی۔ لیکن ہر دم وہ امراء اور اپنے بھائیوں کی سازشوں کا نشانہ بنی رہی اور بالاخر اسے قتل کر دیا گیا۔ موت سے قبل رضیہ نے متعدد جنگیں لڑیں اور شجاعت کے مظاہرے کیے۔

آتش پرست یزدانی کی بیٹی امتہ الحبیب بھی بہت مشہور ہے۔ جب ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو یزدانی نے اسلام قبول کر لیا لیکن امتہ الحبیب نے اپنی خود مختاری ایک چھوٹی سی عمر سے اس طرح ظاہر کی کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنا

مذہب قائم رکھا۔ بعد میں اپنے آزادانہ مطالعے کے بعد اس نے خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ 13 سال کی عمر میں اس نے ایک اوباش شہزادے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ اس کے والدین کی بہت خواہش تھی کہ شاہی خاندان میں اس کی شادی ہو جائے۔ اس کے بے پناہ اصرار پر اس کے والد نے اسے جنگ کے طریقے' گھڑسواری' شمشیر اور تیر کمان کا استعمال سکھا دیا۔ یہ اس کام میں اس قدر اچھی تھی کہ اس نے بہت سے انعام جیتے اور سلطان بایزید نے اسے فوج میں لیفٹیننٹ مقرر کر دیا۔ امتہ الحبیب نے بے شمار جنگی کارروائیوں میں حصہ لیا اور نمایاں جرات کے کارنامے سرانجام دیئے۔ سلطان بایزید اس سے بہت متاثر تھا۔ ایک دفعہ جب امیر تیمور نے سلطان بایزید کی فوج کو پسپا کیا اور جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی غرض سے دربار لگایا تو امتہ الحبیب نے اس کے آگے ایسی تقریر کی کہ نہ صرف وہ حیران ہو گیا بلکہ اس نے اسے قتل کرنے سے گریز کیا۔ سب حیران تھے کہ امیر تیمور اتنا غضبناک' سفاک اور ظالم شخص تھا کہ اس کے آگے بولنے کی کسی کو جرات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن امتہ الحبیب نے تیمور کو اس کے قتل و غارت پر شرمندہ کیا اور اس کی سفاکی اور بربریت کو برا بھلا کہا۔ گو بعد میں امتہ الحبیب نے تیمور سے شادی کر لی' لیکن اس کی بہادری کی یہ داستان آج تک مشہور ہے۔ زندگی کے آخری سال امتہ الحبیب' جس نے بہت سی جنگیں لڑی تھیں' مطالعے میں گزارتی رہی۔ اسے کتابوں کا بہت شوق تھا اور جب اس کی وفات ہوئی تو سوائے اس کے کتب خانے کے کچھ اور باقی نہ تھا۔ اس نے ترکی کی خواتین کے بارے میں کتاب لکھی اور ترکوں کے طرز زندگی اور طرز حکومت پر اس کتاب میں تفصیل دی۔ یہ دانشور بھی تھی اور سپاہی بھی۔ امتہ الحبیب جیسی عورتوں کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں عورت کو بند رکھنے کا تصور قدرے نیا ہے کیونکہ تیرھویں صدی کی مسلمان عورتیں دانشور' مصنف اور سپاہی ہوا کرتی تھیں۔ عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا رواج معلوم ہوتا ہے' بعد میں آیا۔

مسلمان خواتین ہی میں فخر النساء بھی مشہور ہے جس نے اکیلے سیر و سیاحت کی اور آزادی اور خود مختاری سے اپنے فیصلے کیے۔ وہ صوبہ سینا کی رہنے والی تھی۔ اس کے والد ترک تھے لیکن انہیں نے مصر کے دارالحکومت قاہر میں سکونت اختیار کی۔ فخر النساء بھی تعلیم یافتہ اور پڑھی لکھی تھی۔ اس نے بھی والدین کی مرضی کی شادی سے انکار کر دیا اور اپنی مرضی

کے انتخاب کے بعد شادی کی۔ تیرھویں صدی میں جب سلطنت دہلی میں سلطان فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی، فخر النساء نے شادی سے انکار کر کے سیاحت کا فیصلہ کیا۔ فخر النساء پہلے کراچی پہنچی، وہاں سے شہروں اور قصبوں کی سیر کرتی ہوئی حیدر آباد دکن تک پہنچی۔ وہاں سے واپسی پر دہلی گئی اور دہلی سے کرنال روانہ ہوگئی۔ پانی پت سے ہو کر فخر النساء لاہور پہنچی۔ وہاں سے یہ افغانستان کی طرف چلی۔ وہاں کے مشہور شہروں کی سیاحت کرنے کے بعد اصفہان کے قریب پہنچی۔ یہ تمام سیاحت اس نے چند ملازموں اور خادماؤں کے ساتھ کی۔ اس دور میں عورت کا ایک سے دوسرے ملک سیاحت کرنا ہمیں عجیب سا لگتا ہے کیونکہ ہمیں یہی بتایا جاتا ہے کہ مسلمان عورتیں گھروں میں بند رہیں۔ اتنی آزادی، خودمختاری اور اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت تو آج کی عورتوں میں بھی دکھائی نہیں دیتی جو تیرھویں صدی کی اس عورت میں تھی۔ (15)

فخر النساء بھی امتہ الحبیب کی طرح پڑھی لکھی تھی اور اسے شاعری اور فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ مردوں کی لکھی ہوئی تاریخ میں ان عورتوں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ امیر تیمور کا نام آتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کا ہے لیکن فخر النساء امتہ الحبیب اور کئی دیگر خواتین جنھوں نے کئی میدانوں میں فتح حاصل کی خواہ وہ دانشوری کا میدان ہو یا جنگ کا، ان کا نام ونشان بھی عام درسی کتابوں میں نہیں ملتا۔ کیونکہ تاریخ حکمران خاندانوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی، اس میں ان افراد کا ذکر نہیں ہے جن کا براہ راست تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا یا جو عام لوگوں میں شامل تھے۔ مرد مردوں کی تاریخ لکھ رہے تھے، بادشاہت کی تاریخ لکھ رہے تھے، شاہی خاندانوں کے آدمیوں کے کارناموں کو سراہ رہے تھے۔ عورتوں کے بارے میں یا عام لوگوں کے بارے میں تاریخ لکھنے کا شاید رواج ہی نہیں تھا۔ درسی کتابوں میں کیونکہ عورتوں کے روایتی تصور پر زور ہوتا ہے لہٰذا یہ عورتیں روایتی تصور میں نہیں سما سکیں۔ لیکن اب عورتوں کی تحریک کے لیے یہ بات ناگزیر ہوچکی ہے کہ وہ عورتوں کی تاریخ عورتوں کے نقطہ نظر سے لکھیں اور تاریخ میں روپوش ان تمام عورتوں کو ڈھونڈ نکالیں جو بھلا دی گئیں اور جن کے کارنامے وقت کے دھاروں میں بہہ گئے۔

ان عورتوں کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے اہم فیصلے خود کئے۔ جب ان کی مرضی کے خلاف بچپن میں ان کی شادی کر دی گئی، جیسے کہ فخر النساء کی

شادی' تو انہوں نے قاضی سے فتویٰ لے کر اس شادی کو منسوخ کروا لیا۔ ان عورتوں نے آزادانہ سیاحت کی اور جنگی فوج کی سربراہی کی اور جنگی معرکے سرانجام دیئے جن میں باغیوں کی سرکوبی بھی شامل تھی۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ بیچاری عورت' مظلوم عورت' بے بس عورت کا تصور اس قدر عام کیسے ہوا؟ بہادر عورت' سرکش عورت' باغی عورت اور خود مختار عورت کا تصور بھی اسی قدر عام کیوں نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ باغی' خود سر اور سرکش عورت کو فتنہ بنا دیا گیا ہے۔ صرف ایسی عورت کو پدرسری نظام قبول کرتا ہے جو سراپا قربانی' ایثار اور اطاعت گزاری کی تصویر ہو۔ پدرسری کے تصوراتی ڈھانچے میں خود مختار اوار آزاد عورت صرف بدکردار عورت کے روپ میں جگہ حاصل کر سکتی ہے۔ وہ شریف یا نیک عورت کے طور پر نہیں ابھر سکتی۔ حالانکہ عورت کا وجود سراپا احتجاج ہے' اس عنصر کو چھپا دیا جاتا ہے۔ پدرسری معاشروں کے لاشعور میں صرف بیچاری اور مظلوم عورت قابل قبول ہے۔ خود مختار' بہادر' جنگجو اور فاتح عورت اس لاشعور میں خوف پیدا کرتی ہے لہٰذا اس کا وجود اس نظام میں قابل قبول نہیں۔

ایسی عورت کے وجود کی مکمل طور پر نفی ہو جاتی ہے یا پھر اسے بدچلن اور بری عوت کا روپ دھارنا پڑتا ہے۔ تاریخ کو مٹانا پڑتا ہے اور اس بات کو جھٹلانا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں آزاد خود مختار' بہادر اور اپنے فیصلے خود کرنے والی عورتیں تھیں۔ جنہوں نے اس تصور کے خلاف مزاحمت کی کہ ان کی شادی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف کر دی جائے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اور اس کے معنی خود متعین کیے۔ ایسی عورت کے تصور کو مٹایا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہماری تاریخ میں اس کا وجود ہے۔ عورتوں کو تاریخ نئے سرے سے لکھنی پڑے گی اور گمنام عورتوں کو باہر نکالنا پڑے گا جنہوں نے روایت سے ہٹ کر کارنامے سرانجام دیئے اور مزاحمت کی بہترین مثالیں پیش کیں۔

آج کی عورت بھی بدستور اپنے حقوق کی جدوجہد میں سرگرم عمل ہے اور اپنی مزاحمت کا اظہار کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر 1996ء میں صائمہ ارشد نے اپنے والدین خاص طور پر اپنے والد وحید روپڑی کی مرضی کے خلاف ارشد سے نکاح کر لیا۔ اس کے گھر والوں نے سردھڑ کی بازی لگا دی کہ صائمہ اس شادی کو منسوخ کر دے لیکن صائمہ گھر سے فرار ہو کر عورتوں کی پناہ گاہ ''دستک'' میں چلی گئی جہاں سے اس نے اپنا مقدمہ لڑا۔ بے انتہا

طاقتور افراد کی تگ و دو کے باوجود صائمہ اپنے موقف پر اڑی رہی۔ ارشد روپڑی خاندان کی سماجی حیثیت کے برابر نہیں تھا۔ لہٰذا یہ جنگ طبقاتی اور صنفی دونوں اعتبار سے اہم تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صائمہ جیسی سینکڑوں لڑکیاں اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں اور انہیں معاشرے کے طعنے اور مذمت برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ صائمہ کا کیس مشہور اس لیے ہوا کہ ایک تو روپڑی خاندان دولت مند تھا' دوسرا صائمہ مشرقی اور مغربی اقدار کے تصادم کی علامت بن گئی تھی۔ (16) لیکن صائمہ کا یہ فعل کوئی تنہا فعل نہیں تھا۔ بہت سی عورتیں آئے دن بغاوت اور مزاحمت اور روز مرہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی سطح پر سرکشی کا مظاہرہ کرتی ہیں ۔عورتیں ہر دم اور ہر لمحہ اپنے حالات کا مقابلہ کرتی ہیں ۔لیکن روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور عام عورتوں کی زندگی تاریخ کے اوراق میں نہیں آتے ۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو سبھی عورت اور مرد ہر وقت حالات زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن تاریخ صرف شہنشاہوں کے کارناموں کا ذکر کرتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر عام عورتوں کے روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کارناموں کو اجاگر کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں عام عورتوں کی روز مرہ کی مزاحمت قلم بند کی گئی ہے تاکہ پتا چلے کہ ہر شخص بہادر اور جرات مند ہوتا ہے۔ یہ صفت صرف مردوں اور فاتح حکمرانوں میں نہیں ہوتی۔ ہر انسان ہر روز زندگی کی تلخیوں سے لڑتا ہے اور اس جنگ کا اپنا منفرد انداز اپناتا ہے۔ مزاحمت فنون لطیفہ' مصوری اور دیگر انداز سے بھی خود کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی چند مثالیں یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔

فنون لطیفہ اور شاعری میں مزاحمت

انفرادی مزاحمت کا ایک انداز ادب' شاعری اور تمثیل کاری کی صورت میں بھی ہوا۔ ضیاالحق کے دور میں جب خواتین کے حقوق پر پے در پے حملے ہونے شروع ہوئے تو عورتوں نے نہ صرف سڑکوں پر مظاہرے کیئے' جلوس نکالے اور دیگر احتجاجی طریقے استعمال کیے بلکہ ڈرامہ نگاری' مصوری' ادب اور شاعری کو بھی مزاحمت کے لیے استعمال کیا۔عورتوں نے قلم بھی اٹھایا اور پینٹ برش بھی۔ اس طرز کی مزاحمت کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہوگی۔ اگرچہ اس طرح کی مزاحمت انفرادی طور پر کی جاتی ہے لیکن یہ اجتماعی مزاحمت کا ہی حصہ

ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص' خواہ وہ اکیلا بیٹھا لکھ رہا ہو یا سڑکوں پر جلوس میں ہو' احتجاج میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے قلم کا' اس کی مصوری کا دوسروں پر اثر ہوتا ہے۔ فن' فنون لطیفہ' مصوری اور شاعری وغیرہ کیونکہ لوگوں کے جذبات تک پہنچتے ہیں' ان کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف انسانیت کو جگانا اور لوگوں کے نرم و نازک جذبات کو ابھارنا' ظلم سے لڑنے کا موثر اور مفید طریقہ ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنا فن مکمل طور پر کسی تحریک کی نذر کر دے کیونکہ اس سے فن کی وسعت اور دلکشی پر منفی اثر پڑتا ہے لیکن جب کوئی شخص سیاسی شعور رکھتا ہو اور اپنے اردگرد کے ماحول میں ظلم و ستم سے مضطرب ہو' تو اس کا احساس خود بخود اس کے فن میں داخل ہو جاتا ہے۔ ضیاء دور کے ظلم و ستم سے کم ہی شعراء اور ادیب تھے جو متاثر نہ ہوئے ہوں۔ چاہے حبیب جالب ہوں یا احمد فراز' انہوں نے اپنی شاعری سے اس دور کی زیادتیوں کی مذمت کی اور اس کے خلاف لڑے۔ اس سے پہلے جنرل ایوب خان کے دور میں حبیب جالب نے اپنی مشہور نظم ''دستور'' لکھی۔ لہٰذا یہ مخالفت اور مزاحمت کا بہت اہم ذریعہ ہوتا ہے۔

ضیاالحق کے دور میں خاص طور پر عورتوں کو مسلمان قوم اور پاکستانی غیرت کی علامت بنایا جا رہا تھا۔ اسلامائزیشن کہیں اور تو نہ چلی لیکن عورتوں پر بہت زبردست طریقے سے اس کے اطلاق ہوا اور ان کی آزادی پر مسلسل حملے ہوئے جو اسلام کے نام پر کئے گئے۔ جہاں ایک طرف کچھ خواتین جلوس اور جلسوں میں مصروف رہیں' وہاں دوسری طرف خواتین شعراء نے اپنی شاعری میں زبردست طریقے سے ضیاء دور کی منافقت کے خلاف آوزا ٹھائی۔ ان شعراء میں خاص طور پر فہمیدہ ریاض' عذرا عباس' عطیہ داؤد اور کشور ناہید قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ بہت سی خواتین شعراء نے عورت کے تصور کی نئی تشکیل کے خلاف قلم اٹھایا لیکن ان شعراء کی چند نظمیں یادگار رہیں گی۔

فہمیدہ ریاض شروع ہی سے ایک ایسی باغی شاعرہ کے روپ میں ابھریں جنہوں نے ہمارے معاشرے کی جھوٹی' بازاری اور منافق قدروں کو مسترد کیا۔ ضیاء الحق کے دور میں انہوں نے ایک دو ایسی نظمیں لکھیں جو اپنی خوبصورتی' طاقت اور تنقیدی شعور کی بناء پر دائمی ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور نظم ''چادر اور چاردیواری'' ہے' جس میں حکمرانوں کی منافقت' جھوٹ اور دوغلے پن پر طنز ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں چادر اور چار دیواری کا

بہت ذکر تھا کیونکہ اسلامائزیشن کا سیاسی ایجنڈا عورتوں پر پابندیاں لگا کر پورا کیا جارہا تھا۔ اس خوبصورت نظم میں فہمیدہ ریاض سرکاری سوچ کی اصلیت بے نقاب کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

چادر اور چار دیواری

حضور! میں اس سیاہ چادر کا کیا کروں گی
یہ آپ کیوں مجھ کو بخشتے ہیں، بصد عنایت

نہ سوگ میں ہوں کہ اس کو اوڑھوں
غم و الم خلق کو دکھاؤں
نہ روگ ہوں میں کہ اس کی تاریکیوں میں ڈھانپوں
نہ میں گنہگار ہوں نہ مجرم
کہ اس سیاہی کی مہر اپنی جبیں پر ہر حال میں لگاؤں
اگر نہ گستاخ مجھ کو سمجھیں

اگر میں جاں کی امان پاؤں
تو دست بستہ کروں گزارش
کہ بندہ پرور
حضور کے حجرہ معطر میں ایک لاشہ پڑا ہوا ہے
نہ جانے کب کا گلا سڑا ہے
یہ آپ سے رحم چاہتا ہے
حضور اتنا تو کرم کیجئے
سیاہ چادر مجھے نہ دیجئے

MashalBooks.org

سیاہ چادر سے اپنے حجرے کی بے کفن لاش ڈھانپ دیجئے
کہ اس سے پھوٹی ہے جو عفونت
وہ کوچے کوچے میں ہانپتی ہے
وہ سر پٹختی ہے چوکھٹوں پر
برہنگی اپنی ڈھانکتی ہے
سنیں ذرا دلخراش چیخیں
بنا رہی ہیں عجب ہیولے

جو چادروں میں بھی ہیں برہنہ
یہ کون ہیں؟ جانتے تو ہوں گے
حضور پہچانتے تو ہوں گے
یہ لونڈیاں ہیں
کہ یرغمالی حلال شب بھر رہیں
دمِ صبح در بدر ہیں
یہ باندیاں ہیں!
حضور کے نطفہ مبارک کے نسب و ورثہ سے معتبر ہیں
یہ بیبیاں ہیں!
کہ زوجگی کا خراج دینے
قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں
یہ بچیاں ہیں!
کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دستِ شفقت

تو کم سنی کے لہو سے ریش سپید رنگین ہوگئی ہے۔
حضور کے حجرہ معطر میں زندگی خون روگئی ہے۔
پڑا ہوا ہے جہاں یہ لاشہ

MashalBooks.org

طویل صدیوں سے قتل انسانیت کا یہ خونچکا تماشا
اب اس تماشے کو ختم کیجئے
حضور اب اس کو ڈھانپ دیجئے!
سیاہ چادر تو بن چکی ہے مری نہیں آپ کی ضرورت

کہ اس زمیں پر وجود میراؑ نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہراہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمیں کے رخ پہ جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری عفت
یہ چار دیواریاں' یہ چادر' گلی سڑی لاش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہمسفر ہوں
کہ جس نے جیتی میری بھروسہ بھری رفاقت!

فہمیدہ ریاض کی یہ نظم بہت مشہور ہوئی اور کئی مشاعروں میں اسے خوب سراہا گیا۔ فہمیدہ ریاض نے سیاہ چادر اور چار دیواری کو عورت کی نہیں بلکہ مرد کی ضرورت بنا دیا تا کہ وہ اپنی گندگی اور میل کو چھپا سکے۔

اسی دور میں کشور ناہید نے' جو پہلے ہی سے عورتوں کے حقوق کی علمبردار تھیں' بھی خاص طور پر عورتوں کے بارے میں بنائے جانے والے نئے تصور کو الٹ دیا اور ان کی ''ہم گنہگار عورتیں'' بہت مشہور ہوئی۔

ہم گنہگار عورتیں

یہ ہم گنہ گار عورتیں ---ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے
نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں

نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابت امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہل ساز ٹھہریں۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے ساری شاہرا ہیں اٹی ملی ہیں،
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملی ہیں،
جو بول سکتی تھیں، وہ زبانیں کٹی ملی ہیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی۔
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا!

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں، نہ ہاتھ جوڑیں!

جب 1983ء میں مجوزہ قانون شہادت کے خلاف نکلنے والے جلوس پر لاٹھی

MashalBooks.org

چارج ہوا (12 فروری، 1983ء) تو سعیدہ گزدر نے اس پر نظم لکھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کیا میں ماؤف ہوں؟
یا ذہن میرا مفلوج ہے
کہ ساتھ کھڑی میری ہم جنس
مجھے یاد کراتی رہے
مجھے تو رتی رتی یاد ہے
تمھیں بھی یاد کرانا چاہتی ہوں
یاد کرو۔۔۔۔۔۔۔کہ ظلم
قانون کے حوالے سے خوب پہچانا جاتا ہے
سمجھ میں آتا ہے
تم مجھ سے انسان کا درجہ چھینتے ہو
میں تمھیں جسم دینے سے انکار کرتی ہوں۔
کیا میرے جسم کا مصرف یہی ہے
کہ پیٹ میں بچہ پلتا رہے
تمہارے لیے اندھے، بہرے، گونگے
غلاموں کی فوج تیار کرتی رہے
ہم جانتے ہیں کہ تمہارا ساتھ دے کر
ہم اپنے بچوں کی قبریں کھودیں گے
اس لیے ہم تمہارا ساتھ دیں گے

تم دو کہتے ہو
ہم دو کروڑ عورتیں
اس ظلم اور جبر کے خلاف
گواہی دیں گے

جو قانون شہادت کے نام پر
تم نے ہمارے سروں پر مارا ہے
ہم نہیں تم
واجب القتل ہو
کہ روشنی اور سچائی کے دشمن ہو
محبت کے قاتل ہو۔

عورتوں کی آدھی گواہی کے موضوع پر ہی نسیم سید نے بھی نظم لکھی:
عظیم مصنف !
ہماری قسمت کی ہر عدالت کا فیصلہ ہے
کہ ہم
جب اپنے بدن کی
بے حرمتی کی
فریاد لے کے جائیں
تو اپنا کوئی گواہ لائیں
''گواہ' ایسی گھڑی کا
جب وحشتوں سے
وحشت پناہ مانگے
''گواہ''
ایسے گناہ کا
جس کے تذکرے سے
گناہ کانپے
ہمیں کوئی ایسا معجزہ دے
کہ۔۔۔۔گونگی' اندھی سیاہ شب کو
گواہیوں کا ہنر سکھا دیں۔

MashalBooks.org

بصیر ہے تو
خبیر ہے تو۔ تجھے خبر ہے
کہ آج تک
موت کے علاوہ
کوئی نہ اپنا گواہ پایا
ہمیں پہ ٹوٹیں قیامتیں بھی
ہمیں نے ذلت کا بار اٹھایا
کتاب انصاف کے مصنف
ترے صحیفے
زبور، انجیل ہوں کہ تورات
عورتیں سب کی ذی شرف ہیں
سب اپنی اپنی کتاب کی رو سے
اپنے بارے میں باخبر ہیں
فہیم ہیں ۔۔۔ بالغ النظر ہیں
گواہیاں سب کی معتبر ہیں
تو پھر ہماری ہی پشت پر ہاتھ کیوں بندھے ہیں
ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
ترے ترازو کا کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے

امتیازی قوانین کے خلاف تو عورتوں نے شعر و شاعری میں شدید احتجاج کیا لیکن چند خواتین شعراء نے ایسی نظمیں بھی لکھیں جو وقت اور مخصوص موضوع کی قید سے آزاد ہر

MashalBooks.org

زمانے کے کسی خاص موضوع، مثلاً امتیازی قوانین یا اسلامائزیشن، کے بارے میں نہیں تھیں بلکہ ان کی اپیل زیادہ آفاقی تھی اور عورتوں کے قدیم اور ازلی مسائل اور احساسات کی عکاسی کرتی تھیں۔ اس طرح فن کے لحاظ سے یہ زیادہ خوبصورت تھیں اور دل کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں۔ اس قسم کی چند نظمیں صوبہ سندھ کی شاعرہ عطیہ داؤد نے لکھیں اور فہمیدہ ریاض نے ان کا اردو ترجمہ کیا۔ نیچے چند مثالیں دی گئی ہیں:

شرافت کا پل صراط --- عطیہ داؤد

میں تمام عمر چلتی رہی
دوسروں کے گھڑے عذابوں کے پل صراط پر
بابا کی پگڑی
بھائیوں کی ٹوپی کی خاطر
میں نے سانس بھی ان کی مرضی سے لیا
اور جب باگ شوہر کو تھمائی گئی
تب سے چابی کے کھلونے کی طرح
اس کے اشارے پر ہنسی اور روئی

بچپن میں جس طرح بھوتوں سے خوف کھاتی تھی
اس طرح اب طلاق سے ڈرتی ہوں
باپ نے جہیز میں بہشتی زیور دیا تھا
اس کا ہر لفظ سوت کی طرح میرے سینے پر مونگ دلتا ہے
میرے ذہن کا دم گھونٹ کر
جذبوں کی لہو میں قلم ڈبو کر
لکھے گئے ہیں عقیدے
مجھے نصف انسان جان کر
بنائے گئے ہیں قانون

MashalBooks.org

اور سماج کی تعمیر کی گئی ہے
ان کھوپڑیوں سے جو میری امنگوں کی ہیں۔

عطیہ داؤد پدرسری کے تحت بنائے گئے سماج، تہذیب اور اس کے قانون کو مسترد کرتی ہیں اور جھوٹی غیرت اور باپ بھائی کے وقار کے نام پر عورت کو بھینٹ چڑھانے کے خلاف عام اور سادہ زبان میں احتجاج کرتی ہیں۔ ان کے استعارے اور تشبیہ بہت واضح اور طاقتور ہیں۔ مثلاً ''شرافت کا پل صراط''،'' چابی کا کھلونا'' اور لفظ'' باگ'' کا استعمال۔ عطیہ کے انداز کی سادگی ہی اس کی شاعری کی طاقت ہے کہ وہ صاف اور عام زبان میں دل کی بات کہہ دیتی ہیں۔

عطیہ کی ہی ایک اور نظم ''بوڑھی ماں'' تقریباً ہر عورت کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے اور معاشرے کے رسم و رواج اور جھوٹی پابندیوں کے خلاف زبردستی آواز بن جاتی ہے۔ گو یہ ایک مظلوم عوت کی تصویر ہے، لیکن اس میں متبادل زندگی کا تصور ہے۔

بوڑھی ماں

بوڑھی ماں۔
گلنار۔۔۔۔
آج تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟

تم کیوں اداس ہو؟
تم نے تو بیٹے جنے تھے

ہائے ماں تمہارے مقدر
بچپن باپ کی غلامی، لڑکپن بھائی کی غلامی
جوانی شوہر کی غلامی اور
بڑھاپا بیٹوں کی غلامی میں بسر ہوا

مگر تمہارے تو قدموں تلے جنت ہے
پھر پوہ ماگھ کی ظالم سردی میں
تمہارے پاؤں برہنہ کیوں ہیں۔
تم تو گھر کی مالکہ ہو
پھر تمہارا ٹھکانہ یہ دھول کا ڈھیر کیوں ہے
تم نے تو سات بیٹوں کو اپنے پستانوں کی
گرمی سے گبرو بنایا ہے
پھر تمہارے وجود میں پیاس کیوں ہے
تمہارا وجود بھوک کا سمبل کیوں بن گیا ہے
بوڑھی ماں میری طرف ان نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو
میں نے وہ بت توڑ دیئے ہیں
کہنا غلامی کی ان روایات سے میں نے
خود کو آزاد کر لیا ہے
میں اس خوش فہمی سے نکل آئی ہوں
کہ میرے قدموں تلے جنت ہے
میں نے اپنے پیروں میں چمڑے کے مضبوط جوتے پہن لئے ہیں
میں نے اپنے ہاتھ سے جھاڑو چھوڑ دیئے ہیں
میں نے اپنے ہاتھ میں کتاب وقلم کو تھام لیا ہے
میں نے اپنے سر سے باپ' بھائی شوہر اور بیٹے کی دی ہوئی
غلامی کی چادر کو نوچ گرایا ہے
اور اپنے سر پر اپنی ذات کی ردا اوڑھ لی ہے
میں نے اپنی آنکھوں سے شرم کی پٹی اتار پھینکی ہے
اور شیشے کی عینک آنکھوں پر چڑھا لی ہے
تا کہ میں دنیا کو اپنی نظر سے دیکھ سکوں

MashalBooks.org

اس نظم میں ایک دفعہ پھر عطیہ داؤد کا سادہ لیکن دل میں اتر جانے والا انداز نظر آتا ہے۔ نظم کے شروع میں ظلم وستم کی ماری ماں بیچاری عورت کی دردناک تصویر ہے' اور نظم کے آخر میں بغاوت ہے' احتجاج ہے اور رسم و رواج کی پابندیوں سے نکل جانے کا عزم ہے۔ مزاحمت ہے۔ عطیہ داؤد کے علاوہ عذرا عباس نے بھی مزاحمتی اور احتجاجی نظمیں لکھیں۔ افسوس ہے کہ یہاں اتنی جگہ نہیں کہ اور خواتین شعراء کے خوبصورت کام کی مثالیں دی جاسکتیں۔ ان شعراء میں عشرت آفریں' زہرہ نگاہ اور سارہ شگفتہ کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان نظموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت نے مظلومیت کی اپنی تصویر کو کبھی قبول نہیں کیا۔ چاہئے عورت اعلیٰ طبقے کی ہو یا پھولن دیوی کی طرح غریب' مفلس' نادار طبقے اور نچلی ذات کی ہو' وہ اپنے خلاف ظلم کو چپ چاپ نہیں سہتی۔ پھولن دیوی نے تو بندوق اٹھالی جب عدالتوں اور معاشرے نے انصاف نہیں دیا' لیکن شعراء اور ادیبوں نے قلم اٹھایا جو بندوق سے زیادہ طاقتور ثابت ہوسکتا ہے۔ زاہدہ حنا اور نیلم بشیر نے عورتوں اور سیاسی موضوعات پر افسانے اور ناول لکھے اور مصور خواتین' خاص طور پر سلیمہ ہاشمی' نے شعوری طور پر عورتوں کے نقطہ نظر سے مصوری کی۔ اگرچہ ان پر یہ الزم عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو کسی دوسرے مقصد کے لیے وقف کیا جب کہ فن بذات خود اپنی منزل ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ عورتوں کے اپنی زندگی کے اہم تجربات ان کے فن کے اندر داخل نہ ہوں کیونکہ کوئی شخص ٹوٹا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کا فن اور ہو اور ذات علیحدہ ہو۔ ہر شخص کے کام کا فن کا اس کی ذات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے عورتوں کے تجربات کا ان کے فن میں ظاہر ہونا ناگزیر تھا۔ اسی طرح جیسے اکبر الہٰ آبادی کی شاعری میں ان کے دور کے حالات کا عکس ہے اور مردانگی سے متعلق ذہنی و جذباتی انتشار کی جھلک ان کی شاعری میں موجو ہے۔ یہ سچ ہے کہ فن کی اپنی ایک علیحدہ جگہ ہوتی ہے اور آزادی ہوتی ہے لیکن اسے مکمل طور پر ذات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

ضیا الحق کے دور میں ثقافتی دنیا میں ایک اور تحریک ابھری جس نے آمریت کے دور اور عورتوں کے حقوق کی پامالیوں کا مقابلہ کیا۔ یہ تھی متبادلہ تھیٹر کی تحریک جو ایک پر اثر اور دور رس مزاحمتی تحریک ثابت ہوئی۔ کراچی میں شیما کرمانی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لاہور میں بہت سے متبادل تھیٹر گروپ ابھرے جن میں خاص طور پر قابل ذکر

اجوکا تھیٹر اور لوک رس ہیں۔ ان دونوں گروپوں نے عورتوں کے حقوق کے موضوع پر گلی گلی گاؤں گاؤں ڈرامے کئے جو عام لوگوں کی عام زبان میں تھے اور اس طرح شعور کی بیداری میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اجوکا تھیٹر مدیحہ گوہر نے کامیابی سے چلایا اور عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین اور عورتوں پر ظلم وتشدد کے خلاف متعدد ڈرامے کئے جن میں خاص طور پر قابل ذکر ڈرامے ''جھلی کتھے جاوے''، ''ہری''، ''دھی رانی''، ''شرم دی گل'' اور ''لپڑ'' ہیں جو شاید محمود ندیم نے تحریر کئے اور مدیحہ گوہر نے ہدایات دیں۔ ''جھلی کتھے جاوے'' لوگوں کی حرص اور لالچ کے بارے میں تھا جنہوں نے ایک نوجوان لڑکی کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر اپنی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کی۔ ''ہری'' گھر سے لے کر قانون اور عدالت تک پدرسری اور طبقاتی نظام پر زبردست تنقیدی ڈرامہ تھا۔ ''چولہا'' میں چولہے پھٹنے سے جھلس جانے والی عورتوں کے بارے میں مسائل اٹھائے گئے۔ ''دھی رانی'' میں عورتوں کو گھر میں قید رکھنے پر تنقید کی گئی' شرم دی گل'' میں حدود آرڈی نینس اور پدرسری نظام کی جھوٹی قدروں پر تنقید تھی اور ''لپڑ'' میں عورتوں پر بیٹا پیدا کرنے کے دباؤ کا مسئلہ دکھایا گیا۔ اجوکا تھیٹر نے خواتین کی مزاحمتی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا اور غریب اور خستہ حال عورتوں کی زندگی پر عام الفاظ اور موثر انداز میں روشنی ڈالی۔ مدیحہ گوہر' جو کہ سیاسی ایکٹوسٹ بھی تھیں' اس گروپ کی روح ہیں۔ چنانچہ عورتوں نے فوجی حکومت اور اس کے اسلامائزیشن پروگرام کے خلاف ثقافتی' فنی اور شاعری کے طریقوں کا استعمال کر کے مزاحمت کی۔ یہ کام انفرادی مزاحمت میں بھی آتا ہے اور اجتماعی بھی کیونکہ تھیٹر کا انداز اجتماعی ہوتا ہے لیکن اس کے پیچھے بہت حد تک مدیحہ گوہر کا سیاسی جذبہ پنہاں تھا۔ دیگر میدانوں میں بھی عورتوں نے فلمیں بنائیں' غزلیں اور گیت بنائے اور گائے' رقص وموسیقی کے ذریعے بھی آمریت پر تنقید کی اور طاقت کی قوتوں کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ مثالیں بے شمار ہیں اور عورتوں نے خاموشی سے اپنی بربادی کا سماں نہیں دیکھا بلکہ اس کے ہاتھ میں جس قسم کا ہتھیار آیا وہ اسی سے لڑی' چاہے وہ شعروشاعری ہو' بندوق ہو' چاقو ہو' ڈرامہ ہو' رقص ہو یا محض آواز ہو یا قلم۔ لیکن عورتوں نے خود کو مظلومیت کی تصویر نہیں بننے دیا۔

مظلومیت کی تصویر بنانے کے پیچھے بھی سیاسی مفادات ہوتے ہیں۔ مبارک علی کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی میں جب مصورغم علامہ راشد الخیری نے عورت کی مظلومیت کی

تصویر کھینچی تو اس وقت سماجی اصلاح کا زمانہ تھا اور بہت سے لوگ عورتوں سے متعلق سماجی اصلاح کے مخالف تھے۔ راشد الخیری جو کسی حد تک اصلاح کے حامی تھے' عورت کی رنج وغم سے بھرپور تصویر کھینچ کر عورت ذات کے لیے رحم کی اپیل کرنا چاہتے تھے تاکہ اصلاح کو قبول بنایا جائے۔ (17) اگرچہ علامہ راشد الخیری بہت زیادہ ترقی پسند نہیں تھے لیکن عورت ذات پر عائد سخت پابندیوں کے خلاف تھے اور ان کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے۔ لیکن مبارک علی کا موقف یہ ہے کہ کسی پسے ہوئے یا دبے ہوئے طبقے کو قابل رحم و ہمدردی بنانے کا عمل خطرناک ہوتا ہے کیونکہ وہ گروہ' یا گروپ خود اپنے بارے میں ویسے ہی سوچنے لگتا ہے جیسے حاکم یا ظالم گروپ اسے دیکھتا ہے۔ وہ خود کو بیچارہ اور قابل رحم بنالیتا ہے تاکہ اس سے ہمدردی کی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔ لیکن یہ گروپ یا طبقہ پھر خود طبقہ ہونے کا تصور کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید اس کی قسمت میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔ اس میں اپنے حالات کو بدلنے کی خواہش یا جذبہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے محرومی کے جذبے سے شناخت کی تعمیر خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ خود کو محروم' بے بس لاچار تصور کرنے والا طبقہ' گروہ یا گروپ ظالموں کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ بے بس کو اپنی ذات کا حصہ بنالے اور محرومی کو اپنی تقدیر سمجھے۔ اس لیے طاقتور طبقے اکثر احساس محرومی خود پیدا کرتے ہیں اور اس کا جواز بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ محرمی اور بے بسی کے تصور کو وہ خود تقویت پہنچاتے ہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو سراپا تصویر غم بنا دینے کا حربہ کچھ خاص کامیاب نہیں ہوا۔ عورت نے خود اس تصور کے خلاف ثبوت دیئے اور اپنی مضبوطی کا مظاہرہ کیا۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ عورت پر ظلم و تشدد نہیں ہوتا' بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن چپ چاپ' ایک نیک مشرقی خاتون کی طرح خاموشی سے ظلم برداشت کرنے کا تصور ایک متھ ہے۔ عورت کے اندر بھرپور مزاحمت کا جذبہ ہے۔ یہ سچ نہیں ہے کہ صرف امراء اور طاقتور خاندانوں کی چند خواتین مزاحمت کا جذبہ رکھتی ہیں۔ جیسا کہ پھولن دیوی کے کیس سے ظاہر ہوتا ہے' یا بختاور کی بہادری سے ظاہر ہوتا ہے کسان اور غریب عورت بھی مزاحمت کی عظیم مثال بن جاتی ہے۔

پنجاب کی لوک داستانون کا مطالعہ کیا جائے تو پنجاب کے اجتماعی اور انفرادی

شعور میں ایک دلچسپ تضاد دکھائی دیتا ہے۔ پنجاب کی لوگ داستانوں کی ہیروئن مثلاً ہیر یا سوہنی بے حد طاقتور' پرعزم اور مستقل مزاج' آزاد اور خود مختار خواتین نظر آتی ہیں۔ پنجاب کے عام مرد کبھی اپنی بہن' بیٹی یا بیوی میں وہ خصوصیات برداشت نہیں کریں گے جو ہیر یا سوہنی میں تھیں۔ لیکن یہی مرد ہیر بڑے شوق سے سنتے ہیں اور سوہنی مہیوال کے قصے بہت انہماک اور شوق سے سنتے ہیں۔ اس تضاد کو سمجھنا ضروری ہے کہ کیا یہ پنجاب کی تاریخ میں تبدیلی کا اثر ہے یا پنجاب کے شعور اور لاشعور میں تضاد اور کشمکش ہے کہ ہیر کا مزار بنایا ہوا ہے جہاں ہزاروں عقیدت مند جاتے ہیں۔ ہیر نے مقدمہ کر کے اپنی شادی منسوخ کروا دی تھی اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ تاہم معاشرتی اقدار کو برقرار رکھنے کے لیے اسے زہر دے دیا گیا اور اس کی موت سے ہی اس کی سرخروئی ہوئی۔ لیکن پنجاب کا کون سا باپ اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف کی گئی زبردستی کی شادی منسوخ کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ کون سی بیٹی والد کے غلط فیصلے کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے؟ بہت کم۔ اور جب صائمہ ارشد نے اپنا جائز مذہبی اور قانونی حق مانگا تو پنجاب کا ایک نہیں' سارے والد اس کے خلاف کھڑے ہوگئے اور عزت و غیرت کا واسطہ دینے لگے۔ اس کا حق مانگنا ان کی عزت مٹی میں ملانے کے برابر ہو گیا۔

اس طرح سوہنی' جس کے قصے پنجابی مرد بہت شوق سے دہراتے ہیں اور اس داستان سے لطف اندوز ہوتے ہیں' نے اپنے شوہر کے علاوہ ایک اور مرد کو چاہا۔ وہ روز اس کو ملنے دریا پار کر کے جاتی۔ بالآخر اس کی نند نے کچا گھڑا رکھ دیا اور سوہنی ڈوب گئی۔ لیکن کون سا مرد یہ برداشت کرے گا کہ اس کی ماں' بہن یا بیٹی یا بیوی اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد سے ملے اور اس سے رشتہ قائم کرے؟ ایسی باتوں پر تو غیرت کے نام پر قتل ہو جاتے ہیں۔ محض شک کی بنا پر قتل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پنجاب کی اجتماعی اور لاشعوری یادداشت میں ہیر یا سوہنی اس قدر اہم کیوں ہیں؟ موجودہ پنجاب میں قدروں کا نظام اس قدر مختلف کیوں ہے؟ کون سے تاریخی عوامل سے یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں؟ شعوری اور لاشعوری سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے؟ ہیر اور سوہنی دونوں رسم و رواج اور روایات کے خلاف مزاحمت کی تصویریں ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی چارگی اور مظلومیت کی تصویر نہیں ہے۔ پنجاب کی عوت ماضی میں بہادر اور مضبوط تھی۔ آج

اسے محض رحم و کرم کی حقدار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟ شاید ہیر اور سوہنی ہر شخص کے لاشعور میں چھپی ہوئی اس بغاوت کی علامت ہیں جو وہ شعور میں دبا لیتا ہے۔ ہم سب میں سماجی زنجیریں توڑنے کی لاشعوری خواہش ہوتی ہے لیکن ہم سب تہذیب و تمدن' رواج' رسوم اور روایات کی بڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ لوک داستان میں ہماری وہ دبی ہوئی خواہشات باہر آجاتی ہیں جن کا اظہار ہم براہ راست کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ لوک داستانوں' ادب' ثقافت' شاعری اور دیگر فنون لطیفہ میں مزاحمت کا عنصر نمایاں ہے۔ ہمارے معاشرے اور تہذیب میں مزاحمت کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ ان میں سے بہت سی مثالوں کا ذکر کر دیا گیا اور' بہت سی وقت کے دھارے میں بہہ گئیں اور گمنام ہوگئیں۔ تاریخ کے اوراق میں ان کا ذکر نہیں آسکا۔

اس کتاب کے پہلے حصے کا مقصد مزاحمت کے تصور کی وضاحت اور ہماری تاریخ میں مزاحمت کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ اس کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں اقسام کی مزاحمت کی کچھ مثالیں دی گئیں تاکہ یہ بات ثابت کی جائے کہ عورت محض ایک غیر متحرک' خاموش اور بے بس ہستی نہیں بلکہ اس کی بہادری اور شجاعت کی بے شمار مثالیں ہیں۔ کوشش کی گئی کہ مظلومیت کے تصور پر تنقید کی جائے اور بے چاری عورت کے افسانوی تصور کو توڑا جائے۔ عورت کے عزم' حوصلے اور ہمت کا اعتراف کیا جائے اور تاریخ میں عورت کو داخل کیا جائے۔ میں کہاں تک اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوئی ہوں اس کا فیصلہ تو پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے لیکن میں نے کوشش ضرور کی ہے کہ پوری دنیا کے مختلف خطوں سے مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا جائے کہ عورت نے ہر قدم پر مزاحمت کی اور لکشمی بائی' جھانسی کی رانی نے تو بہت بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں وہ مواد شامل کیا گیا ہے جو عورتوں کے ساتھ انٹرویوز کے دوران اکٹھا ہوا۔ انٹرویوز عام خواتین کے کیے گئے جو مشہور معروف نہیں ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ تاثر توڑا جائے کہ صرف خاص خاص اعلیٰ طبقے کی' امراء کی اور شاہی خاندانوں کی خواتین نے مزاحمت کا اور بہادری کے مظاہرے کیے۔ میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر طبقے' ہر نسل ہر مذہب اور ہر سطح کی عورت روز مرہ کے حالات کا مقابلہ مزاحمت کے ذریعے کرتی ہے۔ اس لئے یہ انٹرویوز دینے والیوں میں گھریلو خادمائیں بھی شامل ہیں

اور غیر رسمی سکولوں کی دیہاتی اساتذہ بھی' غیر سرکاری تنظیموں کی کارکن بھی اور صنعتی شعبوں میں کام کرنے والی خواتین بھی۔ یہ خواتین داستانوں اور قصوں کی ہیروئن نہیں ہیں۔ بڑی بڑی تحریکوں کی سربراہ نہیں ہیں' مشہور و معروف سیاسی رہنما نہیں بلکہ روز مرہ کی عام عورتیں ہیں۔لیکن ان کی زندگی میں ہر دم جدوجہد ہے' کشمکش ہے' تصادم ہے اور مزاحمت ہے۔

میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتی تھی کہ مزاحمت یا بغاوت صرف وہ نہیں ہوتی جو رضیہ سلطانہ جیسی شہزادی یا ملکہ نے کی یا سیاسی پارٹیوں کی سربراہوں نے کی یا جو تحریکوں کی رہنما خواتین نے کی۔ روز مرہ کی بھی ایک مزاحمت ہوتی ہے جو ہر شخص' عورت اور مرد' ہر دم کرتا ہے۔ بے شک یہ چھوٹے چھوٹے قصوں یا واقعوں میں ظاہر ہوتی ہے اور تاریخ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتی لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ تاریخ عام لوگوں کی روز مرہ کی جدوجہد کا ریکارڈ رکھے۔ کیونکہ جمہوری ادوار میں تاریخ صرف حکمرانوں اور امراء کی نہیں ہوتی بلکہ عام لوگوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ دنیا کو خاص نہیں عام لوگ بڑھاتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کی آپ بیتیاں ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں نہیں آئیں گی۔ تاریخ کے اوراق بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ''کارناموں'' کو سراہیں گے' لیکن کسی گھریلو خادمہ یا عام مزدور کی کشمکش قلمبند کر رہی ہوں ۔ یہ جدوجہد صرف پدرسری نظام اور اس کی مختلف صورتوں کے خلاف نہیں بلکہ طبقاتی کشمکش بھی ہے' صنفی بھی ہے اور ہر قسم کے امتیاز' نا انصافی اور ظلم کے خلاف ہے۔ ان کی جدوجہد گھروں میں بھی ہوتی ہے' دفتروں میں بھی' کھیتوں میں بھی' فیکٹریوں میں بھی اور ہر ایسی جگہ پر جہاں ظلم ہو۔ یہ جدوجہد خاندان سے بھی ہوتی ہے' پدرسری سے بھی' مالکان سے بھی اور فیکٹریوں کی انتظامیہ اور اعلیٰ افسران سے بھی۔ ان کی زندگیاں سراپا جدوجہد ہیں اور میری خواہش ہے کہ میں انہیں قلمبند کرلوں تاکہ دنیا بھول نہ جائے کہ جہاں عورتوں پر تشدد اور ظلم ہوتا ہے' وہاں وہ سراپا مزاحمت بن جاتی ہیں اور حالات کا بہادری اور جوش سے مقابلہ کرتی ہیں۔ یہ مظلوم نہیں ہیں کیونکہ یہ متحرک ہیں' یہ بے بس نہیں کیونکہ یہ سرگرم عمل ہیں' یہ بے چاری نہیں ہیں کیونکہ یہ سراپا احتجاج ہیں ۔ ان کی مزاحمت کے انداز چاہے بالواسطہ ہی سہی' لیکن یہ بے جان شے کی طرح نہیں۔

MashalBooks.org

تیسرا باب

مزاحمت اور مزدور خواتین

پس منظر

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ عورت گھر کی ملکہ ہے اور کنبے کی کفالت مرد کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں مزدور خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد الیکٹرونک، گارمنٹس، پیکنگ، دوائیں بنانے والی کمپنیوں اور خدماتی شعبوں میں 10 سے 12 گھنٹے مسلسل اور ان تھک کام میں مصروف رہتی ہیں۔ عورتوں کی گھریلو مزدوری کو تو ''کام'' سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اسے سرکاری اعدادوشمار میں گنا ہی نہیں جاتا کیونکہ اس کام کو ''پیار کی خدمت'' کا نام دے کر اجرت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عورتوں کے اجرت والے کام کو بھی اکثر اضافی، غیر ضروری یا غیر اہم قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور اس کام کی مرکزی حیثیت کو جھٹلا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میلوں کی مسافت طے کر کے پانی لانا یا ایندھن جمع کرنا بے حد اہم کام ہیں لیکن ان کی نہ کوئی اجرت ہوتی ہے اور نہ کوئی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والی مزدور خواتین کو خاندان کی مددگار کہا جاتا ہے اور انفرادی اجرت نہیں دی جاتی۔ عورتوں کی بہت بڑی تعداد اس وقت بطور جز وقتی یا عارضی مزدور کام کرتی ہے۔ ان پر لیبر قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس طرح بہت سی عورتیں ریاست کے اور بین الاقوامی معاہدوں کے دیے ہوئے تحفظات کی زد میں نہیں آتیں۔ نتیجتاً عورتیں مزدور طبقے کا وہ حصہ ہیں جس کا مزدور بچوں کی طرح سب سے زیادہ استحصال ہوتا ہے۔

خواتین مزدوروں کے حالات پر عالمی، قومی اور مقامی سطح پر بہت تحقیق ہوئی ہے۔ اس موضوع پر کیے گئے عورتوں کے انٹرویوز پر مبنی مطالعے کا ذکر یہاں اس پس منظر کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

28 ستمبر 1998 کو انگریزی اخبار ''دی نیوز'' میں ایک خبر شائع ہوئی جس میں

MashalBooks.org

آئی۔ایل۔او نے خواتین مزدوروں کی حالت پر تشوش کا اظہار کیا۔آئی۔ایل۔او کے مطابق بہت سے ترقی پذیر غریب ممالک بیرونی سرمایہ کے لیے پرکشش حالت اور سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے ایکسپورٹ پروسیسنگ زون(EPZ) کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ان آزاد تجارتی زونز میں کئی ملین خواتین ملازمت کرتی ہیں لیکن کام کا ماحول اس قدر ناسازگار ہے اور معاوضہ اتنا کم کہ عورتوں کو ان زونز کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔آئی۔ایل۔او کی رپورٹ کے مطابق 27 ملین مزدور 850 ایکسپورٹ پراسیسنگ زونز میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے 90 فیصد خواتین ہیں یہ زون معیشت کو آزاد منڈی کی عالمی تجارت سے منسلک کرنے کا طریقہ ہیں۔ ان زونز میں مزدوروں کے کوئی حقوق نہیں ہوتے اور لیبر کی طاقت بہت کم ہوتی ہے۔ ان زونز میں صرف ایک چیز بنائی جاتی ہے مثلاً گارمنٹس' الیکٹرونک مشینوں کے پرزے یا پھر کپڑا۔ یہ بات عام دیکھی گئی ہے کہ جہاں بھی لیبر کے حقوق کم ہوتے ہیں' ان جگہوں اور فیکٹریوں میں عورتوں کی کثیر تعداد کام کرتی ہے۔

عورتوں کے موضوع پر اپنی کتاب'' عورت: خواب اور خاک کے درمیان'' میں مشہور مصنفہ کشور ناہید غیر اجرتی مزدور خواتین جز وقتی مزدوروں اور معیشت میں خواتین کے کردار پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ (1) کشور ناہید خاص طور پر مزدور خواتین کو صنفی تفریق کے مسئلے سے جوڑتی ہیں اور عورتوں کے کام کی جانب مردانہ اور خاندانی رویوں کو عیاں کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

خواتین کی کافی تعداد کی رائے یہ تھی کہ ان کے کام کرنے کے باعث ان کے شوہر ماہانہ اخراجات اور ذمہ داریوں کے بارے میں کافی لاپروا ہو گئے ہیں۔ ان خواتین نے گھروں میں لڑائیاں بڑھنے اور عورت کی کمائی کو رقابت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے کی مثالیں بھی دیں۔عورتوں نے یہ بھی بتایا کہ جیسے ہی شوہر گھر میں داخل ہوتا ہے وہ اسے کوئی ایسا کام اپنے سامنے کرنے کی اجازت نہیں دیتا' جس سے اخراجات میں اضافے کا امکان ہو۔ البتہ شوہر کے پیچھے بیوی کام جاری رکھ سکتی ہے۔ کچھ خواتین' جن کی تعداد کوئی 3 فیصد ہے' شوہر یا باپ سے چھپ کر کام کرتی ہیں۔ان لوگوں کو بھی گھر کے خراجات' اضافی آمدنی سے پورے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔مگر وہ یہ پوچھنے کی جرات نہیں کرتے کہ اضافی آمدنی کیوں اور کیسے ممکن ہے؟ (2)

کشور ناہید کے اس مشاہدے اور مطالعے سے چند پیچیدہ قسم کے عوامل سامنے آتے ہیں ۔ ایک طرف عورت کا کام کرنا اور کما کر لانا مردانہ انا وغیرہ کے خلاف ہے اور وہ اپنی نظروں کے سامنے اسے ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن دوسری طرف عورت کی کمائی ناگزیر ہوچکی ہے کیونکہ اس کے بغیر گزارا ممکن نہیں ۔ چنانچہ اس المیے کا حل یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ مرد خاموشی سے اس ضروری اضافی آمدنی کو قبول تو کر لیتا ہے لیکن اسے تسلیم نہیں کر سکتا ' دوسروں کے سامنے اور نہ ہی اپنے سامنے کیونکہ وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے۔ لاشعور میں چھپے ہوئے غصے کو لڑائی جھگڑے میں نکالتا ہے اور عورت کے کام کو رقابت و حقارت سے دیکھتا ہے۔ کشور ناہید کے یہ مشاہدات ہمارے بنیادی مفروضے کی تائید کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی سیاسی معیشت نے نسوانیت کا نہیں بلکہ مردانگی کا بحران پیدا کر دیا ہے اور تشدد اس بحران کے بیشتر نتائج میں سے ایک ہے ۔ مردانگی نئے زمانے کے تلخ تقاضوں سے سمجھوتا نہیں کر پائی۔ کشور ناہید کا تجزیہ بھی یہی ہے اور ان کے الفاظ ہیں کہ:

مڈل مین کی موجودگی ایک اور تہذیبی ردعمل کی عکاسی کرتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں گھر کے مرد اس رقم سے مستفید ہونے سے ہراساں یا گریزاں نہیں جو عورت کی کمائی یا اجرت کے توسط سے گھر میں آرہی ہے۔ البتہ اس کے کام میں براہ راست دلچسپی لینا یا اس کا مفاد سامنے رکھنا مردانگی کے لیے شرمناک لگتا ہے۔ اس لیے کام حاصل کرنا اور کام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا یا تو عورت کے اپنے حوصلے پر منحصر ہے یا وہ کسی اور خاتون سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ (3)

مرد کی انا پر عورت کی کمائی کے حملے کا تدارک صرف اس کی کمائی کی نفی کرنے یا اسے جھٹلانے میں ہے۔ لیکن اس کمائی کا فائدہ اکثر بلا تامل اٹھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بہت سے گھروں میں عورتوں کے کمائی سے گھریلو اخراجات پورے ہوتے ہیں اور مرد اپنی کمائی سے ممکن بنی' صرف مرد کے نام ہوتی ہے اور قانونی طور پر عورت کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کبھی ناچاقی یا کشیدگی ہو جائے تو کھڑے پاؤں عورت کو گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ تمام عمر اس نے کنبے کی کفالت کی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مردوں کی تربیت اس طرح ہوتی ہے کہ عورت کی کمائی کو بہ آسانی قبول کرنا اور اسے برابر کا ساتھی سمجھنا مردانہ نفسیات اسے اس لیے قبول نہیں کرتی کہ مرد ہونا دوسروں کو کما کر کھلانے کا نام

ہے نہ کہ دوسروں سے، خصوصاً عورتوں سے لے کر کھانا۔ تاریخی طور پر صرف طوائفوں اور ناچنے والی عورتوں کو کمانے والی عورتیں سمجھا جاتا تھا۔ اور گھریلو عورت کے لئے باہر جا کر کمانا طوائف کے تصورات سے جڑ جاتا تھا۔ یہ معاشرتی سوچ اتنی گہری ہے کہ آج تک جبکہ عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد گھر سے باہر کام کرتی ہے، مردوں کے لئے جذباتی طور پر یہ ایک ناقابل قبول حقیقت ہے، شرمندگی کا باعث ہے او اس کمائی کو ''اضافی'' یا محض ''وقت گزاری'' کا ذریعہ کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ جبر کی شکار خوتین کا ایک وسیع مطالعہ نازلی جاوید نے اپنے مقالے ''سرمایہ دارانہ جبر کا عالمی شکار۔خواتین'' میں کیا ہے۔(4) نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ:

> تھیچر کی طرف سے رائج کردہ مانیٹر ست اور لبرل ازم (Neo . liberalism) کی پالیسیوں کا سب سے بڑا شکار محنت کش طبقے کی خواتین ہی ہوئی تھیں۔ اور ان پالیسیوں کو آج دنیا کی تقریباً تمام محنت کش تحریکوں کے لیڈروں نے اپنا لیا ہے۔۔۔۔نجی صنعت میں بھی خواتین کو ہی سب سے پہلے ملازمت سے جواب، کم گھنٹے، جزوی یا کلی طور پر لچکدار کنٹریکٹ کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ یورپ کی ایک تہائی ملازم خواتین جزوقتی کام کرتی ہیں اور یہ ان کی اپنی خواہشات کے برعکس بچے کی دیکھ بھال کا تحفظ نہ ہونے کے باعث ہے جو انہیں کل وقتی کام کرنے کے قابل بناتا ہے۔انہیں وجوہات کے باعث لاکھوں خواتین بڑی اور مصروف عالمی اجارہ دار کمپنیوں کے لیے نیم کنٹریکٹ کی بنیاد پر گھر میں کام کر رہی ہیں۔(5)

نازلی جاوید کا مطالعہ اس دلچسپ امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کام کی تشکیل اس طرح کی جارہی ہے کہ عورت کے روایتی کردار کو تقویت ملے۔عورت گھر میں بھی رہے بچوں کی نگہداشت بھی کرے اور آمدنی میں اضافہ بھی۔ اس طرح عورت کو گھر میں قید رکھ کر اس سے گھریلو مشقت بھی لی جاسکتی ہے، آمدنی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، منافع بھی بڑھایا جاسکتا ہے اور مرد کی انا کو ٹھیس پہنچنے سے بھی بچایا جاسکتا ہے۔ ان تمام عوامل کا پورا بوجھ صرف اور صرف عورت برداشت کرتی ہے جس کا بوجھ دگنا ہو جاتا ہے۔ نازلی جاوید کے مطابق ''ایک

MashalBooks.org

سستی ترین، لچکدار اور مطمئن رہنے والی مزدور کی تلاش میں ...... ترقی یافتہ ممالک نے بھی بڑی حد تک منظّم لیبر خاص کر مردوں کو بڑی حد تک کم کر کے ان کی جگہ نیم کنٹریکٹ پر افراد خاص کر خواتین کو ملازمت دینا شروع کر دی ہے جو اپنے گھر میں کپڑوں، الیکٹرونکس اور جوتوں تک ہر چیز تیار کرتی ہیں۔ اس طرح کا ماسوائے خام مال کے کسی اور چیز پر بالکل خرچ نہیں ہوتا اور وہ کسی کام کو جلد از جلد مکمل کروانے کے لیے اس محنت کش خاتون کو ڈرانے کے لیے ایک لالچی دلال کے ذریعے کام کرتا ہے"۔ (6) بقول نازلی جاوید، دنیا بھر میں 200 ملین خواتین نیم کنٹریکٹ والی ملازمتیں کر رہی ہیں جہاں انہیں کسی قسم کے حادثے یا بیماری و معذور کے خلاف قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ آزاد تجارتی علاقوں یا ایکسپورٹ پروسیسنگ زونز میں کسی قسم کا قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔، جنسی خوف چھایا ہوا ہے، ٹریڈ یونین پر پابندیاں ہیں تو زیرِ زمین کام ہوتا ہے۔ آزاد تجارتی زونز دنیا کے 50 سے زائد ترقی پذیر ممالک میں قائم کر دیئے گئے ہیں اور ان میں 85 سے 90 فیصد کام کرنے والی خواتین ہیں۔ (7)

نازلی جاوید انکشاف کرتی ہیں کہ ایک اندازے کے مطابق خواتین کل کام کا دو تہائی انجام دیتی ہیں اور عالمی آمدنی میں ان کا حصہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ عالمی ٹریڈ یونین کی طرف سے کئے جانے والے ایک مطالعے کے مطابق خواتین کی گھریلو ذمہ داریاں کھانا پکانا، صفائی دھلائی، بچوں کی دیکھ بال کو بھی اگر پیداواری عمل مان لیا جائے تو دینا کی خام ملکی پیداوار کی کل مالیت میں 24 سے 30 فیصد ہو جائے۔ (8)

سرمایا دارانہ نظام کے تحت عورتوں کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ اس نظام نے خواتین کو گھر کے افراد کی خدمت اور کام کی فکر پر آقاؤں کی خدمت کا فریضہ سونپا ہے۔ اس کردار کو معاشی کٹوتیوں کے اس دور میں مذہبی تعصب اور خلاقی پراپیگنڈے کے ذریئے نئے سرے سے زندہ کیا جا رہا ہے اور مولویوں اور پادریوں نے عورتوں کے روایتی کردار کو مضبوط کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف سرمایہ درانہ نظام سے آیا ہوا بوجھ ہے اور دوسری طرف صدیوں پرانا بوجھ جو مذہب، روایت، رسم و رواج اور پدر شاہی کی ریت نے عورت کو عطا کیا ہے۔ اس کی زندگی دونوں طرح کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں نے جہاں جمہوریت، آزادی،

برابری کی قدروں کو فروغ دیا' وہاں عورتوں کے لیے نہ تو جمہوریت آئی' نہ آزادی' نہ برابری۔عورتوں کے لیے نہ تو کوئی نشاۃ ثانیہ آئی اور نہ مذہبی اصلاح کی تحریکیں۔ جمہوریت' جدت پسندی' نمائندہ حومت کا تصور' آزادی' برابری کے تصورات' قومیت' قومی ریاست' سیکولرزم' روشن خیالی' ترقی پسندی' ان تمام چیزوں نے عورتوں کے بوجھ کم نہیں کیئے بلکہ بہت بڑھا دیئے۔صنعتی دور کا وعدہ عورتوں کے لیے جھوٹا ثابت ہوا کیونکہ گھر کا کام مشینوں سے آدھا ہو جانے کے بجائے انہی مشینوں کا عورتوں کو غلام بنا دیا گیا' گھر میں بھی اور باہر بھی۔عورت کو نہ مشینی دور نے آزادی دلوئی اوار نہ جدید جمہوری نظام نے۔ بلکہ نئی طرز کے بوجھ اس کے کاندھوں پر پڑے جو پہلے نہیں تھے۔

جن امور کا ذکر نازلی جاوید کرتی ہیں ان میں عورت کا مرد کی نست کم معاوضہ' عورتوں کو جہز نہ لانے پر نذر آتش کرنا' عورتوں کی خرید و فروخت' عورتوں کو خریدار بنانے کے لیے اشہار دینا کہ بچے کو چھاتی کا دودھ نہیں بلکہ مصنوعی دودھ پلائیں' عورتوں کی جانب برطانیہ کی لیبر حکوت کا منفی رویہ' مرد مزدوروں اور انتظامیہ کا جنسی طو پر عورتوں کو ہراساں کرنا اور گھریلو تشدد شامل ہیں۔(9) اگرچہ نازلی جاوید کا مطالعہ وسیع ہے اور بین الاقوامی سطح پر لکھا گیا ہے۔لیکن پاکستان کی مزدور خواتین کے بارے میں بھی تفصیلی تحقیق کی گئی ہے جس میں یہی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں جن کا ذکر نازلی جاوید کے مقالے میں ہے۔

پاکستان مزدور خواتین کی صورت حال

پاکستانی مزدور خواتین کی صورت حال کا باضابطہ مطالعہ پاکستان کی مزدوروں کی تعلیم سے متعلق تنظیم پائلر (Piler) نے کیا۔اس مطالعے پر پائلر کے کرامت علی اور فرحت پروین نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا '' پاکستان کی خواتین مزدوروں کو منظّم کرنا''۔(10) اس مکالمے میں انہوں نے کراچی' لاہور' فیصل آباد اور ملتان میں قائم کی گئی صنعتوں کا جائزہ لیا۔فرحت پروین اور کرامت علی کو احساس ہوا کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف 2ء3 فیصد عورتیں محنت کش شعبے میں شامل تھیں۔ جبکہ مشاہدہ اور تجربہ بتایا تھا کہ درحقیقت صنعتی شعبے میں شامل تھیں۔ جبکہ مشاہدہ اور تجربہ بتایا تھا کہ درحقیقت صنعتی شعبے میں عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ خاص طور پر دوائیں بنانے والی فیکٹریوں'

MashalBooks.org

الیکٹرونکس اور گارمنٹس میں 1980ء سے عورتوں کی ایک کثیر تعداد شامل ہو رہی تھی۔ کہ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ٹریڈ یونینوں میں عورتوں کی شمولیت برائے نام تھی۔ چنانچہ انہوں نے فیصل کیا کہ رسمی شعبے سے متعلق ان فیکٹریوں کا مطالعہ کیا جائے جن میں عورتوں کی کثرت ہے۔ ان میں اشیاءخورد ونوش اور مشروبات بنانے والی فیکٹریاں' گارمنٹس' دواؤں الیکٹرنکس' میک اپ کا سامان تیار کرنے والی فیکٹریاں' پلاسٹک کی مصنوعات بنانے والی فیکٹریاں اور ربڑ کپڑا اور قالین کی صنعتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اینٹوں کے بھٹوں اور ماہی گیری کی صنعت میں بے شمار خواتین پائی گئیں۔ یہ مطالعہ 1988ء میں کیا گیا۔ عورتوں کے انٹرویو لئے گئے اور کوشش کی گئی کہ مزدوروں اور نسوانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ انتظامیہ نے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن آخر کار پائلر نے ان خواتین تک رسائی حاصل کر لی۔ بعد میں اس عملی تحقیق کے نتیجے میں کراچی میں ویمن ورکرز سینٹر کھولا گیا۔

1980ء کی دہائی کے آخر میں نج کار کا رواج شروع ہو گیا تھا' ریاست بہت سی صنعتوں کو نجی شعبوں میں منتقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے دستبر دار ہو رہی تھی، تحتی رودوبدل (Structural Adjustment) کا پروگرام آئی۔ ایم۔ ایف کے زیر نگرانی عروج پر تھا۔ ان عوامل کی وجہ سے محنت کشوں پر مضر اثرات مرتب ہو رہے تھے' نوکری کا تحفظ ختم ہو رہا تھا' سب کنٹریکٹ کرنے کی روش چل پڑی تھی اور مزدور زیادہ تر جز وقتی یا عارضی ہو چکے تھے۔ مزدوروں کے بنیادی حقوق آزاد منڈی کی معیشت اور نیولبرل ازم کے نظریات کی وجہ سے سلب ہو رہے تھے۔ پاکستان میں اسلام کے نام پر ایک رجعت پسند معاشرہ قائم ہو رہا تھا جس سے مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ متاثر تھیں۔ اور مزدور خواتین نہ صرف معاشی تبدیلیوں بلکہ اسلام کے سیاسی استعمال کی وجہ سے دوہرے طریقے سے متاثر ہو رہی تھیں۔ ان تمام حالات کا خواتین مزدوروں کی نفسیاتی' ذاتی' جذباتی اور کام کی زندگی پر اثرات کا اندازہ لگانا ضروری تھا۔

پائلر نے انکشاف کیا کہ سرکاری اعداد و شمار کے برعکس عورتوں کی رسمی شعبے میں نمایاں شمولیت ہے۔ صنعتی شعبے میں عورتوں کی تعداد 1973ء میں 45ء5 فیصد سے لے کر 1981ء میں 27ء15 فیصد ہو چکی تھی۔ البتہ صبیحہ حفیظ کی تحقیق کے مطابق عورتوں کی شمولیت کی شرح ہر صوبے میں مختلف تھی۔ (11) صوبہ سندھ میں یہ شرح 8ء6 فیصد تھی' پنجاب

MashalBooks.org

میں 4 فیصد تھی اور بلوچستان اور صوبہ سرحد میں برائے نام تھی۔ سندھ میں عورتوں کی زیادہ تعداد کپڑے کی فیکٹریوں میں تھی، پنجاب میں گارمنٹس میں غیر رسمی شعبوں میں بھی محنت کش خواتین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عورتوں کو انجینئرنگ اور کیمیائی شعبوں میں بھی داخل کیا جارہا تھا۔ سب سے زیادہ تعداد غیر شادی شدہ عورتوں کی تھی جو 60 فیصد تھی، اس کے بعد شادی شدہ عورتیں تھیں جن کی تعداد 29 فیصد تھی اور ان کے بعد گیارہ فیصد عورتیں بیوہ یا طلاق یافتہ تھیں۔ بہت سی چھوٹی بچیاں جن کی عمر دس سے پندرہ برس تھی، گارمنٹس اور دیگر صنعتوں میں سرگرم تھیں نجی شعبے میں سرکاری شعبے کی نسبت زیادہ خواتین مزدور موجود تھیں۔ تقریباً تمام عورتیں خواندہ تھیں اور کم از کم سکول کی تعلیم حاصل کر چکی تھیں۔ دواؤں کی فیکٹریوں اور ماہی گیری کی صنعت میں سب سے زیادہ ناخواندہ خواتین تھیں۔ لیکن تعلیم کا ہنر مند یا غیر ہنر مند مزدور کی تفریق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مزدوروں کو انتظامیہ اپنی مرضی سے ہنر مند یا غیر ہنر مند کے خانوں میں ڈال دیتی تھی۔ سب سے زیادہ ہنر مند ہونا الیکٹرونکس یعنی بجلی کے پرزے بنانے والی صنعت کے لیے ضروری تھا۔

فرحت پروین اور کرامت کا کہنا ہے کہ پاکستان میں سب کنٹریکٹ کر کے چھوٹی صنعت کو کام دینا یا گھر پر کام دینے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ زیادہ تر مزدور خواتین عارضی یا جز وقتی مزدور ہیں۔ عالمی ترقیاتی بینک کی 1989ء کی رپورٹ کے مطابق 53 فیصد خواتین مزدور گھر پر بیٹھ کر کام کرتی ہیں۔ انہیں پیس ریٹ کے حساب سے اجرت ملتی ہے۔ اس طریقے سے عورتوں کو ایک دفعہ پھر گھر بٹھا دیا گیا ہے تاکہ روایتی سماجی رشتوں اور ڈھانچوں میں فرق نہ پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے سستی لیبر لے کر انہی عالمی معیشت کا وہ حصہ بنا دیا گیا ہے جو سب سے زیادہ غریب اور استحصال کا شکار ہے۔ اس طرح مزدوروں کو ایک دوسرے سے توڑ بھی دیا گیا کیونکہ یونین کا بننا مشکل ہوگیا ہے اور کام منتشر ہونے کے باعث مزدور بھی منتشر ہوگئے۔ اور ان میں یک جہتی کا احساس پیدا ہونے کے امکانات کم ہوگئے کیونکہ یہ ایک جگہ پر بیٹھ کر اکٹھے کام نہیں کرتے۔ مائکرو انٹر پرائز کے تصور کے ذریعے عورتوں کے کام کو بالکل غیر سیاسی نوعیت دے دی گئی ہے اور کام کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مزدوروں کو بھی علیحدہ اور ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا گیا ہے۔

فرحت پروین اور کرامت علی کا کہنا ہے کہ کراچی میں لسانی شناخت کے مسئلے کی

وجہ سے ٹریڈ یونین متحد نہ رہ سکیں بلکہ لسانی بنیادوں پر استوار ہونے لگیں۔ اس طرح محنت کش طبقہ ٹوٹا اور اس میں یک جہتی نہ رہ سکی۔ عورتوں کو بھی ایک دوسرے سے لسانی یا مذہبی اعتبار سے توڑا گیا تا کہ اتحاد کا عنصر کم ہو جائے۔ لسانی فسادات، صنفی تفریق و تقسیم کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پیداواری عمل کو صنفی بنیادوں پر توڑ دیا جاتا ہے اور اسے ''مردوں کے کام'' اور ''عورتوں کے کام'' کے شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح گھر میں جنم لینے والی تفریق کام کی دنیا میں از سرِ نو تشکیل پا جاتی ہے اور روایتی صنفی تعصبات نئے سرے سے تر و تازہ ہو جاتے ہیں بقول فرحت پروین اور کرامت علی:

> انتظامیہ عورتوں اور مردوں کے کام میں تفریق کرتی ہے اور فرض کر لیتی ہے جن کاموں میں سخت جسمانی مشقت درکار ہوتی ہے یا تکنیکی اور میکانکی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مردوں کے کام ہوتے ہیں۔ ایسے کام عورتوں کے لیے غیر موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ (12)

ان دونوں مصنفین کا کہنا ہے کہ عورتوں کی اجرت مردوں کی اجرت کا دو تہائی حصہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کارکنوں کو ملازمت کی تصدیق کا خط نہیں ملتا، زندگی کا بیمہ نہیں میسر ہوتا، طبی سہولیات نہیں ہوتیں، ہفتہ وار چھٹی بمع تنخواہ نہیں ملتی، اوور ٹائم کا ڈبل ریٹ نہیں ملتا، کام کی جگہ پر حفاظتی تدابیر نہیں ہوتیں۔ 17 فیصد کارکن کہتے ہیں کہ غسل خانے کی سہولت بھی نہیں ہوتی۔ بیشتر کارکنوں کو معلوم تک نہیں یہ سہولت لیبر قوانین کے تحت ان کا حق ہیں۔ لیکن یونین کے ارکان اور دیگر محنت کشوں کے حالات میں فرق سے ظاہر ہوتا ہے کہ منظّم ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ (13)

صنفی تفرق کا عمل مزدوروں کے منظّم ہونے کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انتظامیہ، مزدور اور یونین کے ارکان تمام محسوس کرتے ہیں کہ پردے کی وجہ سے عورتوں کا یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینا نامناسب ہے۔ اگرچہ بیشتر خواتین محلے داروں اور رشتے داروں کی نظروں سے بچنے کے لیے پردہ کر کے گھر سے نکلتی ہیں، لیکن فیکٹری میں پہنچ جانے کے بعد ان میں سے اکثر پردے کے بغیر کام کرتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے روایتی اقدار کو سرمایہ داری نظام اور اس کے کارندے محنت کشوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں تا کہ ان میں اتحاد اور یک جہتی نہ پنپنے پائیں۔

پاکستانی مزدور خواتین پر حمیرہ اختر کا مقالہ ''خواتین' اجرتی کام' کنٹرول اور مزاحمت''، بھی بہت تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔ (14) حمیرا اختر کا کہنا ہے کہ عورت کی اجرت اور اس کی مشقت پر ریاست' معاشرے' مالکان اور خاندان کا زبردست قبضہ ہوتا ہے۔عورتوں کے کام کی قدر و قیمت کم لگائی جاتی ہے اور انہیں ہر طرح سے عدم برابری کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں لچکدار محنت کش' اسمبلی لائن کا طریقہ اور کام کو مختلف حصوں میں توڑنا انتظامیہ کے ایسے حربے ہیں جن سے عورتوں اور ان کے کام پر انتظامیہ کا قبضہ بھی رہتا ہے اور مزاحمت کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے ہنر گھٹ جاتے ہیں کیونکہ ہر مزدور پورے پیداواری عمل کا ایک چھوٹا سا پرزہ بن جاتا ہے اور مصنوعات کا ایک معمولی سا حصہ بناتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق کا خود مالک نہیں رہتا' اسے اپنی تخلیقی قوتوں پر کنٹرول نہیں رہتا اور نہ ہی اس کا ان مصنوعات پر کوئی حق یا قبضہ ہوتا ہے جن کے بنانے میں اس نے حصہ لیا۔ اسمبلی لائن پر بار بار ایک ہی چھوٹا سا عمل دہرانے سے تخلیقی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔عورتوں پر مزید کنٹرول حاصل کرنے کے لیے انہیں ٹارگٹ دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے کام کا دن 10 یا 12 گھنٹے ہو جاتا ہے حالانکہ تنخواہ طے شدہ ہی ملتی ہے۔ نیز عورتوں کو کنٹرول کرنے کی غرض سے ان پر مردنگران یا سپروائزر رکھ دیے جاتے ہیں' ان سے بات کرنے' یا کوئی مطالبہ یا شکایت کرنے سے خواتین گھبراتی ہیں۔ کئی فیکٹریوں میں عورتوں کے شادی کرنے یا بچہ پیدا کرنے کے فیصلوں تک کو متاثر کیا جاتا ہے۔ (15)

حمیرہ اختر کا موقف ہے کہ جہاں ایک طرف انتظامیہ اور مالکان عورتوں کی مزدوری اور صلاحیتوں کو کنٹرول کرتے ہیں' وہاں دوسری طرف گھر والے بھی عورتوں کی مشقت پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں اور ان کی قابلیتوں کا استعمال کرتے ہیں ۔ کنبے کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور ان کی روز مرہ کی ضروریات جیسے کھانا پکانا اور کپڑے دھونا جیسی ضرویات کی تمام ذمہ داری عورتوں پر ڈال کر گھر کے مرد خود کو آزاد رکھتے ہیں اور عورت کے دوہرے کام کا دوہرا فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین کی جانب گھر والوں کا رویہ مخلصانہ' یا ہمدردانہ نہیں ہوتا بلکہ وہ گھر کے کاموں میں ہلکی سی کمی بھی برداشت نہیں کرتے اور ذرہ برابر لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ عورتوں پر مزید ذمہ داریاں عائد کرنے میں تو گھر والے لچکدار رہتے ہیں۔ مگر مردوں کی ذمہ داریوں میں رتی برابر اضافہ کرنے پر

آمادہ نہیں ہوتے۔ کام کرنے والی خواتین کو گھر کے کاموں میں گھر کی دوسری عورتوں سے تو مدد کی توقع ہوتی ہے اور وہ کرتی ہیں لیکن مرد حضرات اس کام کو اکثر مردانہ وقار کے برعکس سمجھتے ہیں۔عورتوں کی آمدنی کا کنٹرول بھی مردوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اورعورتوں کوخود مختاری سے فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہوتا کہ آمدنی خرچ کرنے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ خاندان عورت کی آمدنی سے استفادہ کرتا ہے' لیکن اس پر پردے کی پابندی کومزید سخت کر دیتا ہے۔جس وجہ سے وہ بطور مزدور اپنا حق لینے سے قاصر رہتی ہے۔ ریاست ان امور پر خاموش رہتی ہے یا پھر ایسی پالیسیاں مرتب کرتی ہے جو تمام مزدوروں خصوصا خواتین مزدوروں کے مفاد میں نہیں ہوتیں۔اس طرح نہ تو عورتوں کو اپنے حقوق کا علم ہوتا ہے' نہ لیبر قوانین کا اور نہ استحصالی عمل کا۔

حمیرہ اختر انکشاف کرتی ہیں کہ عام طور پر مینجمنٹ یا انتظامیہ یا سپروائزر کے عہدوں پر عورتوں کو فائز نہیں کیا جاتا۔ 93 فیصد انتظامیہ عورتوں کو پیشہ وارانہ یا اعلی درجے کے عہدوں کے لائق نہیں تصور کرتی۔ جہاں زیادہ تعداد خواتین مزدوروں کی ہوتی ہے وہاں بھی نگران یا مینجر ہمیشہ مرد ہوتا ہے۔ جہاں کام کرنے کی بات آتی ہے وہاں انتظامیہ سے منسلک اکثر افراد کا کہنا ہے کہ عورتیں بہتر کام کرتی ہیں' زیادہ تابعدار' زیادہ لچکدار ہوتی ہیں۔ اور قدرے کم اجرت پر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ انتظامیہ کے 69 فیصد افراد کا کہنا ہے کہ عورتیں کام سے غیر حاضر بہت کم رہتی ہیں اور 62 فیصد کہتے ہیں کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں کم چھٹی کرتی ہیں۔75 فیصد انتظامیہ کا خیال ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ وقت پر کام پر آتی ہیں اور نوکری چھوڑنے کی شرح بھی مردوں سے کم ہے۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کا کہنا ہے کہ خواتین مزدور زیادہ تعاون' قوت برداشت اور زیادہ لچک کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی پیداواری صلاحیت اور پھرتی مردوں سے زیادہ یا ان کے برابر ہوتی ہے۔ (16) صرف اور صرف ایک ہنر انتظامیہ کے افراد کو عورتوں میں کم نظر آیا اور وہ تھی نگرانی کی قابلیت۔

حمیرہ اختر کے مطالعے اور تجزیئے سے جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ ہے انتظامیہ کا ''اچھے مزدور'' کا تصور۔ ایک ایسا مزدور اچھا ہوتا ہے جو فرمانبردار ہو' تابعدار ہو' اس میں پھرتی ہو' قابلیت ہو' وقت پر آتا ہو' چھٹیاں نہ لیتا ہو' اور سہولیات کے مطالبات

نہ کرے۔ یعنی اپنے کسی حق سے وہ واقف نہ ہو اور نہ اس کے لیے لڑے۔ عورتوں کو ان کے حقوق سے ناواقف رکھ کر ان کا استحصال زیادہ بہتر طریقے سے کیا جاسکتا ہے۔

حمیرہ اختر کے مطابق جو باتیں انتظامیہ کوعوتوں کے بارے میں ناپسند ہیں ان میں دیر تک کام کرنے پر غیر آمادگی' ذرائع آمدورفت کا مطالبہ، شادی کے بعد کام چھوڑ دینا، گھریلو کشیدگی کا کام پر اثر ہونا اور ڈانٹ پڑنے پر رو پڑنا شامل ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو پدرسری اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کو استعمال کر کے عوتوں پر پابندیاں لگاتی ہے۔ جو صنفی باتیں عورتوں کے بارے میں کہی گئیں وہ عورتوں کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر مبنی نہیں بلکہ پدرشاہی کی پیداوار ہیں۔ عورتیں اگر دیر تک کام نہیں کرسکتیں تو اس کی دو وجوہات ہیں' ایک یہ کہ تمام تر گھریلو ذمہ داریاں انہیں سونپ دی جاتی ہیں۔ اور دوسری یہ کہ دیر سے گھر جانے میں مردوں ہی سے خطرہ ہوتا ہے کہ ہراساں نہ کریں یا جنسی تشدد نہ کریں اور گھر کے مرد یہ پسند نہیں کرتے کہ عورت دیر تک گھر سے باہر رہے۔ ذرائع آمدورفت کا مطالبہ بھی حفاظت سے متعلق ہے کیونکہ پبلک ٹرانسپورٹ میں بھی عورتوں کے ساتھ حیوانی اور جنسی ظلم ہوسکتا ہے۔ شادی کے بعد کام چھوڑ دینے پر بھی اکثر شوہر اصرار کرتا ہے اور گھریلو کشیدگی اکثر انہیں شوہروں اور گھر والوں سے ہوتی ہے جو عورت کی کمائی کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ جدید سرمایہ دارانہ پدرشاہی کا تقاضا ہے کہ عورت گھر سے نکل کر باہر کام کرے' قدیم پدرشاہی قدروں کا تقاضا ہے کہ اس کی عزت محفوظ رہے اور وہ شوہر کی بات مانے۔ قدیم اور جدید پدرانہ قدروں کی اس کشمکش کا بوجھ بھی عورت مزدور پر پڑتا نظر آرہا ہے۔

مردوں کے بارے میں انتظامیہ کے تاثرات کا جائزہ لیا جائے تو ایک دلچسپ موزانہ کیا جاسکتا ہے۔ انتظامیہ کے بقول مرد کہنا نہیں مانتے' باغی ہوتے ہیں اور بہت جلد جارحیت اور تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اسکے علاوہ کام سے اکثر غیر حاضر رہنا' پھرتی نہ دکھانا اور وقت ضائع کرنا ان کی صفات ہوتی ہیں۔ یہاں پر اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ مردوں کا طرز مزاحمت جارحانہ' کھلا' باغی اور پرتشدد ہوتا ہے۔ عورتوں کا احتجاج اور انداز میں اجاگر ہوتا ہے۔

عورتوں پر کنٹرول حاصل کرنے کی غرض سے ایک اور حربہ جس کا ذکر حمیرہ اختر

MashalBooks.org

کرتی ہیں یہ ہے کہ خواتین کی دوسری رشتہ دار خواتین کو بھی نوکری دے دی جاتی ہے۔ یہ خواتین ایک دوسرے پر کنٹرول کا ذریعہ بن جاتی ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر ایک عورت کی نوکری گئی تو دوسری رشتہ دار خواتین، مثلاً ماں، خالہ، بیٹی وغیرہ کو بھی نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔ گارمنٹس، بجلی کے پرزے، ماہی گیری اور دواؤں کی فیکٹریوں میں یہ حربہ اکثر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خوفزدہ، دبی ہوئی لیبر فورس تیار ہو جاتی ہے۔ حمیرہ اختر کے مطابق 49 فیصد انتظامیہ کے افراد نے کہا کہ وہ عورتوں کو گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے نوکری نہیں دیتے یا پھر ان ذمہ داریوں کی بنا پر کم تنخواہ اور کم سہولیات کا معاہدہ طے کر لیتے ہیں۔ نوکری کے دوران اکثر خواتین شادی نہیں کر سکتیں اور ان کی ترقی کے مواقع بھی اسی وجہ سے محدود کر دیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر انتظامیہ کے خیال میں شادی اور بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داریاں عورتوں میں اس لچک کو ختم کر دیتی ہیں جو اوور ٹائم اور دوسری پیداواری ضروریات کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ 43 فیصد فیکٹریوں میں کمسن بچوں کی ماؤں کو ملازمت میں ترقی کو ملازمت میں ترقی بطور پالیسی نہیں دی جاتی۔[17]

حمیرہ اختر کا تجزیہ ہے کہ کام کا عمل بذات خود ایسا ہوتا ہے کہ وہ کنٹرول کا باعث بن جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر باہر سے کنٹرول ضروری نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر پہلے پورے کام کو چھوٹے حصوں میں توڑا جاتا ہے، ہر حصہ کسی مختلف عمارت یا جگہ پر بنتا ہے، ہر مزدور کسی ایک چھوٹے چھوٹے پرزے پر کام کرتا ہے، ہر کام کو مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک مزدور پورے کام کا صرف ایک بہت معمولی اور چھوٹا سا حصہ کرتا ہے جس کے لیے نہ تو کوئی خاص ہنر یا تجربہ درکار ہوتا ہے اور نہ خاص قسم کی قابلیت۔ عموماً کسی ایک ہی حرکت کو مسلسل دہرانا ہوتا ہے۔ اس طرح مزدور نہ تو ہنر مند رہتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ کنٹرول خود بخود مزدور پر ہو جاتا ہے۔ ٹارگٹ طے کرنے سے مزدور کی تمام تر توجہ اس دن کا ٹارگٹ پورا کرنے پر ہوتی ہے۔ نتیجتاً نہ وہ کسی سے بات کر سکتی ہے اور نہ مزدوروں میں باہمی مسائل کا تبادلہ ہوتا ہے اور نہ کوئی احساس یک جہتی پیدا ہوتا ہے۔ مسلسل ایک ہی حرکت سینکڑوں مرتبہ دوہرانے سے ایک شخص سوچنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کے احساسات اور جذبات بھی دب جاتے ہیں۔ اس کے اندر کا شخص مرنے لگتا ہے اور مزاحمت کا امکان بہت

کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کام کے عمل کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے اور ہر شخص کو صرف ایک معمولی سی حرکت دوہرانے پر مجبور کر کے انتظامیہ اور جدید سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار نہ صرف مزدور کی اندرونی مزاحمت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مزدوروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور ان میں اتحاد کے مواقع ختم کر دیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں نہ صرف ایک ہی چیز کسی فیکٹری کے مختلف حصوں میں بنتی ہے بلکہ ایک پرزہ تائیوان میں بنتا ہے تو دوسرا جنوبی کوریا میں' ایک حصہ تھائی لینڈ میں بنتا ہے تو دوسرا انڈونیشیا میں۔ اس طرح مزدورں کو اکٹھے ہونے کا قطعی موقع نہیں ملتا۔

ایسے عوامل سے مزدور کو اپنے کام پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ کام کے بارے میں تمام فیصلے اور منصوبہ بندی کہیں اور ہوتی ہے اور اس کا اطلاق اور اسے پورا کرنا مزدور کا کام ہوتا ہے۔ مزدور کو کام کی منصوبہ بندی پر کوئی اختیار نہیں ہوتا اور جو کام کے اہم فیصلے کرتے ہیں وہ اس کا اطلاق نہیں کرتے۔ اسمبلی لائن کے اندر کنٹرول کے عناصر ہوتے ہیں جو اس کا اہم جزو ہوتے ہیں اور یہ کارکن سے مطلق طور پر آزاد ہوتی ہے۔ اس کا کنٹرول ورکر سے بہت دور کہیں اور ہوتا ہے اور ورکر اس کو اپنے انفرادی کام کے مطابق تبدیل نہیں کرسکتا یا سکتی۔ اس میں مزدور کی انفرادیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس قسم کا کام مکمل طور پر مزدور پر غالب ہوتا ہے کیونکہ مزدور کو اس کام کی شرح اور بہاؤ پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ جس رفتار سے آئے' مزدور کو خود کو ڈھالنا ہوتا ہے' وہ اسمبلی لائن کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ مزدور کے ہنر کی وسعت کم ہو جاتی ہے اور وہ صرف ایک چھوٹے سے کام کے قابل رہ جاتا ہے مثلاً دواؤں کی شیشی پر لیبل لگانا' کوئی ایک پیچ کسنا وغیرہ۔ اس کے ہنر کمتر درجے کے ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی غیر تجربہ کار مزدور اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ اس طرح مزدور خود کو ہنر مند اور قبل شخص تصور نہیں کرسکتا۔ عورتوں کو خاص طور پر ایسے کام دیئے جاتے ہیں' جن میں کسی خاص ہنر کا عمل دخل نہ ہو اور ہو گھریلو کاموں سے مشابہت رکھتے ہوں۔ عورتیں خواہ ہنر مند خانے میں ہوں یا غیر ہنر مدن خانے میں' ان کی تنخواہ ہنر مند اور غیر ہنر مند خانوں والے مرد مزدوروں سے کم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کو بطور عارضی' جز وقتی اور معاہدہ والی کار کن کے طور پر رکھ کر انہیں ان تمام سہولیات سے محروم رکھا جاتا ہے جو مزدورں کا حق ہیں۔ روزانہ ٹارگٹ کے علاوہ عورتوں سے جبری اوور ٹائم بھی لیا جاتا ہے کیونکہ ان کا انحصار ذرائع

آمدورفت پر ہوتا ہے جو کہ فیکٹری مالکان کے کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ جب تک بس یا ویگن نہ چلے عورتوں کو مسلسل کام کرنا پڑتا ہے۔

کئی مرتبہ نوجوان غیر شادی شدہ خواتین کو ان کے اپنے کام سے ہٹ کر دوسرا کام بھی دے دیا جاتا ہے۔ چند فیکٹریوں میں ایسے اضافی کام کی اجرت ملتی ہے مگر کئی جگہ اس کام کی کوئی اضافی اجرت نہیں ہوتی۔ نیز عورتوں پر مرد سپروائزر لگانے کا مطلب عموماً یہی ہوتا ہے کہ عورتیں زیادہ آسانی سے دباؤ میں آجاتی ہیں۔ مزدوروں کو روایتی اقدار کے استعمال سے بھی ایک دوسرے سے دور رکھا جاتا ہے' مثلاً نوجوان خواتین مزدوروں سے کہا جاتا ہے کہ مرد مزدوروں سے زیادہ رابطہ رکھنا ان کی عزت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ مزدوروں میں کام پر مبنی تعلقات بھی پیدا نہیں ہو پاتے۔ اس تقسیم کو گھر والے بھی اہمیت دیتے ہیں۔ نتیجتاً مرد اور خواتین مزدور ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہیں۔ یونین بنانے کے راستے میں معاشرتی اقدار حائل ہو جاتی ہیں جن کا سرمایہ داری نظام کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ حمیرہ اختر کا کہنا ہے کہ 1934ء کے فیکٹری ایکٹ کے تحت جو کینٹین' غسل خانے اور سماجی تحفظ کی سہولیات قانونی طور پر لازمی ہیں' وہ نہیں دی جاتیں کیونکہ جہاں 250 ورکر ہوں اور کنٹین بنانا لازمی ہو وہاں کھاتوں میں مزدوروں کی تعداد کم بتا دی جاتی ہے۔ اس طرح قانونی حقوق سے ورکرز کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح 1934ء کے فیکٹری ایکٹ کی دیگر شقیں جو کام کی جگہ پر حفاظت' طبی سہولیات اور بمع تنخواہ چھٹی سے متعلق ہیں' پوری نہیں کی جاتیں۔ زچگی کی چھٹی کے بارے میں انتظامیہ کے رویے منفی ہیں اور 52 فیصد انتظامیہ کی رائے ہے کہ حمل کے دوران عورتوں کی پیداواری صلاحیت گر جاتی ہے۔ کارکنوں کے سماجی تحفظ کا آرڈی نینس جو کہ 1965ء میں رائج ہوا' زچگی کی چھٹیوں کو تسلیم کرتا ہے' صرف 41 فیصد انتظامی نے کہا کہ ان کے ہاں زچگی کی چھٹی دی جاتی ہے۔ اگرچہ 50 سے زائد خواتین ورکرز والی فیکٹریوں میں بچوں کے لیے کریش ضروری ہے' لیکن یہ قانون' جو کہ فیکٹریوں میں حصہ ہے' بھی توڑا جاتا ہے۔ (18)

ملازمت پیشہ خواتین کے گھر کے افراد عموماً ان کے کام کی مشکلات کے بارے میں ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتے۔ کام کی جگہ پر مزاحمت اس لیے کمزور پڑ جاتی ہے کہ گھر میں بھی خاندان والے عورت کی مشقت اور آمدنی پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ عورت کی مزاحمتی

صلاحیتوں کو سلب کر دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں حمیرہ اختر لکھتی ہیں کہ:

> یہ کنٹرول عورتوں پر مسلط کی گئی اس وراثت سے آتا ہے کہ عورت کی جگہ گھر پر ہے۔ اس کی گھریلو ذمہ داریاں اس کی ملازمت کی ذمہ داریوں پر فوقیت رکھتی ہیں.......یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ملازمت پیشہ خواتین کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملازمت اور گھریلو کام دونوں کو خوش اسلوبی سے نبھائیں۔

ملازمت کی دنیا میں قدم رکھنے کی بنا پر عورتیں گھریلو بوجھ سے آزاد نہیں ہوسکیں۔ بلکہ ان پر دوہرے بوجھ کی لعنت مسلط ہو گئی ہے۔ عورتیں تبدیل ہوئیں اور انہوں نے ملازمت کی منڈی کا رخ کیا تاکہ کنبے کی کفالت ہو سکے' مگر مرد تبدیل نہ ہو سکے اور موجودہ دور کی ضروریات کے تحت خود کو گھریلو کام میں شامل کرنے سے قاصر رہے۔اس سے ملازمت پیشہ خواتین کے لیے بوجھ دگنا ہو گیا اور گھروں میں کشیدگی رہنے لگی۔ ان حقیقتوں کی تہہ میں وہی مردانگی اور مردانگی کے تصورات میں گھریلو کام اور بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال پوری طرح سما نہیں پائے ہیں۔ قدریں پرانی ہیں اور حالات نئے۔ مرد پرانی قدروں کی پیروی میں نئے حالات قبول کر پائے نہ ان سے سمجھوتہ کر پائے اور نہ پرانی اقدار میں مثبت اور واضح تبدیلیاں کر سکے۔ گھریلو ذمہ داریوں کا کمر توڑ بوجھ عورتوں کو کام کی جگہ' کام سے بھی بیگانہ کرتا ہے اور گھروالوں سے بھی۔ کیونکہ انہیں آرام وتفریح کے مواقع نہیں ملتے' وہ نہ تو کام میں کوئی تسکین محسوس کرتی ہیں نہ گھریلو کاموں میں اوسر اکثر دونوں سے متنفر ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی یونین کی سرگرمیوں اور سیاسی شمولیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے پاس فراغت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ عورتوں کے روایتی کردار کو اہمیت دینے سے سرمایہ دارانہ نظام کو یہ فوائد ہوتے ہیں کہ عورتیں اس نظام کے استحصالی پہلوؤں پر تنقید کرنے سے قاصر رہتی ہیں' سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں سے دور رہتی ہیں اور غیر سیاسی ہو جاتی ہیں۔ اس طرح نہ وہ یونین کی رکن بن سکتی ہیں اور نہ کوئی دوسرا سیاسی کام کر سکتی ہیں۔ ان کی تمام تر توانائی ملازمت اور گھریلو ذمہ داریوں میں صرف ہو جاتی ہے لہٰذا وہ نظام کے خلاف اٹھنے کے قابل نہیں رہتیں۔

خواتین ملازمت اختیار کر بھی لیتی ہیں' تب بھی انہیں کارکن تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ

مردوں پر انحصار کرنے والی ہی تصور کیا جاتا ہے اور مردوں کو ہی کفالت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور کام کی جگہ پر منتقل ہو جاتا ہے اور مالکان بھی عورتوں کو کارکن نہیں تسلیم کرتے۔ دونوں' خاندان اور مالکان عورتوں کے کام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو عورتیں تاحیات والدین کے گھر رہتی ہیں' اکثر پوری کفالت کی ذمہ دار ہوجاتی ہیں۔ خاندان اور انتظامیہ دونوں کا عورتوں کے کام کے استحصال میں اشتراک نظر آتا ہے۔ کیونکہ کام کرنے والی عورت کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' تو نتیجتاً وہ یونین کی سرگرمیوں اور تمام ایسی سرگرمیوں سے اجتناب کرتی ہے۔ جن سے اس کی نسوانیت پر حرف آئے۔ اس طرح انتظامیہ کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور خاندان والوں کا بھی مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملازمت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے کیونکہ انہیں اس کی آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جن گھروں میں صرف ایک عورت ملازمت پیشہ ہو اور باقی کام کرنے والے مرد ہوں' وہاں عورت کو کفالت کرنے والوں میں شامل نہیں کیا جاتا اور محض اضافی آمدنی کا ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گھر کے مردوں کی مدد کر رہی ہے لیکن اسے کمانے والے کی مراعات' رتبہ اور حیثیت نہیں دی جاتی۔ ایسی عورتیں نہ صرف آمدنی لاتی ہیں بلکہ خدمات کی شکل میں بھی کنبے کو سنبھالتی ہیں لیکن ان کے کام کی اہمیت کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔

عورتوں کی آمدنی گھروں کی آمدنی کا 44 فیصد حصہ ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آمدنی کی اہمیت ثانوی نہیں بلکہ مرکزی ہے۔ لیکن انہیں مددگار ہی تصور کیا جاتا ہے اور وہ عزت و احترام نہیں دیا جاتا جو گھر کے کمانے والے مردوں کو حاصل ہوتا ہے۔ کئی دفعہ تو عورتوں کی آمدنی کنبے کے لیے اس قدر اہم ہوتی ہے کہ عوت کی زندگی پر اس کا بہت منفی اثر پڑتا ہے اور ہو نہ تو اپنی زندگی کے فیصلے خود کر پاتی ہے اور نہ شادی کر سکتی ہے۔ 87 فیصد فیکٹری خواتین ملازمین نے معاشی بدحالی کے پیش نظر نوکری کی اس لیے یہ تاثر کہ عورتیں محض وقت گزاری کے لیے کام کرتی ہیں' غلط ہے۔

حمیرہ اختر کا کہنا ہے کہ عورتوں کا ملازمت اختیار کرنا پدر شاہی کے اداروں کو کمزور کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ملازمت اور کام کی اس طرح ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے کہ پدر شاہی نظام کو مزید تقویت ملتی ہے۔[20] جہاں مردوں کو فائدہ ہوتا

ہے لیکن ان کی گھریلو ذمہ داریوں میں کوئی مدد نہیں کی جاتی۔ جن عورتوں کی ملازمت سے متعلق سرگرمیوں کو گھر والوں سے حمایت و ہمدردی نہیں ملتی' وہ کام کی جگہ اور بھی زیادہ ڈری ہوئی' تابعدار اور فرمانبردار ہوتی ہیں کیونکہ کام کی جگہ کے مسائل کے بارے میں گھر والے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے۔ ایسی عورتیں کام کی جگہ پر حقوق حاصل کرنے سے متعلق سرگرمیوں سے گریز کرتی ہیں۔

یہ روایتی سوچ کہ گھریلو کام بنیادی طور پر عورتوں کا کام ہے انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ دوہرے بوجھ کو قابل حقیقت کے طور پر منظور کرلیں اور اس کے خلاف مزاحمت نہ کریں۔ تقریباً 75 فیصد گھروں میں مرد گھریلو کاموں میں مدد کرتے۔ اگر چند آدمی کرتے ہیں تو وہ کبھی کبھی اور وہ بھی ہلکے کام میں۔ 60 فیصد عورتیں کہتی ہیں کہ کام کرنے کی وجہ سے ان کے گھریلو رشتوں اور طاقت کے رشتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ گھریلو رشتوں کے بارے میں سوچ اس قدر مضبوط ہے کہ اسے کام کرنے کا عمل توڑ نہیں سکا اور ثقافتی و تہذیبی اقدار میں کوئی فرق نہیں آیا انہی اقدار کے مطابق عورت کی حیثیت تابع مہمل کی ہے اور وہ ''پاؤں کی جوتی'' تصور کی جاتی ہے۔ بلکہ عورتوں کے مجبوراً کام کی منڈی میں داخل ہونے کے خلاف ردعمل یہ ہوا کہ گھریلو پدرسری' جو اس کام کو حقارت اور رقابت کی نظروں سے دیکھتی ہے' مزید مستحکم ہوگئی ہے اور کئی دفعہ عورتوں پر تشدد مزید بڑھ جاتا ہے۔ اسے اپنی ہی آمدنی پر کوئی اختیار نہیں ہوتا اور اگر شوہر کے ہاتھوں میں آمدنی نہ تھمائے تو لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد ہوتا ہے۔ یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ اس کے کام کے گھر پر منفی اثرات نہ ہوں اور کام اسی پھرتی سے چلنا چاہئے جیسے کہ پہلے چلتا تھا۔ کام کرنے کی وجہ سے عورتوں پر جذباتی دباؤ مزید بڑھ جاتا ہے' اگرچہ بچے بیمار ہوں تو عورتوں کو گھر پر رہ کر انہیں سنبھالنا ہوتا ہے کیونکہ مرد اس کام میں بھی پیچھے رہتے ہیں۔ جہاں مرد اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں مثلاً سگریٹ یا بوتل وغیرہ' عورتوں کی آمدنی کا تقریبا سارا حصہ گھریلو اخرجات میں لگتا ہے اور وہ ذاتی ضروریات کے لیے اجازت کے بغیر خرچ نہیں کرسکتیں۔ 71 فیصد عورتوں میں ذاتی اخراجات کا تصور ہی نہیں پایا گیا۔ آمدنی کا تمام حصہ والدین' بہن بھائیوں' شوہر' بڑے بوڑھوں اور بچوں پر خرچ کرنے کی وجہ سے عورتیں کچھ بھی بچا نہیں پاتیں اور ان کی بچت کچھ نہیں ہوتی۔

بچت نہ ہونے کی وجہ سے عورتیں خود مختار اور آزاد نہیں ہو پاتیں۔

خاندان والوں کا نظریہ یہ ہے کہ گھریلو کام صحیح معنوں میں کام نہیں اور اس میں ایک شخص کی زیادہ توانائی خرچ نہیں ہوتی۔ اس طرح اس کام کو کمتر اور ادنی بنا کر اس کا بھرپور استحصال بھی کیا جاتا ہے اور عورت کی حیثیت بھی گرائی جاتی ہے۔ مرد چونکہ گھریلو کاموں میں شمولیت کم کرتے ہیں ان کی کام کی جگہ پر توانائی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ کام کرنے کے بعد انہیں آرام وسکون مل جاتا ہے۔عورتوں کو یہ آرام وسکون نہیں ملتا چنانچہ کام پر ان کے پاس توانائی کم رہ جاتی ہے۔اس طرح یہ تصور مزید تقویت پاتا ہے کہ عورتوں میں مردوں جتنی توانائی نہیں ہوتی اور یہ ان جتنا کام نہیں کرسکتیں لہٰذا انہیں کم اجرت دی جائے۔

حمیرہ اختر کے مطابق پردہ عورتوں پر ثقافتی پابندیوں اور کنٹرول کا سب سے بڑا اور مؤثر ہتھیار ہے۔ اس کا تعلق مردانہ غیرت اور عورت کی پاکیزگی سے بنادیا گیا ہے۔ مردانہ غیرت کا تقاضا ہے کہ عورت کی پاکیزگی برقرار رکھی جائے۔ پردہ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے دور اور علیحدہ رکھنے میں بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اس طریقے سے گھر کے مرد عورت پر نہ صرف اپنا قابو رکھتے ہیں بلکہ فیکٹریوں میں بھی یہ عورتوں پر کنٹرول کا ایک مؤثر طریقہ ثابت ہوتا ہے۔ ایک تو عورتیں عموما اسی جگہ کام کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں جس میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو۔ اس طرح ان کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں۔ فیکٹریوں کے مالکان اس روایتی پابندی کا بہت فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ پردے کے نام پر وہ عورتوں کو مردوں اور خاص طور پر یونین کے مردوں سے علیحدہ رکھتے ہیں۔اس طرح عورتیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے قاصر رہتی ہیں۔ مزید یہ کہ کارکنوں میں باہمی اتحاد نہیں ہو پاتا۔ (21) اس طرح مزدوروں کے ایک دوسرے سے رابطے توڑ دیئے جاتے ہیں۔

20 تا 26 اگست 1998 کے ''مزدور جدوجہد'' کے ہفتہ وار شمارے میں فاروق ندیم قالین بننے والی محنت کش مزدور خواتین کی حالت زار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے قالین بنانے والی خواتین' مزدور اور بچے نہایت گھٹیا معیار زندگی حاصل کر پاتے ہیں کیونکہ تمام آمدنی کا بہت بڑا حصہ مڈل مین لے جاتا ہے۔ یہ خواتین غذا کی کمی کا شکار رہتی ہیں اور مہلک طبی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔دوران حمل انہیں سات سے آٹھ ماہ تک مسلسل کھڈی پر کام کرنا پڑتا ہے ۔ دس سے بارہ گھنٹے مسلسل بیٹھنے سے حاملہ عورتوں کے

بچوں کی ساخت متاثر ہوتی ہے۔ مڈل مین ان عورتوں کو ذہنی اور جسمانی اذیت کا نشانہ بناتے ہیں ۔ یہ بڑے سوچے سمجھے انداز میں ان کی کردارکشی بھی کی جاتی ہے۔اس طرح ان پر ہردم تسلط قائم رہتا ہے۔ان عورتوں کو نہ تو کوئی بنیادی حقوق دیئے جاتے ہیں اور نہ قانونی تحفظ۔ ان کی رہائشی بستیاں بے حد بوسیدہ اور تنگ تاریک ہوتی ہیں۔ ان کے سر پر چوبیس گھنٹے عدم تحفظ اور بے یقینی کی تلوار لٹکی رہتی ہے۔ انہیں کوئی بھی ایسی سہولت میسر نہیں جو لیبر قوانین کے تحت مزدوروں کو قانونی طور پر ملنی چاہیے۔حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے یہ بہت سی ایسی بیماریوں کا شکار ہوجاتی ہیں جو اس صنعت میں کام کرنے سے ہوتی ہیں ۔مثلاً ٹی بی وغیرہ۔

مذکورہ بالا تمام مطالعوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستانی مزدور خواتین بے شمار مسائل کا شکار ہیں اور کم اجرت سے لے کر صحت تک، جنسی ہراسانی سے لے کر کنٹریکٹ کے کام تک ان کے مسائل کی فہرست بہت طویل ہے۔لیکن ان لاتعداد مسائل کے باوجود کئی مرتبہ ان خواتین نے مثالی ہمت وحوصلے کا ثبوت دیا اور اپنے حالات کا ڈٹ مقابلہ کیا۔ یہ حق بجانب نہ ہوگا کہ ہم ان کے تمام مسائل پر اور ان پر ہونے والے ظلم وستم پر تو تفصیلی بحث کریں لیکن ان کی مزاحمت کی داد نہ دیں، ان کی جدوجہد اور طاقت کی نفی کر دیں۔ اس کتاب میں ہمارا بنیادی مفروضہ یہی ہے کہ عورت صنف نازک یا کمزور ہستی ہی نہیں بلکہ اس کے اندر مزاحمتی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور اس نے اس بات کا ثبوت بارہا دیا ہے۔ ہم چونکہ عورت کے عکس سے ہٹ کر بات کرنا چاہ رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ یہاں ان کی جدوجہد کی چند نمایاں مثالیں دی جائیں جو دوران مطالعہ اور بالمشافہ گفتگو میں سامنے آئیں۔

مزدور خواتین اور مزاحمت

کراچی میں پائلر کے ایک ورکشاپ کے دوران مزدور خواتین نے مصنف کو اپنی مزاحمت کے بارے میں بہت دلچسپ اور معلوماتی باتیں بتائیں۔ ان مزدور خواتین کا تعلق زیادہ تر دوائیں بنانے والی اور پیکنگ فیکٹریوں سے تھا۔ ان کی عمر 18 سے 30 برس تک تھی۔ جو بات واضح طور پر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ان کی مزاحمت کا انداز اکثر انتظامیہ کے

کنٹرول کے انداز سے ہم آہنگ تھا اور اس کے مطابق ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر انتظامیہ کے کنٹرول کا انداز جسمانی حرکات وسکنات تھا تو مزاحمتی انداز انہی حرکات پر مشتمل تھا' اگر کنٹرول آواز اور شور پر تھا تو مزاحمت کا انداز یہ تھا کہ شور کر کے انتظامیہ کو مذاکرات پر مجبور کیا جائے۔ انتظامیہ کے مقاصد تھے کہ شرح استحصال بڑھائی جائے یعنی کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام حاصل کیا جائے' یونین کی طاقت کو توڑا جائے' کام کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے علیحدہ جگہ پر کروایا جائے تا کہ کارکنوں میں یکجہتی کا احساس نہ بڑھے اور کارکنوں کو ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے توڑا جائے۔

خواتین مزدوروں کا مزاحمتی انداز ہو بہو انتظامیہ کے کنٹرول کے انداز جیسا ہوتا تھا۔ اس طرح کئی مرتبہ مزدوروں نے انتظامیہ سے اپنے مطالبات منوائے۔ انتظامیہ کے طاقت کے حربوں میں جو عوامل شامل تھے ان میں وقت پر کنٹرول' جگہ پر کنٹرول' کارکنوں کے جسم اور حرکات پر کنٹرول' آواز اور شور پر کنٹرول اور اخلاقی نظریات نمایاں تھے۔ مزدوروں نے کنٹرول کے یہی طریقے اپنا کر انہیں انتظامیہ کے خلاف مزاحمت کے لیے استعمال کیا۔

وقت یا رفتار پر کنٹرول کی ایک دلچسپ مثال دوائیں بنانے والی فیکٹری سے ملی۔ اس فیکٹری کی انتظامیہ نے کم وقت میں زیادہ کام حاصل کرنے کی غرض سے اسمبلی لائن کی بیلٹ کی رفتار تیز کر دی۔ اس بیلٹ پر شیشیاں ہوتی تھیں۔ جن پر کارکنوں کو لیبل لگانے ہوتے تھے۔ لیکن بیلٹ کی نئی رفتار مزدوروں کے لیے بہت زیادہ تھی۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو انتظامیہ سے جواب ملا کہ جلد ہی انہیں نئی رفتار کی عادت پڑ جائے گی۔ لیکن مزدور خواتین نے کہا کہ'' ہم انسان ہیں' مشین کا پرزہ تو نہیں کہ اس کی رفتار چل سکیں۔'' جب انتظامیہ نے ان کے احتجاج کو مسترد کر دیا تو مزدور خواتین نے یہ طریقہ نکالا کہ دواؤں کی شیشیوں کو بیلٹ سے اتار لیا اور آرام سے اپنی رفتار پر لیبل لگانا شروع کر دیئے۔ جب بیلٹ گھوم کر واپس آتی تو شیشیوں کو واپس رکھ کر دوسری شیشیاں اتار لیتی تھیں۔ اس طرح انہوں نے کام کی رفتار کو اپنی آسانی کے مطابق ڈھال لیا اور خود کو مشین کا پرزہ بننے سے بچالیا۔ اس طرح ان کی شرح استحصال میں اضافہ نہیں ہوا۔ یہ عمل مزدور خواتین نے خود' بغیر کسی رہنما یا لیڈر کے' کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان کے اندر فطری طور پر مزاحمت

MashalBooks.org

کا مادہ ہوتا ہے جو بوقت ضرورت خود بخود نکل آتا ہے۔ اس طرح یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ احتجاج کرنے کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں جو ضروری نہیں صرف جلوس اور جلسوں کی صورت میں نمایاں ہوں۔ کئی دفعہ فیکٹری کے اندر ہی کام کی جگہ پر احتجاج کا موقع مل جاتا ہے جو بظاہر کھلا احتجاج نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ اور کام کے عمل سے جڑا ہوتا ہے۔ انتظامیہ نے وقت کا استعمال اور طریقوں سے بھی کیا مثال کے طور پر کام کے اوقات کی سختی پابندی' کھانے یا چائے کے وقفوں پر کڑی سختی اور پابندی اور کارکنوں کے غسلخانے جانے پر وقت کی سختی سے پابندی کہ ایک منٹ سے زیادہ غسلخانے میں نہ لگائیں یا ایک سے دوسری مشین تک جانے پر زیادہ وقت نہ لگائیں یا کیفے ٹیریا میں بہت دیر نہ لگائیں۔ لیکن کئی خواتین ورکرز نے بتایا کہ انتظامیہ سے نالاں یا ناراض ہو کر وہ جان بوجھ کر غسلخانے میں یا کیفے ٹیریا میں یا ایک سے دوسری مشین تک جانے میں زیادہ وقت صرف کرتی تھیں۔ اس طرح انہیں دو گھڑی آرام بھی مل جاتا اور تھکن بھی کچھ کم ہو جاتی۔ جب انتظامیہ سوال کرتی کہ غسلخانے میں اتنی دیر کیوں لگائی تو وہ طرح طرح کے بہانے بنا دیتی تھیں۔

جب کام کے عمل پر اپنا قابو نہیں ہوتا اور مصنوعات اور منافع بھی اپنا نہیں ہوتا' تو اس کام میں دلچسپی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ ایک ہی حرکت کو مسلسل دہرانا پڑے اپنے وجود کا احساس کم ہو جاتا ہے اور انسان خود کو مشین کا پرزہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ پوری دنیا میں ورکرز شعوری یا لاشعوری طور پر ایسے کام کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ کئی دفعہ تو انہیں خود احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی عمل یا عادت دراصل مزاحمت کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر مزدور کام پر دیر سے آتے ہیں۔اور مختلف قسم کے بہانے بنا کر سزا سے بچ جاتے ہیں۔ گھر وقت سے پہلے چلے جاتے ہیں' کام سے غیر حاضر اکثر رہتے ہیں یا پھر اگر یہ سب کچھ ان کے بس میں نہ ہو تو کام کے عمل کی رفتار کو کم کر دیتے ہیں۔ جس سے مالکان کا منافع کم ہو جاتا ہے کیونکہ پیداواری اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں مزدوروں کی اس ''خاموش مزاحمت'' کو ''ورک ایتھک''، یعنی کام کی اخلاقیات پر وعظ دے کر کم کیا جاتا ہے تاکہ ہر مزدور کام کرنے کو ایک مذہبی یا قومی فریضہ سمجھ لے اور ایک ''اچھا مزدور'' ہونا اس حد تک اس کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن جائے کہ اس پر بیرونی دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ خود کو اندر سے ہی اتنا کنٹرول کر

MashalBooks.org

لے کہ کسی دوسرے کے کچھ کہنے کی ضرورت نہ محسوس ہو۔ چنانچہ تعلیم اور ذرائع ابلاغ وغیرہ سے ایک اچھے مزدور کی تشکیل ہر وقت ہوتی رہتی ہے اس بات میں مذہبی رہنما بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیات دان بھی ایک ''اچھے'' یعنی فرمانبردار اور تندہی سے کام کرنے والے مزور کی تعمیر میں سائکوتھراپی کے ذریعے بہت مدد دیتے ہیں۔ پاکستان میں چونکہ ابھی انسان کی ساخت کرنے والی معاشرتی سائنس نے اتنی زادہ ترقی نہیں کی اس لیے مالکان اور انتظامیہ کو واضح کنٹرول کے انداز اپنانے پڑتے ہیں ۔لیکن مغربی مما لک میں جہاں انسانی کنٹرول کی سائنس ہر بزنس مینجمنٹ کے کالج میں سکھائی جاتی ہے' کنٹرول کرنے کے نایدہ طریقے ایجاد ہوگئے ہیں کہ لگتا ہے جیسے کارکن خود اپنا کنٹرول کر رہا ہے۔ اس طرح کنٹرول کسی قدر روپوش ہوگیا ہے اور کام کے عمل کا اندرونی حصہ بن گیا ہے۔ تاہم کسی حد تک اب بھی کنٹرول بونس کا لالچ ترقی کے اور تنخواہ میں اضافے کا لالچ دے کر کیا جاتا ہے۔ اس طرح کارکنوں میں آپس میں حسد کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے رقیب یا حریف بن جاتے ہیں۔

کراچی کی فیکٹریوں میں انتظامیہ نے ٹارگٹ حاصل کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اس کے مطابق اگر کوئی عورت پیداواری ٹارگٹ سے زیادہ پیداوار کر لیتی تو اسے اس کا اضافی معاوضہ ملتا۔ اس طرح مقابلے میں آ کر نہ صرف ان کا مزید استحصال ہوا بلکہ دوسری خواتین سے حسد اور مقابلے کے جذبات پیدا ہوئے اور مزدور خواتین کی یکجہتی پر فرق پڑا۔ اس طرح مزدوروں کے وقت پر خود بخود کنٹرول بڑھا کیونکہ زیادہ پیداوار کے لالچ میں وہ دیر تک رہ کر زیادہ چیزیں بنانے پر آمادہ ہوگئے۔ اور یہ کنٹرول یوں معلوم ہوتا تھا کہ اندرونی ہے کہ کیونکہ ان کی اپنی مرضی تھی کہ اضافی پیداوار کریں یا نہ کریں۔ کراچی کی مزدور خواتین کو جب احساس ہوا کہ ٹارگٹ طے کر کے انتظامیہ کس طرح ان کے خلاف لالچ کا جذبہ استعمال کر رہی تھی۔ تو انہوں نے آپس میں مل کر ٹارگٹ طے کرنے کے عوامل پر بات چیت کی اور طے کر لیا کہ وہ ایک مخصوص ٹارگٹ سے آگے نہیں جائیں گی۔ یہ بات انہوں نے انتظامیہ تک بھی پہنچا دی۔

انتظامیہ اور مزدور خواتین کے درمیان ایک اور تصادم اوقات پر تھا کہ جو وقت کام پر آنے میں لگتا تھا اسے کام کے اوقات میں گنا نہیں جاتا تھا۔ فیکٹری کی بس کئی گھنٹے لگا کر

خواتین کو فیکٹری تک پہنچاتی جس کی وجہ سے قوانین 12یا14 گھنٹے کام کی بنا پر گھر سے دور ہوتی تھی۔ لیکن بس کا وقت کام میں گنا نہیں جاتا تھا۔ اس پر جھگڑے ہوئے تو انتظامیہ کو آمدورفت کا کچھ وقت اوقات کار میں ڈالنا پڑا کیونکہ خواتین مزدوروں نے مل کر مطالبہ کیا کہ چونکہ بس فیکٹری کی ہے اس لیے آمدورفت کا وقت شامل کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ خواتین نے وقت پر کچھ کنٹرول حاصل کر لیا۔

کام کے عمل کو سست رفتار کر دینا بھی مزاحمت کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک فیکٹری میں انتظامیہ کا حکم تھا کہ پیکنگ کے تین بیچ ایک گھنٹے میں مکمل ہونے چاہئیں۔ اس سے خواتین کی تنخواہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا چاہے وہ صرف ایک بیچ بناتیں یا تین۔ انہوں نے ایک گھنٹے میں ایک بیچ کی رفتار قائم رکھی کیونکہ وہ خود کو کام کی خاطر ختم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جب تک انتظامیہ نے ان کی تنخواہ سے متعلق مطالبات تسلیم نہیں کئے' ان خواتین نے اپنی رفتار میں کوئی تیزی نہیں کی۔ جب مطالبات تسلیم کئے گئے تو انہوں نے ایک گھنٹے میں تین بیچ بنانے شروع کر دیئے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ اگر ہر بیچ ان کا اپنا ذاتی ہوتا اور انہیں پورا اختیار ہوتا کہ بیچ کس قیمت پر بکے گا اور کہاں اور کیسے بیچا جائے گا' یعنی بیچ ان کی ملکیت ہوتا اور تمام منافع کی وہ خود حقدار ہوتیں' تو تب وہ ایک گھنٹے میں کتنے بیچ بنا سکتی تھیں' تو ایک دم جواب آیا کہ اس صورت میں تو وہ پانچ یا چھ بیچ بنا سکتی تھیں۔ چنانچہ انتظامیہ کا یہ خیال غلط ہے کہ کارکن کاہل یا سست ہوتا ہے اور تندہی سے کام نہیں کرسکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور مزدور آپس میں جدا ہیں مزدوروں کو صرف ان کی مزدوری ملتی ہے جو کہ بمشکل اتنی ہوتی ہے کہ گزارا ہو سکے' جبکہ پیداوار امزدوروں کے اپنے ہوں' سانجھے ہوں تو پیداواری صلاحیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کیونکہ پیداوار میں حصہ داری بن جاتی ہے اور اپنی محنت کا پھل ملتا ہے۔ سرمایہ داری کا استحصالی نظام لوگوں کو پیداوار میں دلچسپی لینے سے روکتا ہے کیونکہ پیداوار پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ریاست قومی نغموں اور ترانوں وغیرہ میں اکثر مزدوروں سے التجا کرتی ہے کہ قوم کی خاطر' دیس کی خاطر کہا جاتا ہے کہ حب الوطنی پیداوار بڑھائیں۔ کسانوں اور مزدوروں سے اکثر کہا جاتا ہے کہ حب الوطنی کے جذبے کے تحت پیداوار بڑھائیں تاکہ ملکی ترقی ہو اور قوم کو ایک روشن مستقبل مل جائے۔ درحقیقت روشن مستقبل صرف چند طبقوں اور افراد کو ملتا

ہے' مزدوروں اور کسانوں کو نہیں ۔ طبقاتی معاشروں کی خصوصیت ہے کہ پیداوار کوئی کرتا ہے اور پھل کوئی کھاتا ہے۔ سستی اور کاہلی کئی دفعہ لاشعوری طور پر مزاحمت کے انداز ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ زیادہ پیداوار سے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

انتظامیہ کا وقت کے علاوہ ایک اور ہتھیار جسمانی حرکات و سکنات ہیں۔ ایک فیکٹری میں پورا دن خواتین مزدوروں کے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی' یہ ایک غیر انسانی توقع ہے۔ انہیں صبح سے شام تک اپنی اپنی مشینوں کے سامنے بیٹھ کر کام کرنا ہوتا تھا ۔ ہر مزدور کا منہ دیوار کی طرف ہوتا تھا تا کہ وہ نہ دوسرے مزدوروں سے رابطہ کرے اور نہ بات چیت کرے۔ وہاں خواتین کی مزاحمت کا انداز یہ تھا کہ وہ طرح طرح کے بہانے بنا کر اپنی کرسیوں سے اٹھ جاتی تھیں اور دوسری خواتین سے بات چیت کرتی تھیں۔ کئی دفعہ وہ سپروائزر سے کہہ دیتی تھیں کہ مشین کے بارے میں کچھ پوچھنا یا سمجھنا تھا۔ اس طرح انہوں نے اس جگہ پر نقل وحرکت کی' جہاں پر جمود طاری تھا اور نقل وحرکت کی ممانعت تھی۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر انہوں نے اپنے متحرک وجود کا اظہار کیا۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ وہ مشین کے بے جان پرزے نہیں بلکہ انسان ہیں جن کے لیے نقل وحرکت اور چلنا پھرنا ضروری ہے۔ تاہم انتظامیہ نے ایسی نقل وحرکت کو نا فرمانی اور سرکشی تصور کیا اور سزا کے طور پر ایسی کرسیاں رکھ دیں جو بے آرام تھیں اور جن پر بیٹھنا محال تھا۔ اس حربے کا مقابلہ خواتین مزدوروں نے ایک دفعہ پھر نقل وحرکت سے ہی کیا۔ ان کے کھڑے ہو کر کام کرنے سے نقل وحرکت بڑھتی تھی اور کام میں زیادہ وقفے پیدا ہوتے تھے۔ انتظامیہ نے لاکھ کوشش کی کہ وہ بیٹھ کر کام کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بالآخر انتظامیہ کو ہار ماننی پڑی اور ان کے انسان ہونے کا اعتراف کرنا پڑا۔ نتیجے کے طور پر نئی اور زیادہ آرم دہ کرسیاں لائی گئیں۔ جتنا زیادہ انتظامیہ نقل وحرکت یا زندگی کے دیگر آثار سے خوفزدہ تھی' اتنا ہی ورکرز نے زندگی کے آثار نمایاں کئے اور انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ نقل وحرکت اور بات چیت انسان ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جنہیں مٹایا نہیں جاسکتا۔ انسان روبوٹ بن سکتا کہ وہ آٹھ یا دس گھنٹے مشین کی طرح ایک ہی جگہ بیٹھ کر ایک ہی حرکت دہراتا رہے۔

ایک اور فیکٹری میں انتظامیہ اور ورکرز کا کینٹین کی سہولیات پر جھگڑا چل رہا تھا۔ خواتین ورکرز نے مل کر بیک وقت کینٹین کے ہزاروں برتن توڑ ڈالے ۔ اس طرح نہ صرف

MashalBooks.org

انسانی جسم حرکت میں تھا اور مل کر اجتماعی احتجاجی عمل بھی ہو رہا تھا۔ اس عمل کا ایک علامتی پہلو یہ ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خواتین گھریلو ہوتی ہیں اور انہیں برتنوں سے پیار ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل میں نہ صرف خواتین نے بطور ورکرز اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج کیا بلکہ نسوانیت کے اس محدود تصور کو بھی توڑا کہ عورت صنف نازک ہے جو فطرتاً گھر کی چیزوں سے پیار کرتی ہے۔ ان خواتین کی مزاحمت کی خوبصورتی یہ ہے کہ جس طریقے سے کنٹرول بڑھایا گیا یا زیادتی کی گئی' مزاحمت نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ اگر جھگڑا کھانے پینے کی چیزوں کے معیار پر تھا تو وہ چیز توڑی گئی جو کھانے پینے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر جھگڑا نقل وحرکت پر تھا تو وہی کیا گیا جسے منع کیا گیا تھا اور جو ذریعہ کنٹرول تھا۔ اس سے ان عورتوں کی تخلیقی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس انداز سے ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی' انہوں نے اسی انداز میں مخالفت کی۔ یہ احتجاج بھی ان کا اپنا تھا اور کسی لیڈر یا رہنما کے بغیر ان کے دل سے خود بخود نکلا تھا۔ برتن توڑ کر نہ صرف ان خواتین نے بطور کارکن اپنے حالات کو مسترد کیا بلکہ ان تمام پدرسری نظریات کو مسترد کیا جن کے تحت ان کی گھریلو اور کام کی زندگی استوار ہوتی ہے۔

انتظامیہ کا ورکرز پر غلبہ حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ تھا خاموشی' یعنی آواز پر کنٹرول۔ اس کا مقابلہ بھی ورکرز نے آواز ہی سے کیا۔ کراچی ہی کی ایک اور فیکٹری میں ایک بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر نمایاں حروف میں لکھا تھا'' خاموشی'' وہاں پر مکمل خاموشی کی ہدایات تھیں تاکہ خواتین ایک دوسرے سے بات نہ کریں اور ان میں اتحاد نہ ہو پائے۔ اس فیکٹری میں ورکرز اور انتظامیہ میں کام کے حالات پر جھگڑا جاری تھا۔ ایک دن تمام خواتین طے شدہ منصوبے کے تحت سیٹیاں لے کر آئیں اور ایک ورکر کے اشارے پر تمام ورکرز نے مل کر سیٹیاں بجانے شروع کر دیں ۔ یہ عمل انہوں نے مسلسل کئی دن تک کئی مرتبہ دہرایا۔ آخر انتظامیہ شور سے اس قدر تنگ آئی کہ ورکرز کے ساتھ کام کے ماحول کے بارے میں مذاکرات پر آمادہ ہوگئی۔

انتظامیہ کا ایک طریقہ کار یہ بھی تھا کہ ورکرز پر ہر قسم کے الزامات لگاتے تھے۔ تاکہ وہ خود کو برا یا غلط انسان سمجھ کر بدل جائیں اور فرمانبردار ہو جائیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے تھے'' یہ تو بولتی بہت ہے'' تاکہ خواتین چپ ہو جائیں اور اپنے حالات اور خیالات کا

MashalBooks.org

اظہار نہ کریں۔ وہ نئے ورکروں کو اکثر کہہ دیتے تھے'' وہ بالکل عورتوں جیسی نہیں۔اس میں تو بہت جارحیت ہے۔'' یا یہ کہ'' وہ تو بہت شور مچاتی ہے اور تنگ کرتی ہے''۔اس طرح کی باتوں کا مقصد تھا کہ دوسری خواتین ان کے نقش قدم پر نہ چلیں اور خاموشی سے کام میں لگی رہیں۔عورتوں کو غیر نسوانی' بہت مردانہ وغیرہ کہہ کر ان کی مزاحمت کو توڑا جاتا۔ جارحیت کو مردانہ فعل کہہ کر ان کو احساس دلایا جاتا کہ یونین کے کاموں میں حصہ لینا مرد بن جانے کے برابر ہے۔عورتوں کو خاموش' کم گو اور پر امن ہونا چاہیے۔ انتظامیہ کو امید تھی کہ اس طرح غیر نسوانی یا مردانہ کہلانے کے ڈر سے عورتیں خود پر کنٹرول کرنا شروع کر دیں گی۔ اس طرح انتظامیہ نے ہمارے کلچر اور تہذیب میں موجود نسوانیت اور مردانگی کے تصورات کا استعمال ورکرز کو کنٹرول کرنے کی غرض سے استعمال کیا۔ خاموشی کنٹرول کرنے کا مؤثر ہتھیار ہے لہٰذا شور مچانے والی مزدور خواتین کو فتنہ یا تنگ' کرنے والی کہہ کر برا بھلا ظاہر کیا جاتا۔

نسوانیت کے واسطے دینے کے ساتھ ساتھ خواتین کو اخلاقی بنیادوں پر واسطے دیئے جاتے تا کہ وہ دوسرے مزدوروں سے دور رہیں۔ ان سے کہا جاتا کہ'' وہ تو بہت تیز طرار ہے' مردوں سے گھلتی ملتی ہے اور خوب باتیں کرتی ہے۔ بعد میں مزدور خواتین کو پتا چلا کہ جس کے بارے میں یہ کہا گیا' وہ یونین کے مردوں سے باتیں کرتی پائی گئی تھی اور انتظامیہ کو خوف تھا وہ کہیں یونین میں شامل نہ ہو جائے۔ نئے مزدوروں کو اس طرح یونین سے دور رکھا جاتا کہ جو عورتیں مردوں سے بات کرتی ہیں انہیں معاشرہ پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ نامحرموں کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی ہیں۔ جن خواتین میں سیاسی شعور زیادہ تھا وہ یونین کے مردوں سے زیادہ باتیں کرتی تھیں۔لیکن ہماری روایتی اور مذہبی اقدار کو عورتوں کا سیاسی عمل روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

کئی اور طریقے بھی عورتوں کی اجتماعی تحریک کو روکنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ان میں سے چند پوری دنیا میں مشہور ہیں ۔مثال کے طور پر دوست خواتین کو مختلف شعبوں میں متعین کر دینا' تا کہ وہ ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کہہ سکیں' ایک باشعور اور سیاسی لحاظ سے متحرک خاتون مزدور کو مردوں کے شعبے میں منتقل کر دینا' تا کہ وہ خاموش ہو جائے اور زیادہ بولنے سے کترائے' یا پھر کسی بہت منہ پھٹ اور باشعور خاتون مزدور ورکر کو

فورمین بنانے کی پیشکش کر دینا' تا کہ وہ انتظامیہ کی طرف دار بن جائے اور اس کی وفاداری مالکان سے ہو جائے۔ اس کے علاوہ نوکری سے برخاست کر دینے کی دھمکیاں' کمتر درجہ دینے کی دھمکی اور کام کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں توڑنا' ایسی مثالیں ہیں جو بارہا پائی گئیں۔ ان کے علاوہ خواتین مزدوروں کو مذہبی یا لسانی بنیادوں پر ایک دوسرے سے دور کیا گیا۔ ہندو سے کہا گیا کہ مسلمان سے بات نہ کرو' مسلمان کو عیسائی سے دور کیا گیا' مہاجر کو پنجابی یا سندھی مزدوروں سے توڑا گیا تا کہ مزدوروں میں بطور طبقہ کوئی اتحاد پیدا نہ ہو۔ لیکن خواتین مزدوروں نے بارہا ان ہی چیزوں کو انتظامیہ کے خلاف استعمال کیا۔ جو انتظامیہ ان میں عدم اتحاد پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی چاہے وہ جسم کی حرکات ہوں' شور ہو' حرکت ہو' آواز ہو یا جگہ ہو۔ کارکنوں نے ان تصورات کے معنی ہی تبدیل کر ڈالے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیا اور اس طرح انتظامیہ کے حربوں کا پورا پورا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ بے ساختہ طور پر خود ہی ان کے اندر سے ابھرا۔ اس میں کسی رہنما کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مزدوروں میں طاقت سے لڑنے کا جذبہ بے پناہ ہوتا ہے لیکن سیاسی پارٹیاں اور مزاحمتی گروہ اس جذبے کو نہ تو سمجھ پاتے ہیں اور نہ سیاسی عمل کی جانب لے جاسکتے ہیں۔ وہ اس جذبے کو پوری طرح سیاسی عمل کے لیے استعمال نہیں کر پاتے۔

سیاسی اور ٹریڈ یونین سوچ میں مزاحمت عام طور پر صرف اس عمل کو تصور کیا جاتا ہے جو واضح طور پر نظر آئے۔ مثال کے طور پر جلوس' جلسہ' احتجاجی مظاہرہ' تقریریں وغیرہ۔ عموماً مزاحمتی عمل یا تحریک صرف اجتماعی عوامل کو کہا جاتا ہے اور لوگوں کی انفرادی کوششوں کی اس عمل میں شامل نہیں کیا جاتا روز مرہ کے بے ساختہ اور لاشعوری جدوجہد کو عام طور پر مزاحمت نہیں سمجھا جاتا اور تحریک کا حصہ نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کی روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی انفرادی کوششیں بھی سیاسی مزاحمت کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ انسان کی زندگی اجتماعی ہونے کے باعث سیاسی ہوتی ہے۔ ہر مزاحمتی عمل دریا کی ایک موج کی طرح ہوتا ہے اور موجیں مل کر دریا اور دریا مل کر سمندر بن جاتے ہیں۔ عورتوں کی مزاحمت کا طریقہ عام طور پر بالواسطہ ہوتا ہے اور اس میں واضح تشدد اور جارحیت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ روز مرہ کی مزاحمت خود کو مختلف انداز سے عیاں کرتی ہے مثال کے طور پر کام سے غیر حاضر رہنا' دیر سے کام پر آنا' غسل

خانے میں دیر تک ٹھہرنا' کام کی رفتار سست کر دینا۔ انتظامیہ اس طرز کی مزاحمت کو کسی کارکن کی انفرادی خامیاں سمجھتی ہے۔ وہ اس عمل کا تجزیہ انفرادی سطح پر کرتی ہے اور ایسے کارکنوں کو برا مزدور قرار دیتی ہے۔ اور کارکنوں کے فعل کو نفسیاتی خامی کہہ دیتی ہے۔ اس طرح انہیں محض ایک برے یا خراب مزدور کی خصوصیات بنا دیا جاتا ہے اور ان کا سیاسی اور مزاحمتی عنصر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سیاسی اور طبقاتی کشمکش کو انتظامی مسائل بنا کر ان کے انتظامی حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی مسائل کے سیاسی حل تلاش کئے جائیں نہ کہ انتظامی حل۔ چونکہ مقصد مزدور کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے اس لیے ایسے عوامل کو انتظامیہ کے مسائل کہہ کر ان کی شناخت کی نفی کر دی جاتی ہے اور یہ لوگوں کے ذاتی اور نجی مسائل بنا دیئے جاتے ہیں۔ جب بہت سے افراد کے یکساں مسائل ہوں اور وہ ایک ہی قسم کی نا انصافی کا شکار ہوں تو مسائل نجی یا ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی اور سیاسی بن جاتے ہیں اور ان میں طبقاتی ' سیاسی' معاشی و صنعتی کشمکش شامل ہو جاتی ہے۔ تاہم انتظامیہ ایسے مزدوروں کو کاہل' سست' ناکارہ' کام چور' مشکل شخص' نمک حرام' جاہل اور دیگر القاب سے نوازتی ہے' سیاسی عوامل انفرادی مزدوروں کی ذاتی خصوصیات بنا دی جاتی ہیں۔ اس طرح انتظامیہ ان مسائل کو سیاسی مسائل کے طور پر تسلیم کرنے سے بچ جاتی ہے۔

عام طور پر کارکن خود بھی اس قسم کے لیبل کو تسلیم کر لیتے ہیں اور ان خصوصیات کو اپنی ذات کا حصہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی اپنی پہچان اور شناخت کام کی جگہ پر ملے ہوئے القاب سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ خود بھی سوچتے ہیں کہ "میں تو سست ہوں" میں تو جاہل ہوں" "مجھے کچھ نہیں آتا" "اچھی کارکن نہیں ہوں"۔ ان القاب کا گہرا اثر اور بھی زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب انتظامیہ کی خوشنودی حاصل کرنے والے کارکن پھرتی اور چستی سے کام کر کے اچھے خطاب حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح "اچھا" اور "برا" مزدور تشکیل پا جاتا ہے۔ اگر مزدور انتظامیہ سے تعاون کرے' بڑھ چڑھ کر کام کرے اور انتظامیہ کو "برے" مزدوروں کی نشاندہی کرنے میں مدد دے تو وہ "بہت اچھا" اور وفادار مزدور کہلاتا ہے اور اس کا مقابلہ دغاباز اور "غدار" مزدوروں سے کیا جاتا ہے جو مالک کے وفادار نہیں' کام چور اور کاہل ہیں اور انہیں پیداوارار کی یا مالک کی کوئی پرواہ نہیں۔ چنانچہ وفاداری' فرمانبرداری اور تابعداری "اچھے" مزدور کی خوبیاں بنا دی جاتی ہیں اور مزاحمت کرنا' احتجاج کرنا' سیاسی

عمل میں حصہ لینا' اپنے زندہ وجود ہونے کا دعویٰ کرنا ''برے'' مزدور کی صفات بنا دی جاتی ہیں۔ اس طرح مزاحمت کو ''اچھے'' برے مزدور اور اچھائی برائی کے زمرے میں ڈال کر توڑ دیا جاتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے یہ تصورات نہ صرف سیاسی طور پر استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مزدوروں کی شناخت کی ساخت میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ مزدور خود اپنے آپ کو انتظامیہ کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ خود کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور دوسروں کے بنائے ہوئے معیار پر اترنے کی کوشش کرتے ہیں' شناخت کی تعمیر کا مزاحمت سے گہرا رشتہ ہوتا ہے کیونکہ ہم جس طرح خود کو دیکھتے ہیں' اس سے ہمارا عمل متاثر ہوتا ہے۔ شناخت کی اس تعمیر سے اجتماعی مسائل اور عوامل کو محض کچھ افراد کے انفرادی عوامل بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ جو مسائل سماجی پیداواری رشتوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں' انہیں لوگوں کے کردار اور شخصیت کے مسائل بنا کر پیداواری رشتوں میں عدم مساوات کو روپوش کر دیا جاتا ہے۔

ان عوامل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داری نظام اور پیداواری عمل کی وجہ سے ایک مخفی احساس بیگانگی پیدا ہوتا ہے' اس احساس اجنبیت اور بیگانگی کو لوگوں کی شخصیت کے مسائل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ عورتوں کے لیے'' برے کردار کی عورت'' ''اخلاقی طور پر پست عورت'' کہلانا ہمارے معاشرے میں بہت شرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا عورت کو کنٹرول کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ایسے القاب کبھی اپنی شناخت کا حصہ نہیں بننے دے سکتی۔ اس کے گھریلو رشتے بھی ایسے لقاب سے متاثر ہوتے ہیں ۔عورت کے لیے یہ زیادہ اہم ہے کہ اس کی شناخت بطور'' اچھی عورت'' یا '' نیک عورت'' ہو۔ وہ '' بدکردار عورت'' کہلائے گی تو اس کا جینا حرم ہو جائے گا۔ نتیجے کے طور پر مزدور عورتیں اکثر اجتماعی طرز کی مزاحمت اور احتجاج میں حصہ لینے سے گھبراتی ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ٹریڈ یونین میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی مزدور عورتیں ہر قسم کی منفی القاب کا نشانہ بنائی جاتی ہیں اور ان کے بارے میں گندی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہماری تہذیب و ثقافت میں عورت کے بارے میں موجود تصورات کو انہیں کنٹرول کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے ۔ انتظامیہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی نظام اور ہماری اقدار کو عورتوں کے خلاف استعمال کرتی ہے تا کہ وہ منظم نہ ہو پائیں۔ اس طرح خواتین مزدوروں کو مرد مزدوروں سے

علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور مزدور طبقے کے افراد میں ایک دوسرے سے دوری پیدا کر جاتی ہے۔

تاہم جہاں ایک طرف ہماری تہذیب و ثقافت میں ایسی اقدار موجود ہیں جو عورت کو اخلاق و کردار کے واسطے دے کر قابو میں رکھنے کے کام آتی ہیں، دوسری طرف ہمارے کلچر میں روز مرہ کی مزاحمت کے لئے مواد بھی موجود ہے۔ روز مرہ کی ثقافتی و معاشرتی زندگی سے ہی مزاحمت نکل کر باہر آتی ہے۔ تہذیب و ثقافت میں تضادات ہوتے ہیں۔ یہ کوئی یکساں قسم کی چیز نہیں ہوتی۔ حاوی طبقوں کے اور نظریات ہوتے ہیں اور نظریات اور اقدار میں علاقائی، لسانی اور مذہبی بنیادوں پر بھی فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ معاشرے میں کوئی ایک حاوی سچ نہیں ہوتا بلکہ ایک سے زائد سچ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ نظریات اور اقدار کے اس تصادم اور ان تضادات کی وجہ سے ہی مزاحمت نمودار ہوتی ہے۔ جب قدروں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو کچھ قدریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ نئی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔ معاشرہ منجمد نہیں ہوتا اور اس کا ارتقاء بہت سے عوامل کی بنا پر بدستور جاری رہتا ہے۔ پیداواری قوتیں بدلتی ہیں جس کے نتیجے میں نئے پیداواری رشتے بنتے ہیں جو اپنی مخصوص اقدار کو جنم دیتے ہیں۔ اس معاشرتی کشمکش کی بنا پر ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ پرانی اقدار کو توڑ کر نئی بنائی جائیں یا پھر پرانی اقدار کو نئے معنی اور نئے مفہوم فراہم کئے جائیں۔ اس طرح لوگ اپنے مزاحمتی عمل سے تہذیب و ثقافت کے عناصر کو نئے معنی دیتے ہیں اور اقدار کی تشریح بھی دیتے ہیں۔ جب عورتیں مزاحمت کرتی ہیں تو وہ موجودہ چیزوں کو نئے عطا کرتی ہیں۔ یہ بھی مزاحمت کا ایک انداز ہے۔

ان معاشرتی اور ثقافتی تضادات اور تصادم ہی کی وجہ سے جہاں پنجاب میں عورت کا مرضی سے شادی کرنا اتنا برا سمجھا جاتا ہے کہ صائمہ ارشد کے کیس میں عورتوں کی پناہ گاہ ''دستک'' پر باقاعدہ حملے کئے گئے، دوسری طرف پنجاب کے ہی لوگ ہیر کو بہت پسند کرتے ہیں حالانکہ ہیر نے اپنی مرضی کا شخص پسند کیا اور مرضی کے خلاف شادی پر مزاحمت کی اور قاضی سے اپنے حق میں فیصلہ کروایا۔ اسی طرح پنجاب کے لوگ سوہنی کو بہت پسند کرتے ہیں جو اپنے شوہر کو چھوڑ کر دریا پار ایک غیر شخص کو ملنے جایا کرتی تھی۔ وہی مرد حضرات جو سوہنی کی داستان شوق سے سنتے ہیں، مشتعل ہو کر بیوی، بہن، ماں یا بیٹی کو غیرت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں اگر وہ کسی غیر مرد سے ناطہ جوڑے۔ ہمارے لاشعور میں چھپے ان

تضادات کی وجہ سے معاشرہ دونوں چیزوں کو جنم دیتا ہے۔ ایک طرف مزاحمت، بغاوت اور سرکشی۔ انہی تضادات کی بنا پر شوہر پرست بیویاں ظالم شوہر کے کھانے میں دانستہ نمک تیز کر دیتی ہیں یا پھر چار بچے چھوڑ کر بقول اردو اخبارات ''آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی'' عورت تہذیب کے بنائے ہوئے بندھن توڑ دیتی ہے۔ اگر اخبارات اٹھا کر دیکھے جائیں تو آئے دن یہی خبر ہوتی ہے کہ ''عورت آشنا کے ساتھ بھاگ گئی'' عورت کو شک کی بنا پر قتل کر دیا گیا'' مرضی کی شادی پر عورت کو قتل کر دیا'' ''غیر مرد سے ناجائز تعلقات پر شوہر نے عورت کو قتل کر دیا''۔ معاشرہ قدروں کی تشکیل کرتا رہتا ہے، جائز اور ناجائز کے متضاد خیالات کی تعمیر ہر دم ہوتی رہتی ہے، عورت کو مزاحمت پر جان بھی دینا پڑتی ہے، پھر بھی نہ تو وہ پدرسری نظام کے ہاتھوں پوری طرح قابو آتی ہے اور نہ سرمایہ داری کے آگے سر جھکاتی ہے۔ وہ غیر متحرک اور بے جان نہیں بلکہ اس حد تک جان سے بھرپور ہے کہ پدرسری نظام اس کے وجود سے، اس کی ذات سے خوف کھاتا ہے اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے جو یہ وقتاً فوقتاً توڑ دیتی ہے، کبھی آشنا کے ہمراہ فرار ہو کر کبھی مرضی سے دوسرے آدمی سے تعلقات بنا کر اور کبھی ہتھیار اٹھا کر مرد کو ختم بھی کر دیتی ہے۔ عورت نہ صرف گھر کے بلکہ کام کی جگہ کے پدرسری کلچر کو بھی للکارتی ہے اور اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

دورانِ کار روزہ مرہ کی غیر رسمی مزاحمت دورے ممالک میں بھی نمودار ہو چکی ہے۔ اس طرز مزاحمت کے متعلق امریکہ کے مارکسی مفکر مائیکل ایپل لکھتے ہیں کہ کام کی جگہ پر اکثر صنعتی کارکن ''پیسنگ'' (Pacing) کا طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔

(23) اس طریقہ کار کو ''70 فیصد کی علامت'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار میں کارکن مل کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ مشین کی پوری رفتار کا صرف 70 فیصد حصہ چلائیں گے اور اس طرح پیداواری عمل کو سست کر دیں گے۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا ہے کہ کارکنوں نے مشین کو زیادہ رفتار سے چلا کر پیداوار بڑھائی ہے تاکہ دوسرے مزدوروں کی مدد کر سکیں۔ ایپل کے مطابق زیادہ چھپی ہوئی مزاحمت کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ورکر کا رویہ منفی ہو جاتا ہے اور وہ عدم تعاون کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس دوران وہ حکام بالا کی طاقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے یا ان میں دیر کر دیتا ہے۔ یہ اس کا احتجاج کرنے کا طریقہ ہے۔

MashalBooks.org

مائیکل ایپل لکھتے ہیں کہ عورتوں نے اکثر بہت مؤثر انداز میں پیداواری تقاضوں کا مقابلہ کیا ہے اور مزاحمت میں کامیاب ہوئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جوتے اور کپڑے بنانے والی فیکٹریوں میں عورتوں کی یونین کا پوری فیکٹری پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ خواتین کام کی جگہ پر ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں' انتظامیہ کے کنٹرول کے خلاف مل کر مزاحمت کرتی تھیں اور جب خواتین مزدور مردوں کے ہمراہ مل کر مزاحمت کا مظاہرہ کرتی تھیں تو ان کی مزاحمت مزید مؤثر ہو جاتی تھی۔ یہ خواتین اکثر مالکان کے سامنے واضح طرز کی جارحیت کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

مائیکل ایپل کے مشاہدے کے مطابق خواتین سیلز ویمن یعنی اشیاء فرخت کرنے والی خواتین کے ہاں مزاحمت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب انتظامیہ نے نئی ہدایات جاری کیں تاکہ کام کی جگہ پر فرما برداری بڑھ جائے اور نئے اصولوں نے ان خواتین کے بے تکلف ماحول کو خراب کیا' تو ان عورتوں نے بہت مؤثر انداز میں نئے قواعد و ضوابط توڑے۔ نئے ضابطوں میں جب زیادہ کام شامل ہوتا تو یہ انکار کر دیتی تھیں یا پھر بے تکلف انداز میں لڑ بھی پڑتی تھیں۔ جب ان پر مصنوعات سجانے کا زیادہ بوجھ پڑتا تو یہ جان بوجھ کر بدنما انداز میں کپڑے رکھ دیتی تھیں یا عجیب وغریب انداز سے سجا دیتی تھیں تاکہ وہ گاہک کو راغب کرنے میں ناکام ہو جائیں۔ بطور گروپ وہ زیادہ دیر تک کھانے کا وقفہ طویل کر کے اپنا کھویا ہوا وقت انتظامیہ سے واپس لے لیتی تھیں۔ کئی دفعہ وہ انتظامیہ کا طے شدہ کپڑے پہننے کا انداز ترک کر کے انہیں گاہکوں کے سامنے شرمندہ کرتی تھیں ۔ جو کارکن ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تھے انہیں بے تکلف طریقوں سے سزائیں دی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کارکن عورت نے کام کے بے تکلف اور غیر رسمی کلچر کو نہیں مانا تو ایک دم اس کی ٹانگوں پر دراز زور سے بند کر دیا جاتا۔ یا اسے انتظامیہ یا گاہک کے سامنے شرمندہ کر دیا جاتا۔ اس طرح اس بات کو یقینی بنایا جاتا کہ ہر کارکن عورت دوران کار کے غیر رسمی کلچر کے مطابق چلے۔ ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کام کی جگہ کے کلچر کو پوری طرح مزدور خواتین نے اپنی ذات اور شناخت کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ یہ خواتین کام کی رفتار اور معنی کو بھی قابو میں لے لیتی تھیں۔ کام کو بدل کر رکھ دیتی تھیں یا پھر انتظامیہ کے مطالبات کے خلاف کام کا رخ موڑ دیتی تھیں۔ ایپل دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ اشیاء

فروخت کرنے والی خواتین نے کس تخلیقی انداز میں کام کے کوٹے اور دیگر تقاضوں کے خلاف مزاحمتی عمل کیے۔ مثال کے طور پر گاہکوں سے اس طرح بات کرنا کہ وہ بھاگ جائیں، پیک سیزن peak season میں جب خرید وفروخت زیادہ ہوتی ہوتو گاہکوں کونظر انداز کرنا اور جب خرید وفروخت کم ہوتی ہوتو گاہکوں سے زیادہ جارحانہ انداز میں بات کر کے چیز فروخت کرنے کی کوشش کرنا۔ ان عورتوں کے لیے انتظامیہ کا طے شدہ کوٹہ پورا کرنا ضروری تھا لیکن اگر کوئی کوٹے سے بہت زیادہ چیزیں فروخت کر دیتیں تو ان کی ساتھی ناراض ہوسکتی تھیں کیونکہ ان پر دباؤ پڑتا تھا۔ اس لیے یہ کوٹے کو ایک حد کے اندر رکھتی تھیں کہ نہ تو بہت زیادہ فروخت ہو اور نہ بہت کم۔ کئی دفعہ یہ جان بوجھ کر گاہک کو دیکھتی ہی نہیں تھیں یا پھر کسی ساتھی سے گفتگو میں مگن رہتی تھیں تاکہ گاہک ان کی عدم دلچسپی دیکھ کر چلا جائے۔ ایپل اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غیر متحرک نہیں اور ڈری ہوئی مزدور عورت کا تصور ایک متھ ہے اور اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ عورتوں میں اپنے وجود کا احساس دلانے کی پوری صلاحیت ہے اور وہ خودمختاری کے مظاہرے بار بہا کرتی ہیں۔ ایپل کے خیال میں مزاحمت کا یہ انداز غیر رسمی اور بے تکلف قسم کا ہے اور اس کی بنیاد کلچر یا ثقافت ہے، سیاسی شعور نہیں۔ تاہم یہ بھی مزاحمت ہے۔(25)

صنعتوں میں اجتماعی جدوجہد

جہاں عورتوں نے دوران کار غیر رسمی طرز کی لاشعوری مزاحمت کا مظاہرہ کیا ہے، وہاں انہوں نے اجتماعی طرز کی سیاسی مزاحمت میں بھی حصہ لیا ہے۔ عورتوں کی مزاحمت پر تبصرہ کرتے ہوئے حمیرہ اختر لکھتی ہیں کہ مزدور خواتین اپنے پر دوہرا ظلم بطور مزدور اور بطور خواتین پوری طرح سمجھ نہیں پاتیں۔(26) حمیرا اختر کے مطابق لیبر یونین اور لیبر کی تحریکوں کا رویہ بھی اکثر باقی معاشرے کی طرح پدر شاہی کی قدروں سے لبریز ہوتا ہے۔ عورتوں کا ان تنظیموں میں شامل ہونا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ یونین کے مزدوروں کا رویہ بھی خواتین مزدوروں کی جانب ہمدردانہ نہیں ہوتا۔ وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو منظم کرنا مشکل ہے اور عورتیں کھل کر اظہار خیال نہیں کرسکتیں۔ لہٰذا وہ یونین میں نہ تو عورتوں کو شامل کرنے کی کوئی خاص کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں یونین کا کوئی خاص عہدہ دینے پر رضا مند ہوتے

ہیں۔ یونین کے مردوں کا یہ رویہ مائیکل اپیل کے اس تجربے کے برعکس ہے کہ جب خواتین یونین میں شامل ہو جاتی ہیں اور مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کرتی ہیں تو نہ صرف خواتین خود مزید مضبوط ہوتی ہیں بلکہ یونین بھی اور مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔

حمیرہ اختر کے مطابق یونین ایسے مسائل پر جدوجہد کرنے پر آسانی سے آمادہ ہو جاتی ہے جو عورتوں کے روائتی کردار سے متعلق ہوتے ہیں' مثال کے طور پر زچہ اور بچہ کے مسائل یا زچگی کی چھٹیاں ۔ لیبر یونین ان مسائل پر بات نہیں کرتی جو عورتوں اور مردوں کے مقابلے میں کم اجرت دی جاتی ہے تو یونین یہ مسئلہ نہیں اٹھاتی۔

اس کے علاوہ جنسی ہراسانی صرف کام کی جگہ پر ہی نہیں بلکہ یونین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے اکثر مزدور خواتین مردوں سے بھری یونین سے بات چیت کرنے سے کتراتی ہیں۔ وہ اپنے غم اور دکھ دوسری عورتوں سے بانٹ کر دل ہلکا کر لیتی ہیں ۔حمیرہ اختر کا مشاہدہ ہے کہ عورتیں کام کی جگہ پر ظلم و نا انصافی کا مقابلہ اس وقت تک نہیں کر سکتیں جب تک کہ انہیں گھر میں اس عمل کے لیے حمایت نہ میسر ہو۔ گھر اور محلے میں کام کی جگہ کے مسائل کو عورت کی اپنی ذات اور کردار کی خامی بنا کر باتیں بنائی جاتی ہیں۔ کام کی جگہ کے مسائل کے بارے میں گھر والے اور محلے والے زیادہ ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ گھر اور محلے واے خود مختار اور خود کفیل عورت کو اکثر بری نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے کردار پر تنقید کرتے ہیں۔ اگر وہ یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لے تو مزید باتیں بناتے ہیں کیونکہ یونین کی میٹنگ وغیرہ کام کے اوقات کے بعد ہوتی ہے اور مردوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔

حمیرہ اختر کے سروے کے مطابق ابھی تک لیبر یونینوں نے عورتوں کو باقاعدہ طور پر اپنی جدوجہد میں شامل نہیں کیا اور نہ ہی ان کے مسائل کو اہمیت دی ہے۔ جن عورتوں کے کے انٹرویو حمیرہ اختر نے کیئے ان میں سے صرف ایک چوتھائی عورتیں ایسی جگہ کام کرتی تھیں جہاں لیبر یونین تھی۔ کراچی کی دوائیں بنانے والی اور کوسمیٹک کی صنعتوں میں لیبر یونین موجود ہے۔ لاہور میں صرف دوائیں بنانے والی صنعت میں لیبر یونین پائی گئی۔ ملتان اور فیصل آباد کی کسی بھی فیکٹری میں لیبر یونین نہیں تھی۔ تمام شہروں کو اگر اکٹھا دیکھا جائے تو ماہی گیری' کپڑوں کی صنعت' کھانے پینے کی اشیاء کی صنعتوں' ربڑ' پلاسٹک اور قالین کی

صنعتوں میں کوئی لیبر یونین نہیں تھی۔

تاہم دلچسپ امر یہ ہے کہ جہاں لیبر یونین موجود تھی' وہاں پر 72فیصد خواتین اس کی ارکان تھیں۔ پھر بھی جب کوئی مسئلہ اٹھتا تو لیبر یونین اسے سلجھانے میں خواتین کی کوئی خاطر خواہ مدد نہیں کرتی تھی۔ جن عورتوں کے انٹرویو کئے گئے ان میں سے نصف نے کہا کہ لیبر یونین لیبر کے مسائل پر معلومات فراہم کرتی ہے اور باقی خواتین نے کہا کہ یونین کوئی معلومات فراہم نہیں کرتی۔

عام طور پر لیبر یونین خواتین سے صرف یہ توقع کرتی ہے کہ جب انتخابات ہوں تو خواتین ووٹ ڈالیں۔ اس سے زیادہ ان کا کوئی کردار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ نتیجے کے طور پر65فیصد مزدور خواتین یونین کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتیں۔ یونین خواتین کے لیے تعلیمی اور تربیتی پروگرام مرتب نہیں کرتی۔

جو خواتین لیبر یونین کی ارکان ہیں ان میں سے 27فیصد نے اور جو رکن نہیں ہیں ان میں سے 21فیصد نے بتایا کہ لیبر کے مرد رہنماؤں کا رویہ خواتین کے ساتھ امتیازی ہوتا ہے چونکہ بیشتر خواتین جزوقتی مزدور ہیں' یونین کا ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ 40فیصد جز وقتی مزدو خواتین' جو لیبر یونین کی رکن نہیں تھیں' نے بتایا کہ یونین کے لیڈروں کا رویہ ان کی جانب برا ہے اور ہو بدسلوکی کرتے ہیں۔ اس رویے کی دوہری وجہ ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ عورت ہے اور دوسرا یہ کہ جزوقتی کارکن ہے۔ چنانچہ عورتوں کے مسائل کی طرف یونین کا رویہ مثبت نہیں' خاص طور پر جب وہ یونین کی ممبر نہ ہوں۔ کئی خواتین کا کہنا ہے کہ یونین نے کوئی مسائل نہیں اٹھائے۔ وہ بے حد غیر متحرک ہیں۔

عورتوں کے مخصوص مسائل کے بارے میں یونین کی48فیصد رکن خواتین اور 75فیصد عورتیں جو رکن نہیں ہیں' کہتی ہیں کہ یونین عورتوں کے مخصوص مسائل کی نشاندہی نہیں کرتی اور نہ ہی ان کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یونین نے صرف زچگی کی چھٹی کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ اس طرح یونین بھی صرف عورت کے ممتا کے کردار کو تسلیم کرتی ہے اور اسی ذمہ داری لے لیے جدودجہد کرتی ہے۔ اس طرح یونین بذابت خود صنفی تفریق میں حصہ لیتی ہے۔

خواتین مزدوروں کے پاس اپنے حقوق تسلیم کروانے کے لئے دو ممکن طریقے

MashalBooks.org

ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مرد مزدوروں کی تحریک کے ذریعے ہی اپنے حقوق منوانے کی کوشش کریں دوسرا یہ کہ وہ خود اپنی نمائندگی کا انتظام مرد مزدوروں سے علیحدہ کریں دوسرے طریقے سے وہ مردوں کی تحریک سے علیحدہ ہو جائیں گی جو کہ مزدور طبقے کی یکجہتی کے لئے اچھا نہیں تاہم تحقیق سے واضح ہوگیا ہے کہ مرد مزدور تحریک خواتین کے مخصوص مسائل سے کوئی خاص ہمدردی نہیں رکھتی اور نہ ہی ان کے مسائل پر توجہ دیتی ہے۔

اپنی نمائندگی خود کرنے کا مطلب ہے کہ لیبر یونین کے اندر خواتین کی اپنی کمیٹی بنائی جائے۔ اس کمیٹی کا یہ کام ہو کہ خواتین کے مخصوص مسائل کی نشاندہی ہو اور ان کے حل سے متعلق لائحہ عمل طے کیا جائے۔ اس طریقے سے لیبر یونین پر مردوں کے حاوی ہونے کے باوجود خواتین کے مسائل کا حل ممکن ہے۔ جب مزدوروں سے عورتوں کی اپنی علیحدہ نمائندگی کے بارے میں سوال کیا گیا تو 43 فیصد خواتین مزدور اور 7 فیصد مرد مزدوروں نے اس خیال کی تائید کی۔ اس کے علاوہ 33 فیصد خواتین اور 4 فیصد مردوں نے خواتین کی خاص کمیٹی کی حمایت کی۔ بشرطیکہ علیحدہ یونین بنانا ممکن نہ ہو۔ 10 فیصد خواتین نے مردوں کے ہمراہ کسی قسم کی بھی نمائندگی سے انکار کر دیا۔ عورتوں کی علیحدہ یونین کو خطرے کے طور محسوس کیا گیا خاص طور پر ایسی فیکٹریوں میں جہاں خواتین مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے۔ مزدوروں کو خوف تھا کہ یہ علیحدگی پوری تحریک کو کمزور کر سکتی ہے۔ 30 فیصد خواتین اور 15 فیصد مردوں نے عورتوں کے منظم ہونے کی مخالفت کی خواہ وہ علیحدہ تنظیم کی صورت میں ہو یا عورتوں کی کمیٹی کی صورت میں۔ (28)

جن فیکٹریوں میں لیبر یونین موجود ہے وہاں پر بیشتر خواتین چاہتی ہیں کہ عورتوں کی علیحدہ یونین نہ بنے۔ لیکن اگر خواتین کے مسائل نظر انداز ہو رہے ہوں تو 40 فیصد خواتین کا خیال ہے کہ عورتوں کی نمائندہ کمیٹی ہونی چاہئے جبکہ 25 فیصد کا نظریہ یہ ہے کہ نہ تو خواتین کی علیحدہ لیبر یونین ہونی چاہئے اور نہ کوئی کمیٹی۔ (28)

جہاں لیبر یونین موجد ہے ان فیکٹریوں کی 28 فیصد خواتین کے مطابق عورتوں کی علیحدہ یونین ان کے مسائل کے حل کے لئے ناگزیر ہے۔ ان خواتین میں سے 21 فیصد کا خیال ہے کہ علیحدہ کمیٹی ہی کافی ہے لیکن 7 فیصد صرف علیحدہ کمیٹی پر خوش نہیں اور اقرار کرتی ہیں کہ علیحدہ یونین ضروری ہے۔ جن فیکٹریوں میں لیبر یونین نہیں ہے وہاں 48 فیصد عورتوں

کا خیال ہے کہ علیحدہ یونین کی ضرورت ہے۔(29)

لیبر یونین کی رکن 41 فیصد خواتین کا خیال ہے کہ لیبر یونین کے اندر خواتین کی علیحدہ کمیٹی کی سخت ضرورت ہے۔ 28فیصد کے خیال میں علیحدہ یونین نہیں ہونی چاہئے۔ لیبر یونین کی 26فیصد خواتین کا خیال ہے کہ عورتوں کی علیحدہ لیبر یونین بہتر طریقے سے خواتین مزدوروں کے مسائل کی نشاندہی کرسکتی ہے اور حل تلاش کرسکتی ہے۔ ان میں سے 19فیصد صرف علیحدہ کمیٹی پر اکتفا کرنے کو تیار ہیں۔ تاہم 7فیصد خواتین اس پر رضا مند نہیں ہیں۔(30)

جو خواتین لیبر یونین کی رکن نہیں ان کی 38فی صد تعداد عورتوں کی علیحدہ یونین کی حامی ہے۔ اور 30فیصد خواتین صرف علیحدہ کمیٹی کی حمایت کرتی ہیں۔ 8فیصد خواتین علیحدہ کمیٹی بنانے کے خلاف ہیں۔ تاہم 35فیصد خواتین کے خیال میں عورتوں کی علیحدہ کمیٹی کے بغیر ان کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی جاسکتی۔ 17فیصد خواتین کے خیال میں نہ تو علیحدہ لیبر یونین ہونی چاہئے اور نہ ہی علیحدہ کمیٹی۔ یہ خواتین لیبر یونین کی رکن نہیں ہیں۔(31)

اس ضمن میں مختلف شہروں میں خواتین کے نظریات میں فرق نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر کراچی کی خواتین کارکنوں کی 39فیصد تعداد عورتوں کی علیحدہ لیبر یونین کے حق میں ہے۔ ان میں سے 29فیصد کمیٹی کی حامی ہیں لیکن 10فیصد لیبر یونین کے اندر عورتوں کی علیحدہ کمیٹی بنانے کے حق میں ہیں۔ 17فیصد خواتین کوئی تبدیلی نہیں چاہتیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی علیحدہ یونین یا کمیٹی کی کوئی افادیت محسوس نہیں کرتیں یا پھر ان کے خیال میں عورتوں کے علیحدہ مخصوص مسائل نہیں ہیں اور تمام مسائل وہی ہیں جو مرد مزدوروں کے بھی ہیں۔

لاہور کی فیکٹریوں میں کام کرنے والی مزدور خواتین کی 44فیصد تعداد عورتوں کی علیحدہ لیبر یونین کی حامی ہے۔ ان میں سے 37فیصد علیحدہ کمیٹی بنانے پر آمادہ ہیں۔ تاہم 7فیصد خواتین کی 20فیصد تعداد کسی قسم کی علیحدہ نمائندگی کے حق میں نہیں ۔ 12فیصد خواتین لیبر یونین کے اندر رہ کر علیحدہ کمیٹی کی حمایت کرتی ہیں۔(32)

حمیرہ اختر کے خیال میں عورتوں کی علیحدہ یونین یا کمیٹی کے نہ ہونے کی صورت میں عورتوں کی ایک فیڈریشن بنائی جاسکتی ہے جس میں ہر کارکن عورت شامل ہو سکے خواہ وہ

MashalBooks.org

کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہو۔ اس طرح فیکٹری سے باہر عورتیں منظّم ہو کر تحریک چلا سکتی ہیں خواہ وہ مختلف شعبوں اور صنعتوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس فیڈریشن میں نہ صرف مزدور خواتین بلکہ پیشہ ور خواتین اور دیگر خواتین جو خدمات کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں بھی شامل ہیں۔ اس فیڈریشن کے ذریعے فیکٹری مالکان کے لیے خواتین مزدوروں سے متعلق خصوصی ضابطے بنائے جاسکتے ہیں جو کہ قانون کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ان ضابطوں کی پابندی نہ صرف انتظامیہ پر عائد ہو' لیبر یونین پر بھی ان ضابطوں کے مطابق کام کرنے کی پابندی ہو خاص طور پر جنسی ہراسانی کی تعریف وتشریح بے حد ضروری ہے کیونکہ بہت سی ناقابل قبول باتیں ہیں جنہیں ہمارے معاشرے میں برداشت کیا جاتا ہے۔ اس فیڈریشن کا یہ کام بھی ہونا چاہیئے کہ وہ 1969 کے صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کا اطلاق یقینی بنائے۔ جہاں 50 یا اس سے زائد خواتین کام کرتی ہیں' وہاں اس کا اطلاق ضروری ہے اور تحقیق ثابت کرتی ہے کہ اگر 1969 کا صنعتی تعلقات سے متعلق آرڈی نینس عملی طور پر رائج ہو جائے تو 67 فیصد خواتین کو مزید مستحکم بنایا جائے' مزدوروں اور انتظامیہ کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کیا جائے اور ان کے باہمی تعلقات کو سازگر اور خوشگوار رکھا جائے۔ خواتین کا رکن لیبر یونین پر دباؤ ڈال سکتی ہیں کہ خواتین مزدوروں کی جانب مرد مزدوروں کا رویہ ہمدردانہ اور شریفانہ ہو۔ حقوق لیبر قوانین میں پہلے سے شامل بھی ہیں۔

پایلر کے فرحت پروین اور کرامت علی لکھتے ہیں کہ جب بھی مزدور اپنا تنظیم بنانے کا حق استعمال کرتے ہیں تو انہیں ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ انتظامیہ کے حصہ کا نشانہ بنتے ہیں۔ چونکہ ایک سے زائد یونین بنانے کا قانونی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ انتظامیہ یونین توڑ کر پاکٹ یونین بنوا دیتی ہے۔ ٹریڈ یونین بھی پاکستانی سربراہوں کی طرح ذاتیات کو اہمیت دیتی ہے اور من پسند افراد کے مسائل پر توجہ دیتی ہے۔ نتیجتاً ٹریڈ یونین کے اندر جمہوری طرزِ عمل اور سوچ کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ یونین میں مردوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور عام طور پر مرد ہی اس پر حاوی ہوتے ہیں۔ ان کی رکنیت بھی زیادہ تر مردوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان کے رہنما بھی مرد ہی ہوتے ہیں ان دونوں مصنفین کے مطابق 15 بڑی ٹریڈ یونینوں کے سروے نے انکشاف کیا کہ ان میں سے صرف ایک یونین کے صدر خاتون تھیں اور پوری فیڈریشن میں صرف یہی خاتون عہدیدار تھیں۔ [33] 1991ء کے اس

MashalBooks.org

سروے کے مطابق ٹریڈ یونین کے ڈھانچے میں عورتوں کی شدید کمی ہے۔ پائلر کے اس سروے نے انکشاف کیا کہ صرف 10 فیکٹریوں میں ٹریڈ یونین تھی جن میں سے 9 فیکٹریاں ملٹی نیشنل تھیں۔ یونین والی فیکٹریوں میں 1446 خواتین کارکنوں میں سے صرف 160 خواتین یونین کی ارکان تھیں۔ باقی فیکٹریوں میں یونین تھی ہی نہیں۔ تمام یونینوں میں ملا کر صرف 15 خواتین یونین میں عہدیدار تھیں ان میں سے کوئی بھی صدر یا جنرل سیکرٹری نہیں تھی۔ فرحت پروین اور کرامت علی کے مطابق مرد کارکنوں کا رویہ خواتین مزدوروں کی جانب جاگیردارانہ اقدار کا آئینہ دار تھا۔ وہ عورتوں کو اپنے برابر کا انسان نہیں سمجھتے تھے اور اس بات کو بمشکل قبول کر پاتے تھے کہ خواتین بھی مزدور ہو سکتی ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ خواتین کو یونین کی سرگرمیوں سے دور رکھا جائے۔

فرحت پروین اور کرامت علی کا مشاہدہ ہے کہ ٹریڈ یونین اور دیگر مزدور تنظیمیں ان شعبوں سے دور رہتے تھے جہاں زیادہ تر مزدور خواتین ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواتین مزدور یونین کو بہت کم پیسے دے پاتی ہیں چنانچہ ان شعبوں میں انتظامیہ کا مزدوروں کی جانب رویہ بہت زیادہ خراب پایا گیا۔ یہ بات خاص طور پر کپڑے اور اشیائے خورد نوش بنانے والی صنعتوں میں دیکھی گئی۔ یونین نہ ہونے کے باعث ان صنعتوں کی انتظامیہ مزدوروں کے لیے سہولیات فراہم کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ لہٰذا ان صنعتوں میں مرد مزدو بھی یونین نہیں بنا پاتے۔ خواتین پر اس کا دوہرا اثر پڑتا ہے۔ (34)

پائلر کے سروے نے انکشاف کیا کہ بیشتر خواتین مزدوروں کو معلوم ہی نہیں کہ ٹریڈ یونین کیا ہوتی ہے۔ جب انہیں بتایا گیا تو 46 فیصد خواتین نے یونین کی ضرورت کو محسوس کیا اور 23 فیصد مردوں نے یونین کی ضروری قرار دیا۔ ان دونوں مصنفین کے مطابق کراچی کی مزدور خواتین مردوں کے ہمراہ کام کرنے پر لاہور کی نسبت زیادہ رضا مند ہیں کیونکہ پنجاب میں پردے کی رسم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ (35)

پائلر کے ماہرین کے خیال میں خواتین کو تین سطح پر مشکلات درپیش ہیں۔ (1) بطور کارکن' (2) بطور عورت' (3) بطور شہری۔ پائلر کی مدد سے ویمن ورکرز سینٹر کا قیام ہوا جو عورتوں کی مزاحمت کی نمایاں مثال ہے۔ یہ مرکز خواتین ہی چلاتی ہیں اور مزدوروں کو ان کے حقوق سے آگاہ کرتی ہیں اور نیز قوانین کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ویمن

ورکرز سینٹر خواتین مزدوروں کو تعلیم بھی دیتا ہے اور دیگر سہولیات' مثلاً قانونی صلاح مشورہ بھی مہیا کرتا ہے۔ ویمن ورکرز سینٹر کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مل کر اجتماعی عمل سے حقوق کئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ انتظامیہ اور مالکان نے قانونی چارہ جوئی کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہر قسم کی ناانصافی کرنے کی کوسس کی' مگر وہ خندہ پیشانی سے ڈرتی رہیں حتیٰ کہ انہیں نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ ویمن ورکرز سینٹر نے ان تین خواتین ورکرز کو قانونی امداد فراہم کی اور ساتھ ہی ساتھ یونین بنانے کی ترغیب دی۔ بیشتر مزدور خواتین نے طویل عدالتی کارروائی کے خوف سے انتظامیہ سے ٹکر لینا مناسب نہ سمجھا۔ انتظامیہ نے انہیں عدالتوں اور پولیس سے ڈرایا لیکن ویمن ورکرز سینٹر نے انہیں آمادہ کیا کہ عالمی محنت کش ادارے اور پاکستان کے آئین میں دیئے گئے حقوق کے لیے لڑنا ان کا بنیادی حق ہے۔ یہ واقعات کراچی کی ایک کپڑے بنانے والی فیکٹری میں پیش آئے۔ جہاں 90 فیصد کارکن خواتین تھیں اور فیکٹری کی انتظامیہ کا رویہ بے حد ظالمانہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ جنگ تین خواتین نے لڑی۔ انتظامیہ نے ان کے خلاف ہر قسم کا حربہ استعمال کیا لیکن ویمن ورکرز سینٹر نے ان کا قانونی اور معلوماتی ساتھ دیا۔ کراچی کے ورکرز کے مسائل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرحت پروین اور کرامت علی لکھتے ہیں کہ جب ایک فیکٹری میں یونین بنانے پر انتظامیہ نے بہت سے مزدوروں کو برطرف کر دیا اور ویمن ورکرز سینٹر نے ان کے لیے قانونی چارہ جوئی کی' تو کچھ ورکرز' جو مہاجر کمیونٹی سے تعلق رکھتی تھیں' مہاجر قومی تحریک کے پاس گئیں تاکہ اپنے مسائل کے لیے مدد مانگ سکیں۔ سیاسی پارٹی سے بات چیت کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ فیکٹری کے مالکان نے مہاجر قومی تحریک کو بے شمار چندے دے رکھے تھے جس کی بنا پر اس سیاسی پارٹی نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس واقعہ سے انہیں احساس ہوا کہ ان کے مسائل لسانیت کی بنیادوں پر حل نہیں ہوں گے بلکہ طبقاتی بنیادوں پر ان مسائل سے نمٹنا ہوگا۔

خواتین مزدوروں نے پوری دنیا میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی ہے۔ فروری 1998ء میں تقریباً ایک ملین خواتین نے ہڑتال کی جس میں زیادہ تر چائے کی کاشت کرنے والی خواتین شامل تھیں۔ [36] نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ خواتین کی تحریکوں نے منظّم مزدور تحریکوں کے ساتھ مل کر بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ کئی ممالک میں نہ صرف انہوں نے

ووٹ ڈالنے کا حق حاصل کیا بلکہ رات کے کام اور چائلڈ لیبر کا بھی خاتمہ ہوگیا' اوقات کار کم ہوگئے' تنخواہوں میں کافی حد تک اضافہ ہوااور صحت اور حفاظت کے لئے قانون سازی ہوئی۔ رفتہ رفتہ حکومتیں اس بات پر مجبور ہوگئیں کہ وہ عوامی فنڈ کو تعلیم اور صحت کے لیے خرچ کریں اور اس نے کافی حد تک محنت کش خواتین کے کندھوں پر بھاری بوجھ کو کم کر دیا اور وہ اس ذمہ داری سے فارغ ہو کر اس قابل ہوگئیں کہ گھر سے باہر کام کر سکیں جس نے ان کو مزید اعتماد بخشا۔(37)

نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ '' برطانیہ سے بولیویا تک' ہندوستان سے اٹلی تک ایسے محنت کشوں کی تحریکوں کو منظّم کرنے میں خواتین پیش پیش رہی ہیں ۔ان کے دباؤ کے باعث 1996ء میں 124 ممالک کے وفود پر مشتمل ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں گھر میں کام کرنے والوں کے حقوق' کم از کم تنخواہ اور حالات پر ایک معاہدے کی دستاویز منظور کی گئی۔(38) نازلی جاوید کا خیال ہے کہ خواتین کی شمولیت اور جدوجہد کے بغیر حقیقی اصلاحات مردوں اور عورتوں کے لیے حاصل کرنا ناممکن ہیں۔ عالمی سطح پر خواتین ٹریڈ یونین ممبر شپ کا ایک تہائی سے بھی زائد ہیں۔ جبکہ بعض جگہ یہ تعداد 50 فیصد تک ہے۔(39)

خواتین کے خلاف مظالم پر مزاحمت کی مزید مثالیں دیتے ہوئے نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ کئی بہادر خواتین نے اپنی جان داؤ پر لگا کر ظالمانہ فعل کے مرتکب افراد کے خلاف انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ایک نچلی ذات کی خاتون بھانوی دیوی نے گاؤں کے سردار کی طرف سے ایک سالہ بچی کو شادی کے لیے فروخت کرنے کے خلاف مزاحمت کی۔ اسے خاموش کرنے والے غنڈوں نے اسے اذیت دی اور اجتماعی جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں ایک خاتون کو بزرگوں کی طرف سے سزائے موت سنائے جانے پر روپوش ہونا پڑا اور سلیمہ نسرین نے اس واقعہ کی مزاحمت کرتے ہوئے کہا کہ عورتوں کی آزادی کے لیے مذہب کو ریاست سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔(40)

ایک اور مثال دیتے ہوئے نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ ہندوستان میں دو لاکھ خواتین نے چھ ہزار گروپوں میں تقسیم ہو کر' تعلیم اور یونین سازی کی جدوجہد کے دوران شراب کے خلاف حقیقی کامیابیاں حاصل کیں۔ شراب پی کر شوہر بیویوں کو مارتے تھے لہٰذا خواتین نے آندھرا پردیش کے ایک دو ہزار افراد پر مشتمل جلوس نے پولیس کا مقابلہ کیا اور اس بات پر

احتجاج کیا کہ عورت کو منڈی میں بکنے والی شے نہ سمجھا جائے۔ مزدور خواتین کی مزاحمت کی مزید مثالیں دیتے ہوئے نازلی جاوید کہتی ہیں کہ'' انہوں نے کئی ایسے مسائل پر تحریکوں میں حصہ لیا اور شروع کیں جو خواتین محنت کشوں کے لیے مشکلات کے سبب بنتے ہیں۔ برطانیہ میں بھی انھیں دو سال تک واٹر فرنٹ (Water Front) بہادر خواتین اور Hillingdon ہسپتال کے ہڑتالیوں کے ساتھ جدوجہد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ بھارت میں انھیں گارمنٹ کے مظلوم محنت کشوں کے ساتھ بڑے بھرپور طور پر محنت کش اور انسان کے طور پر حقوق کے لیے جدوجہد کا اعزاز حاصل ہے۔ مناسب تعلیمی سہولتے کی جدوجہد میں خواتین صف اول میں رہی ہیں ----- کئی سالوں سے جدوجہد میں خواتین کی شمولیت نے ان کے رویوں میں کئی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ انہوں نے کئی ایسی حقیقی اصلاحات حاصل کر لی ہیں جن کے باعث انہیں اپنی زندگی پر کسی حد تک کنٹرول حاصل ہو چکا۔ نومبر 1995ء میں پیرس میں 50,000 خواتین نے زبردست مظاہرہ کیا۔ کمیونٹی مہم جیسے محنت کشوں پر اضافی ٹیکسوں اور چارجز' نشہ آور ادویات اور نسل پرستی کے خلاف وہ اکثر اوقات قیادت کرتی نظر آئیں جبکہ محنت کشوں کی تنظیموں کے ساتھ مل کر انہوں نے ہسپتالوں' سکولوں اور نرسری کی بندشوں کے خلاف بڑی کامیاب مہموں میں حصہ لیا۔ سوشلزم کی جدوجہد میں کئی خواتین نے نمایاں مقام حاصل کیا اور اس بات کو واضح کیا کہ وہ اپنی نسل کے لیے انصاف کے حصول کے لیے کس قدر قربانیاں دے سکتی ہیں۔ فرانس میں غیر قانونی تارکین وطن کی بہادر خواتین نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ جب وقت کا تقاضا ہوا وہ اپنے بچوں کو پیٹھ پر باندھ کر بھی جدوجہد میں حصہ لے سکتی ہیں۔ (41)

نازلی جاوید کے مطابق پوری تاریخ میں خواتین بچوں کے ساتھ یا ان کے بغیر انقلابی اور گوریلا تحریکوں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں میں جاگیرداروں' فیکٹریوں کے مالکان اور مفاد پرست سیاستدانوں کے خلاف نفرت وحقارت کا جذبہ تھا۔ 1959ء میں تبت میں چین کے اقتدار کے خلاف ایک خاتون کی باغیانہ جدوجہد کا نتیجہ آخر کار خون کی صورت میں نکلا۔ میکسیکو میں Zaptibtas تحریک میں خواتین کی شمولیت ایک تہائی تھی۔ اس طرح فلسطین کی خواتین اسرائیل کے ظلم کے خلاف مسلسل سرگرم عمل رہی ہیں۔ (42) یہ بات قابل افسوس ہے کہ الجزائر سے لے کر فلسطین اور پاکستان تک خواتین اس لئے مایوس

ہوئی ہیں کہ آزادی کے بعد ان کے حقوق دوبارہ سلب کر لیے گئے۔ جب تک جنگ آزادی جاری رہی مردوں نے انھیں سڑکوں پر بھی نکالا' یہ جیل بھی گئیں اور پولیس کا تشدد بھی برداشت کیا' لیکن جیسے ہی آزادی حاصل ہوگئی' ان ممالک میں ایسے قوانین بنائے گئے جن کے مطابق عورت کا مقام گھر قرار دیا گیا اور ان کی شہری حیثیت نصف کر دی گئی۔ پدرشاہی خود کو نئے سرے سے تشکیل دیتی ہے' جب کوئی قوم یا لوگ جنگ آزادی میں مصروف ہوتے ہیں تو عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لڑنے کی ترغیب دی جاتی ہے کیونکہ تعداد اہم ہوتی ہے۔ تاہم جنگ آزادی جیت جانے کے بعد پدرسری کا عورتوں سے تقاضا ہوتا ہے کہ گھر کی چار دیواری میں لوٹ جائیں اور صرف ماں' بیوی اور بیٹی کے کردار خوش اسلوبی سے ادا کر کے قوم و ملک کی خدمت کریں اور قوم ملک کے لیے مجاہد' سپاہی اور مزدور پیدا کریں اور ان میں فرمانبرداری اور جان نثاری کی قدریں ٹھونس کر بھر دیں۔

فیکٹریوں اور دیگر پبلک جگہ پر خواتین کی جدوجہد سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مردوں کی ٹریڈ یونینیں خواتین کے مسائل اٹھانے سے گریز کرتی ہیں۔ وہ خواتین کے مخصوص مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ٹریڈ یونین اکثر بذات خود پدرسری کی اقدار سے لبریز ہوتی ہیں۔ مزدور اور ٹریڈ یونین کے مردوں میں بھی خواتین مزدوروں کی جانب وہی رویئے پائے جاتے ہیں جن کی آڑ میں مالکان' انتظامیہ اور باقی معاشرہ خواتین کا استحصال کرتے ہیں ۔اس طرح مزدوروں کی تحریک میں بھی پدرسری کی قدروں کو مستحکم کیا جاتا ہے جبکہ یہ بات خود مزدور تحریک کے لیے نقصان دہ ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مزدور تحریک کمزور ہوتی ہے اور اس میں اندرونی اتحاد کا فقدان ہو جاتا ہے۔عورتوں کی علیحدہ تحریک سے مزدور تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ مزدور آپس میں ہی صنفی بنیادوں پر بٹے نظر آتے ہیں۔ان بنیادوں پر ان کا تقسیم ہوجانا مالکان اور انتظامیہ کے حق میں ہوتا ہے جو اس تقسیم کو پدرشاہی کی اقدار کا واسطہ دے کر مزید بڑھاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر مزدور کے مفادات اور سرمایہ داروں کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ سے طبقاتی جدوجہد کمزور پڑتی ہے کیونکہ مزدور طبقے کے ایک حصے کے مفادات حکمران طبقوں کے مردوں سے مل جاتے ہیں۔ لہٰذا پدرسری کی اقدار طبقاتی کشمکش کو کمزور کرتی ہیں اور مزدوروں کو آپس میں تقسیم کرتی ہیں ۔ چنانچہ یہ بات بے حد اہم ہے کہ مرد مزدوروں کو پدر

سری کی اقدار کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور مردوں پر مبنی یونین کو پدر سری کے خطرے سے آگاہ کیا جائے۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ یونین خواتین کے مسائل اٹھائے گی اور دونوں مرد اور خواتین مزدور بطور طبقہ مستحکم ہوں گے۔ ورنہ اگر خواتین کی علیحدہ یونین یا کمیٹیاں بن گئیں تو یہ مزدور طبقے کی جدوجہد کو کمزور کریں گی۔ مزدوروں کو چاہیے خود کو ایک طبقہ تصور کریں اور آپس کی صنفی تفریق کو ختم کریں۔ صنفی امتیاز ختم کرنے سے مرد مزدور کمزور نہیں بلکہ مزید طاقتور ہوں گے کیونکہ ان کی جدوجہد میں خواتین کے شامل ہونے سے تعداد بھی بڑھے گی اور طاقت بھی ۔ اس ضمن میں صائمہ خان کے تاثرات اہم ہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ:

> ’’کام کرنے والی خواتین کے راستے میں سماجی وثقافتی تعصّبات اور غیر مساوی تعصّبات اور غیر مساوی تقسیم کار کی ساخت ہمیشہ سے حائل رہی ہے۔ ٹریڈ یونین خواتین کو اپنے معاملات میں شامل نہیں کرتیں جبکہ ٹریڈ یونین میں ان کی شمولیت اور فیصلے کرنے کی سہولت انتہائی ضروری جزو ہے۔ لیبر پارٹی پاکستان شعبہ خواتین کا موقف ہے کہ خواتین کو ہر شعبۂ حیات میں داخل ہونے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملنا چاہیۓ۔ جس کے لیے خاندانی، معاشرتی اور قانونی تعاون کی اشد ضرورت ہے۔‘‘(43)

لیبر پارٹی پاکستان کا یہ موقف قابل ستائش ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ خواتین کی شمولیت کے بغیر سوشلزم کی جدوجہد قطعی نامکمل ہے۔

گھر کی چار دیواری میں خواتین کی مزاحمت

خواتین نے نہ صرف باہر کی دنیا اور کام کی جگہ پر مزاحمت کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ گھر کے اندر بھی پدرسری کے ضابطوں کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ چونکہ خواتین کا دوہرا بوجھ ہوتا ہے اور ان پر ظلم نہ صرف کام کی جگہ پر بلکہ گھروں میں بھی ہوتا ہے، انہیں ہر سطح پر مزاحمت کرنا پڑتی ہے۔ یہ مزاحمت گھریلو پدرسری کے خلاف بھی ہوتی ہے اور کام کی جگہ پدرسری کے خلاف بھی۔

حمیرہ اختر' اس امر پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گھر کے کام اور باہر کے کام کا آپس میں رابطہ ہوتا ہے۔ عورتوں کا باہر کا کام گھریلو ذمہ داریوں کو متاثر کرتا ہے اور گھر کا کام باہر کی ذمہ داریوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حمیرا اختر کے مطابق اس رابطے کو توڑنے کے لیے خواتین کے پاس دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خاندان اور گھر والے ان خدمات کے لیے منڈی میں جائیں جو عورتیں گھروں میں بلامعاوضہ فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ بچوں کی دیکھ بھال' پکا پکایا کھانا اور دیگر قسم کی خدمات منڈی میں سستے داموں میسر ہوں یا ریاست ان کا انتظام کرے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ بنیادی انسانی ضروریات کو ترجیح دے اور پوری کمیونٹی ان ضروری کاموں میں شامل ہو جائے اور مرد بھی برابری سے گھریلو کاموں میں حصہ لیں تاکہ خواتین کا بوجھ کم ہو اور وہ کام کے علاوہ کمیونٹی کے کاموں اور سیاسی کاموں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ اس طرح خواتین مل کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ بانٹ سکتی ہیں اور ایک دوسرے کو صلاح ومشورہ دے سکتی ہیں اور اپنے تجربات کا تبادلہ کر سکتی ہیں۔ اگر یوٹیلیٹی سٹور زیادہ تعداد میں کھول دیے جائیں تو عام اشیاء سستے داموں مہیا کی جاسکتی ہیں۔ حمیرا اختر کہتی ہیں کہ سروس سینٹر بھی قائم کئے جاسکتے ہیں جہاں بینکوں میں سرمایہ بچانے کی تربیت فراہم کی جاسکتی ہے اور خواتین کو مل کر بچت کرنے میں مدد فراہم کی جاسکتی ہے۔ حمیرا اختر کے خیال میں اگر اس قسم کی خدمات میں اضافہ کر دیا جائے تو خواتین کا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے اور وہ آرام وتفریح کے علاوہ سیاسی مزاحمت کے کاموں میں حصہ لے سکتی ہیں۔(44)

گھریلو تشدد اور مسائل سے نمٹنے کے لیے کراچی کے ویمن ورکرز سینٹر نے بھی خواتین کے لیے خدمات کا انتظام کیا ہے۔ فرحت پروین اور کرامت علی کے مطابق اس سینٹر نے خواتین مزدوروں کے مابین اور مرد اور خواتین مزدوروں کے درمیان مکالموں کو فروغ دیا ہے تاکہ مزدور طبقہ بیرونی مسائل کے بوجھ تلے دب کر طبقاتی طاقت نہ کھو بیٹھے۔ اس مرکز نے حدود آرڈی نینس اور شریعت بل جیسے مسائل پر بھی خواتین کو آگاہ کیا اور معلومات فراہم کی ہیں کہ ایسے قوانین کا ان کی زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس مرکز نے بہت سے ایسے ایشوز پر ورکرز کو آگاہی دی جو طبقاتی صنفی اور انسانی بنیادوں پر غیر منصفانہ اقدام ہیں۔ اس مرکز کی مدد سے خواتین مزدوروں نے گھریلو تشدد کے خلاف مزاحمت کی اور موثر اقدامات کیے ہیں۔(45)

گھریلو تشدد کا مسئلہ مزدوروں کی تحریک کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ یہ اس تحریک کو تقسیم کر سکتا ہے اور طبقاتی کشمکش کو کمزور کر سکتا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے دونوں مرد اور خواتین مزدوروں کو منظّم کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ ''گھریلو برابری کے بارے میں زبانی کلامی تو بہت دعوے کیئے گئے مگر خواتین کو گھریلو کام سے صرف ایک دن ہی 8 مارچ کو چھٹی ملتی تھی اور اس دن انھیں تلافی کے طور پر پھول پیش کیئے جاتے تھے۔'' (46) نازلی جاوید کے مطابق سرمایہ داری نظام کے ظہور پذیر ہوتے ہی خواتین کو بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا مثال کے طور پر وسیع بیروزگاری' ریاستی تحفظات کا خاتمہ' فحش نگاری میں دن بدن اضافہ' تشدد' عصمت فروشی اور پناہ گزینوں کے ساتھ تشدد ۔ یہ ان ممالک میں ہوا جہاں تیزی سے سرمایہ داری نظام رائج کرنے کی کوشش کی گئی مثال کے طور پر تھائی لینڈ' انڈونیشیا' سنگاپور' ملائشیا اور جنوبی کوریا۔ وہاں پر آزاد منڈی کی عالمی معیشت اور عالمی مالیاتی ادارے کے ساختیاتی ردو بدل کے پروگرام نے عورتوں کے مسائل میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ ان پر گھریلو تشدد اور جنسی ظلم میں شدید اضافہ ہوا۔

نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ عورتوں کو جہاں کام کی جگہ پر دوسرے مزدوروں اور انتظامیہ کی طرف سے جنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے' وہاں گھروں میں بھی بے حد جنسی تشدد کا نشانہ عورتوں کو ہی بنایا جاتا ہے۔ برطانیہ میں کمیٹی فار ورکرز انٹرنیشنل نے گھریلو تشدد کے خلاف کامیاب مہم چلائی اور اسے ٹریڈ یونین میں بھی ایشو بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ کل خواتین میں سے کم از کم ایک تہائی گھروں میں جسمانی تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ امریکہ میں ہر 18 منٹ کے بعد ایک خاتون کو گھریلو تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روس میں قتل کی گئی خواتین کی تعداد جو 1991ء میں 5300 تھی' صرف دو سال کے بعد 1993ء میں 14000 تک پہنچ گئی۔ ہر طبقے کی خواتین گھریلو تشدد کا نشانہ بنتی ہیں اور اس صورتحال کو بدستور رکھنے کی غرض سے مذہب و روایت کا بھرپور سہارا لیا جاتا ہے۔ نازلی جاوید لکھتی ہیں کہ مذہب اور نظریات خاندان میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے مرد کی برتری کا جواز اور حکمرانوں کے عزت و احترام کا جواز پیش کرتے ہیں۔'' (47)

گھریلو تشدد وہ خواتین زیادہ برداشت کرتی ہیں جن کا کوئی اپنا ذریعہ معاش

نہیں ہوتا۔ تاہم معاشی طور پر خود مختار خواتین بھی اس قسم کے تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ خواتین کے لیے ایک پر تحفظ رہائش گاہ کی بے انتہا ضرورت ہے جہاں پر وہ بے خوف و خطر زندگی گزار سکیں۔ تاہم منافع خوری پر مبنی معاشی نظام اس قسم کے کاموں پر سرمایہ کاری کیوں کرے گا جو خواتین، بچوں، مزدوروں اور کسانوں کو تحفظات فراہم کریں اور سماجی خدمات کا انتظام کریں؟ ان امور پر وسائل خرچ کرنا سرمایہ دارانہ ریاست کو مہنگا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بنیادی حقوق ہیں۔ ان حقوق کے لیے خواتین کو مزید جدوجہد جاری رکھنا ہوگی۔

ہم نے دیکھا کہ دنیا بھر میں مزدور خواتین نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی اور گھر اور باہر دونوں جگہ پر ظلم کے خلاف اجتماعی اور انفرادی سطح پر مزاحمت کی۔ اب چند خواتین کی کہانیاں بیان کی جا رہی ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طرز کی مزاحمت کی۔ ان سب کا تعلق صنعت اور خدمات کے شعبے سے ہے۔

شکیلہ۔ عمر 30 برس

''میری عمر 30 برس ہے، میرا ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ میں واپڈا میں ملازمت کرتی ہوں۔ میں شروع ہی سے خود کمانا چاہتی تھی اور نوکری کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے ٹائپ کرنا سیکھا۔ جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے میں ایک ٹریول ایجنسی کے ساتھ کام کرتی تھی۔ صبح جب ویگن لیتی تھی تو ڈرائیور مجھ سے بہت برا سلوک کرتا تھا کیونکہ میں غریب عورت تھی۔ وہ مجھے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ڈرائیور کی کوشش ہوتی تھی کہ ہم غریب عورتوں کو ویگن کی پچھلی سیٹوں پر دھکیل دے۔ اس طرح ہمیں مردوں کے ساتھ بیٹھنا پڑتا تھا۔ بس کے اڈے پر بھی مرد ہم عورتوں پر آوازے کستے تھے اور مذاق اڑاتے تھے۔ اکثر وہ کہتے کہ کام کرنے والی عورت بدکردار ہوتی ہے۔ میں یہ سب کچھ نظر انداز کر کے کام کرتی رہی۔ لیکن ایک دو مرتبہ میں نے انہیں سنا دی تو وہ چپ کر گئے۔ کام کرنے والی عورت، جو کہ غریب بھی ہو، بہت مصیبتیں جھیلتی ہے۔''

'' کام کی جگہ پر بھی ہمارے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے۔ مرد تو جب چاہیں کام کے بہانے دفتر چھوڑ کر باہر گھومتے پھرتے ہیں ہم عورتوں کو تحریری درخواست دینا پڑتی ہے کہ ہم کیوں جا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔ ایک گھنٹے کے لیے

بھی جانا ہو تو لمبی چوڑی درخواست دینا پڑتی ہے ۔ ایک گھنٹے کی چھٹی میں بھی ہمارے تنخواہ کاٹ لیتے تھے۔ پورے دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔ ہم نے یونین سے بات کی تو اب ہمیں صرف سیکشن افسر کو بتانا ہوتا ہے اور تنخواہ نہیں کٹتی لیکن تحریری درخواست اب بھی دینا پڑتی ہے۔ مردوں کے لیے بالکل علیحدہ رولز ہیں کیونکہ وہ بنا درخواست دیئے جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔''

''میں پانچ برس سے یونین کی ایگزیکٹو کمیٹی کی رکن ہوں۔ ایک مرتبہ اکاؤنٹ اور بجٹ افسر نے مجھ سے منفی رویہ اختیار کیا اور بدتمیز ہوگیا۔ اس نے چپراسی کو منع کر دیا کہ میرا بتایا ہوا سرکاری کام نہ کرے۔ وہ چپراسی سے اپنے ذاتی کام کرواتا تھا۔ میں نے شور مچایا' مینجر سے بات کی تو اس کا تبادلہ ہوگیا۔ چپ کر کے بیٹھ جانا غلط ہوتا ہے' انسان کو کچھ کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس ہے کہ سیاسی جلسے اور جلوسوں میں صرف یونین کے مرد جاتے ہیں۔ اگر عورتیں ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیں تو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایک طرف ہم سے کہا جاتا ہے کہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرو' دوسری طرف معاشرہ وہ مقام ہی نہیں دیتا اور ہمیں دوسرے درجے کے شہری بنا دیتا ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ دوسرے ورکرز کی طرح شہر سے باہر فیلڈ میں جاؤں لیکن مجھے کہا گیا کہ چونکہ میں عورت ہوں' مجھے شہر سے باہر کے کاموں پر نہیں بھیجا جاسکتا۔''

''جب مجھے کوئی غلط بات کہتا ہے' چاہے گھر پر یا باہر کام پر' مجھے بہت برا لگتا ہے۔ پہلے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں یا جا کر سو جاتی ہوں لیکن پھر پریشانی سے میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ پھر میں بھڑک اٹھتی ہوں اور آگے سے سنا دیتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ افسر ہمیں انسان کی طرح دیکھیں اور بے جان چیز نہ سمجھیں۔''

شکیلہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پدر سری نظام کی قدریں صرف گھر اور خاندان تک ہی نہیں بلکہ کام کی جگہ پر بھی کوٹ کر بھری ہیں۔ بالکل گھروں کی روایت کی طرح عورتوں کو باہر جانے کے لیے اجازت لینا پڑتی ہے جبکہ مرد کارکن بہ آسانی باہر نکل جاتے ہیں اور کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ اور گھروں ہی کی طرح عورتوں کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی جبکہ مرد آسانی سے فیلڈ ورک کے لیے شہر سے باہر جاتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے جلوس جلسے میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے چاہے ہو یونین کی ممبر ہی

کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ان کی مزاحمت کے انداز بدل جاتے ہیں اور مردوں کے شانہ بشانہ حقوق کی جنگ لڑنے کی بجائے ان کی جنگ علیحدہ ہو جاتی ہے اور وہ علیحدہ جدوجہد پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ پدرسری نظام طبقاتی یکجہتی کو کمزور کرتا ہے کیونکہ مزدور طبقے کے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اس طبقے کی مضبوطی کو کم کرتا ہے اور مزدوروں کی جدوجہد کو تقسیم کر دیتا ہے۔ لہٰذا پدرسری اقدار کا فائدہ مالکان اور حکمرانوں کو ہوتا ہے، مزدوروں کو نہیں۔

ناہید۔ عمر 24 برس۔

"میں شیخوپورہ میں ایک عطر بنانے والی فیکٹری میں کام کرتی ہوں۔ میرے شوہر اکثر بے روزگار رہتے ہیں۔ میری ایک بیٹی ہے۔ جب میں نے کام شروع کیا تو میرے بھائی نے سخت مخالفت کی میرا خرچہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ میری ماں کو میرے معاشی حالات کا پتا تھا۔ اس لیے انھوں نے میری حمایت کی اور میں کام کرنے لگی۔"

"جب میں نے نوکری کے لیے درخواست دی تو فیکٹری والوں نے مسترد کر دی کیونکہ میں شادی شدہ تھی۔ میں نے دوسری دفعہ درخواست دی تو اس بات کو چھپا لیا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ انتظامیہ کو ابھی تک معلوم نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میری ایک بچی بھی ہے۔ اب میں وہاں دو سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ میری والدہ میری بچی کو سنبھالتی ہیں۔"

"ایک مرتبہ یونین کے لوگ میرے محلے اور گھر میں آگئے تاکہ جان لیں کہ میں واقعی غیر شادی شدہ ہوں یا نہیں۔ لیکن گھر والوں اور دوستوں کی مدد سے میں نے یہ بات ان سے چھپا لی۔ یونین بھی انہی کی ہے اور ان کی ہی مدد کرتی ہے۔ جیسے ہی کوئی کارکن عورت کوئی مسئلہ اٹھاتی ہے، یونین کے حضرات اس کی کردار کشی شروع کر دیتے ہیں۔ ایک لڑکی نے یونین بنانے کی کوشش کی تو ایک دم سے واہیات خط آنے شروع ہوگئے۔ اسے افسران نے طلب کر لیا اور خط لکھنے والے مرد کو بھی اور اس لڑکی پر خوب الزام تراشی کی گئی۔ آخر اسے مجبوراً نوکری ترک کرنا پڑی حالانکہ اس کی معاشی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ ہم نے ایک مہینہ اس کی مسلسل مدد کی لیکن کیا کریں ہم تو خود دال روٹی کے جھمیلوں میں پھنسے ہیں۔

MashalBooks.org

اب ہمیں معلوم نہیں کہ اس کا کیا حال ہے۔''

''مجھے اس بات پر بے پناہ غصہ آتا ہے کہ میں عورت ہوں۔ اگرچہ ہماری سپروائزر خود ایک عورت ہے لیکن وہ بے حس ہمارے مسائل نہیں سمجھتی۔ وہ ہر وقت ڈانٹتی ہے اور ہمیں انسان تصور نہیں کرتی۔ اگر پیکنگ کرتے ہوئے کوئی شیشی گر کر ٹوٹ جائے تو طوفان برپا کر دیتی ہے۔ جب مجھے کام کی جگہ پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے تو میں اپنی میز پر گھنٹوں کھڑی رہتی ہوں اور کوئی کام نہیں کرتی۔ اس طرح مجھے آرام بھی میسر آ جاتا ہے اور اطمینان بھی۔ مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ مالکان کے میرے وہاں ہونے کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور اس کے بدلے میں انھیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''میں پڑھنا چاہتی ہوں اور بی۔ اے کرنا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی زندگی کے حالات بہتر کرلوں۔ میرا بس چلے تو بیٹی کو خوب خوب پڑھاؤں' اسے لڑکا بنا دوں۔ میرے شوہر بیٹا چاہتے ہیں لیکن میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کروں گی۔ سارا بوجھ مجھ پر پڑتا ہے۔ میرے شوہر کوئی مدد نہیں کرتے۔ میں کماتی ہوں اور پھر گھر اور بچوں کو بھی دیکھتی ہوں۔ اکثر سوچتی ہوں یہ بھی کوئی زندگی ہے؟''

ناہید کی باتوں سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ انتظامیہ اور مالکان طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں تاکہ عورتیں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد نہ کر سکیں۔ جیسے ہی عورتیں اپنی آواز اٹھانے کے لیے متحد ہو کر یونین بنانا چاہتی ہیں ان کی کردار کشی شروع ہو جاتی ہے اور ان پر گندے الزام لگا دیئے جاتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے موت کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ پدرسری خود کو ہر طبقے کے مردوں میں ظاہر کرتی ہے اور عورتوں کے معاملے میں متصادم طبقوں کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے لہٰذا یونین کے ممبر مرد' جن کی یکجہتی خواتین مزدوروں کے ساتھ ہونی چاہئے' عورت کے معاملے میں مالکان کے اوزار بن جاتے ہیں۔ پدرسری کی طاقت طبقاتی جڑوں کو کاٹتی نظر آتی ہے۔ ناہید کی کہانی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پدرسری قدریں کس حد تک خود عورتوں نے اپنا لی ہیں۔ ان کی سپروائزر کا رویہ مرد سپروائزروں سے مختلف نہیں اور سپروائزر کا شعور طبقاتی کشمکش کو فراموش کر کے مالکان کے ساتھ وفاداری کا شعور ہے۔ لیکن ناہید کی کہانی مزاحمت کی کہانی بھی ہے۔ چاہے عورتیں یونین نہ بھی بنا سکیں' جلسے جلوس میں نہ بھی جا سکیں' وہ کام کی جگہ پر ہی کام نہ کر کے

پیداواری عمل کو سست کر سکتی ہیں۔ یہی ان کی مزاحمت کا انداز بن جاتا ہے۔ یہ انفرادی مزاحمت ہی سہی لیکن اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عورت محض مظلوم اور غیر متحرک ہستی نہیں بلکہ ایک فعال شخص ہے جس کے دل میں باغی جذبات ٹھاٹھیں مارتے ہیں۔ ناہید کے بھائی کا رویہ بھی قابل ذکر ہے وہ نہ اسے کام کی اجازت دینا چاہتے تھے اور نہ اس کی کفالت کرنے پر تیار تھے۔عورت کے کام کرنے سے ان کی انا مجروح ہوتی ہے لیکن اس کا بھوکا مرنا قبول ہے۔

قدسیہ۔عمر 25 برس

''میں چمڑے کی جوتے بنانے والی فیکٹری میں کام کرتی ہوں۔ مجھے طلاق ہوچکی ہے۔ میر شوہر مجھے مار اپیٹا کرتا تھا۔ مار پیٹ کی وجہ سے میرا حمل گر گیا تو میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہر وقت مطالبہ کرتا تھا کہ اپنے والدین سے رقم لا کر دوتا کہ کاروبار شروع کر سکے۔ اس کا کوئی کاروبار نہیں چلتا تھا۔۔ وہ مجھے بری طرح زخمی کر دیا کرتا اور پھر ملازمت کرنے کو کہتا۔ میری مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پہلے تو میرے بھائیوں کو میرے حالات کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا لیکن جب پتا چل بھی گیا تو انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ ہر کوئی کہتا تھا کہ مطلقہ عورت بری ہوتی ہے۔ جب میں میاں کو چھوڑ کر گھر آ گئی تو میرے گھر والے حیران رہ گئے کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے بارے میں ان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے میاں کو اس وقت چھوڑا جب اس نے میری ٹانگ توڑ دی کیونکہ وہ کہتا تھا کہ بھائیوں سے کہو کہ اسے کار خرید کر دیں اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ سسرال والوں نے میرا جہیز ضبط کر لیا۔ چھ مہینے میں ہسپتال میں رہی۔ میری ماں نے میری دیکھ بھال کی۔ میرے بہنوئی نے پولیس میں مقدمہ درج کرانے کی مخالفت کی' لہٰذا وہ نہیں ہوسکا۔''

''میں ایک چمڑے کی فیکٹری میں کام کرتی ہوں جہاں کپڑے اور جوتے بنائے جاتے ہیں۔ وہاں مرد اور عورتیں دونوں کام کرتے ہیں ۔ ہم روزانہ آٹھ گھنٹے سے زائد کام کرتے ہیں۔ہمیں اس دوران صرف 15 منٹ کا وقفہ ملتا ہے۔غسل خانے جانے کے لیے صرف ایک منٹ دیا جاتا ہے۔غسل خانے کا تو راستہ ہی 5 منٹ کا ہے' ہم ایک منٹ میں

واپس کیسے آئیں؟ اور پھر غسل خانے کے باہر لمبی لائن لگی ہوتی ہے۔ اگر کارکن دیر لگا کر واپس آئیں تو انہیں نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ظالمانہ ضابطوں کے خلاف مزاحمت جب ہی ممکن ہے کہ یونین بنائی جائے۔ میں نے یہ تجویز دی تو دوسرے ورکرز نے مالکان کو بتا دیا۔ وہ بے حد ظالم آدمی ہے۔ جب بھی اسے پتا چلتا ہے کہ ورکرز یونین بنانے کے متعلق سوچ رہے ہیں، وہ مردوں کا منہ کالا کر کے انہیں گدھے پر بٹھا کر نکال دیتا ہے۔ عورتوں کے کیس میں وہ ہر طرف پوسٹر لگا دیتے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ برے کردار کی مالک ہے۔ مجھے طلب کر کیا گیا اور کہا گیا کہ میں ورکرز کو بھڑکا رہی ہوں۔ میں نے نوکری بچانے کے لیے جھوٹ بول دیا۔ اب ہم کھانے کے وقفے کے دوران ہی غسل خانے جاتے ہیں۔ کاغذوں پر کھانے کا وقفہ آدھ گھنٹہ لکھا ہے جو قانون کے مطابق لازمی ہے لیکن ہمیں صرف 15 منٹ دیئے جاتے ہیں، اسی دوران باتھ روم بھی جانا ہوتا ہے۔''

''کئی دفعہ میں نے والدہ اور بھائیوں سے کہا کہ مجھے چیزیں وغیرہ گھر پر ہی لا دیا کریں تاکہ میں گھر میں بیٹھ کر کام کرلوں لیکن وہ میری مدد پر رضامند نہیں۔ میں مردوں کی اس دنیا سے ہر وقت خوفزدہ رہتی ہوں۔ وہ بغیر کسی وجہ کے مار پیٹ پر اتر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے کیونکہ وہ مرد ہیں۔''

قدسیہ کی کہانی سے انتظامیہ کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے رجسٹر میں کھانے کا وقفہ 30 منٹ لکھ رکھا ہے اور دیتے صرف 15 منٹ ہیں جس میں ایک انسان بمشکل کھانا کھا سکتا ہے۔ ان ورکرز کو اسی دوران باتھ روم بھی جاتا ہوتا ہے۔ گھنٹوں پر پھیلے کام میں صرف 15 منٹ کا وقفہ غیر انسانی ہے لیکن سرمایہ داری نظام ورکرز کو انسان نہیں، مشین کے پرزے ہی سمجھتا ہے۔ ورکرز کی ہر حرکت پر نظر رکھنا اور ان کے وقت کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ رکھنا مینجمنٹ سائنس کے اصولوں کے مطابق ہے، جہاں مزدور کے جسم سے مشین کی سی پھرتی اور چستی درکار ہوتی ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک لمحے کو گنا جاتا ہے کہ کہیں وہ وقت ضائع نہ کرے اور منافع متاثر نہ ہو۔ یونین بنانے والے ورکرز کی تذلیل بھی ان ظالمانہ ہتھکنڈوں کی بدترین مثال ہے کیونکہ ایسے طریقے جابر اور ظالم بادشاہ اپنے مخالفین پر استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن ان ظالمانہ ہتھکنڈوں کے باوجود قدسیہ کی زندگی کے مختلف مراحل پر مزاحمت نظر آتی ہے۔ ظالم و جابر شوہر سے طلاق لینا

MashalBooks.org

مزاحمت کی نشانی ہے حالانکہ اس معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کو بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کام کی جگہ پر غسل خانے کے رولز کے خلاف یونین بنانے کی کوشش بھی اس کی فطری مزاحمت کی نشانی ہے۔لیکن حالات اور انتظامیہ کی طاقت کے آگے قدسیہ نے شکست کھائی کیونکہ انتظامیہ اور مالکان کے قبضے میں ذرائع پیداوار ہوتے ہیں جن سے وہ لیبر کو علیحدہ کر سکتے ہیں اس طرح لیبر پر ان کا کنٹرول رہتا ہے۔ اس کیس میں بھی عورت کی کردار کشی دکھائی دیتی ہے کیونکہ انتظامیہ اور فیکٹری مالکان کو معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے کردار پر داغ برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی پوری زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کردار کشی پدرانہ نظام کو موثر ترین ہتھیار بن جاتی ہے۔

نبیلہ۔عمر 19 برس۔

'' میں شیخوپورہ روڈ پر جوتے بنانے کی فیکٹری میں کام کرتی ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ شروع میں تو مالکان مجھے پیس ریٹ پر اجرت دیتے تھے لیکن جب انہوں یہ دیکھا کہ میں بہت زیادہ جوتے بنالیتی ہوں تو میری ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ جو تیزی سے کام کرتے تھے ان سب کے ساتھ یہی ہوا۔ ہم میں سے کچھ لوگ انتظامیہ کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں پیس ریٹ پر رکھ لیا جائے تو اس نے انکار کر دیا اور ہماری تنخواہ 1600 روپے ماہانہ کر دی جبکہ یہی کام کرنے والوں مردوں کو 3000 روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ انہوں نے مجھے سپروائزر بنا دیا۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میں فیکٹری کا نقصان کر رہی ہوں کیونکہ میں نے انتظامیہ سے درخواست کی تھی کہ زیادہ کام کرنے والے کارکنوں کی اجرت بڑھا دی جائے۔ ہم پر جرمانے بھی لگائے جاتے ہیں اور چھٹی کرنے کی تنخواہ بھی کاٹ لی جاتی ہے۔ اب انہوں نے ایک مرد کو سپروائزر بنا دیا ہے جو عورتوں کے مسائل بالکل نہیں سمجھ پاتا۔''

''میرے بھائی نے زبردستی میری شادی میرے کزن سے کر دی۔ میں نے بہت مخالفت کی لیکن میری ایک نہ چلی۔ اب مجھے نبھانا پڑ رہا ہے۔''

'' اس فیکٹری کی یونین مالکان سے ملی ہوئی ہے۔ میں نے یونین میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن میری کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ ایک دفعہ جب ہمارے مرد سپروائزر نے جرمانہ لگایا تو عورتوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دھمکیاں دینا شروع کر

دیں۔ ساتھ ہی اس نے ہم پر دست درازی اور جنسی ہراسانی شروع کر دی۔ ایک ورکر کو نکال دیا گیا۔ کچھ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ٹکے رہیں۔ ہم سب بھی جو چھوڑ گئے تھے نوکری پر واپس آ گئے۔ درمیانی انتظامیہ کی کوشش رہتی ہے کہ ہم مالکان سے براہ راست اپنے مسائل پر بات نہ کر پائیں۔ مالکان اکثر انتظامیہ کے مقابلے میں زیادہ ہمدرد ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمیں ان سے دور رکھتے ہیں۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی بات پر سزائیں دیتے ہیں۔ پورا دن ہمیں تپتی دھوپ میں کھڑا کر دیتے ہیں۔''

''جب تک ساری عورتیں مل کر آواز نہیں اٹھائیں گی' کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ میں نے کئی مرتبہ عورتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن نوکری چلے جانے کے خوف سے وہ پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔''

''میرے والد میرے نوکری کرنے کے بہت خلاف تھے۔ لیکن میں نے انہیں اردگرد کی مثالوں سے رضا مند کر لیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں کبھی گھر کی عزت پر حرف نہ آنے دوں گی۔ عورتوں کو نوکری کرنے کے لیے بھی ہر وقت عزت کی پروا کرنی پڑتی ہے کیونکہ معاشرہ ایسا ہے۔''

''ہمیں اکثر کام کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ اوور ٹائم کی اجرت یا تو ملتی ہی نہیں یا بہت کم ملتی ہے۔ ایک دفعہ چوکیدار نے ہماری بہت بے عزتی کی۔ میں سیدھی مالک کے پاس پہنچی اور شکایت کر دی۔ مالک نے چوکیدار کو ڈانٹا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد وہاں کے مردوں نے میری کردار کشی شروع کر دی۔ یہ ان کا سب سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔ یہ ہتھیار آدمی خصوصاً ان عورتوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں جو صاف گو اور منہ پھٹ ہوتی ہیں۔ انہیں کنٹرول کرنے کے لیے یہ ایک مؤثر طریقہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ یونین ایک مزدور لڑکی کے گھر بغیر اطلاع دیئے پہنچ گئی۔ یونین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس کو کسی مرد کے ساتھ برے کام میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اسے بے پناہ مارا پیٹا۔ یونین کا خیال ہے کہ مزدور خواتین کی کام کی جگہ کی زندگی اور نجی زندگی دونوں ان کی ذمہ داری ہیں۔ انسان کس پر اعتبار کرے۔''

نبیلہ کی کہانی سے گھر اور باہر کی دنیا میں پدرسری کی حاوی اقدار کی جھلک واضح طور پر ملتی ہے۔ اس کے بھائی نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کر دی' انتظامیہ اور مزدور

مردوں نے کردار کشی کی' یونین کے مردوں نے مارا پیٹا' چوکیدار نے بدتمیزی کی' حتی کہ ہر قسم کا ستم اس پر ڈھایا گیا۔ نبیلہ نے یونین بنانے کی کوشش کی تو معاشی بدحالی کے خوف سے دوسری خواتین پیچھے ہٹ گئیں۔ مالکان اور حکمران طبقے معاشی بد حالی کے خوف کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور خود ہی یہ بد حالی پید کرتے ہیں تا کہ ورکرز خوفزدہ اور فرمانبردار رہیں۔ یونین' جو ورکرز کے حقوق کے لیے بنائی جاتی ہے' خود پدرسری کی اقدار کو مزید مستحکم کرنے میں ملوث ہوتی ہے اور ورکرز کی یکجہتی اور مزاحمت کو توڑ کرنے میں پیش پیش ہوتی ہے۔

رخسانہ۔عمر 31 برس

''میں گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے کا کام کرتی ہوں ۔ میری سلائی کی مشین اپنی ہے۔ مجھے ایک شلوار سینے کے 2 روپے ملتے ہیں۔ میرا میاں رکشا چلاتا ہے میرے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے ۔ گھر اور بچوں کو میں خود سنبھالتی ہوں۔ میرے میاں کی آمدن کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی ہوتی ہے' کبھی نہیں۔ جب میں کام کر رہی ہوتی ہوں اور کوئی بچہ کھانا مانگتا ہے تو مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ اگر میاں سے شکایت کروں کہ میں بہت تھک گئی ہوں اور مجھ پر بوجھ بہت زیادہ ہے تو وہ کہتا ہے کہ بے شک چلی جاؤ۔ میں اپنا غصہ بچوں کو مار پیٹ کر نکالتی ہوں۔ ایک دفعہ میرے میاں نے مجھے بہت سخت مارا کیونکہ میں نے اس کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں پر سوال اٹھایا تھا۔ میں گھر چھوڑ کر چلی آئی۔ چھ مہینے تک اپنی والدہ کے پاس رہی۔ پھر میرا شوہر مجھے واپس گھر لے آیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے کبھی نہیں مارا۔ کبھی کبھی کہتا ہے کہ اپنے والدین سے ہزار دو ہزار لے کر آؤ۔ اس بات پر مجھ سے لڑتا بھی ہے۔ لیکن میں انکار کر دیتی ہوں۔''

''جب سے میرا تعلق مزدوروں کے حقوق کی تنظیم سے ہوا ہے میں خوش ہوں۔ وہ مجھے کام کے مسائل اور شوہر سے نمٹنے کے بارے میں سکھاتے ہیں۔ شروع شروع میں میرا میاں میرے ساتھ بہت زیادہ گالی گلوچ کرتا تھا لیکن جب سے میں چار دیواری سے باہر نکل آئی ہوں وہ کچھ سدھر گیا ہے۔ شروع شروع میں وہ میرے پیسے لے جایا کرتا تھا لیکن اب میں جھوٹ بول کر اپنے پیسے بچا لیتی ہوں۔ میں جب عورتوں کے حقوق کی ورکشاپ میں آتی ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے۔''

'' پہلے پہلے میں سوچا کرتی تھی کہ اگر میں نے یہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے' لیکن اب میں ان باتوں سے بالکل پریشان نہیں ہوتی۔ اب مجھے پروا نہیں کہ کوئی کیا کہتا ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں کچھ غلط نہیں کر رہی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے والدین کو میرے حالات کا پتا چلے اور وہ رنجیدہ ہوں۔ میرے میاں بالکل اَن پڑھ ہیں۔ میری تعلیم میٹرک تک ہے۔ میں طلاق نہیں لینا چاہتی کیونکہ لوگ طلاق یافتہ عورتوں کو برا سمجھتے ہیں۔''

'' کئی دفعہ گاہک مجھ سے بری طرح بولتے ہیں۔ میں گھر جا کر روتی ہوں۔ اگر میں غصہ دکھاؤں تو مجھے کام نہیں ملے گا۔ اتنی بے روزگاری ہے کہ میں اگر آرڈر نہیں لوں گی تو کوئی دوسرا لے لے گا۔ میرا خیال نہیں ہے کہ میرے بچے کبھی میرا ساتھ دیں گے یا میری کفالت کریں گے۔ لوگ کہتے ہیں جیسا باپ ویسا بیٹا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ کئی دفعہ میرا دل کرتا ہے کہ خود کو مار لوں' خودکشی کر لوں۔ یہ کیا زندگی ہے کہ ہر وقت یہی فکر رہے کہ بچوں کو شام کا کھانا دے سکوں گی کہ نہیں۔ لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیتی ہوں سوچتی ہوں کہ میرے بعد ان بچوں کو کون سنبھالے گا۔''

'' ایک دفعہ جب میں کام ڈھونڈنے نکلی تو اپنے دس سالہ بچے کو گھر کی ذمہ داری سونپ گئی۔ وہ کھیلنے کودنے نکل گیا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے اسے مارا پیٹا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ میں کام پہ نکلوں اور وہ کھیلنے نکل جائے۔ کما کر لانا اور مجھے دینا اس کا فرض ہے' اب دس سال کا ہوگیا ہے۔ لیکن کیا کروں مجھے خود ہی سب کچھ کرنا ہے۔ میری مدد کون کرے گا؟''

رخسانہ کی کہانی میں بہت رنج و الم کے علاوہ مزاحمت بھی ہے اور کچھ تضادات بھی ہیں۔ اس نے شوہر کے مارنے پیٹنے پر گھر چھوڑ کر مزاحمت کا اظہار کیا' دوسروں کی باتوں کی پروا نہ کرنا بھی مزاحمت ہے۔ لیکن ساتھ ہی تضاد بھی نظر آتا ہے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طلاق لے کیونکہ اسے دوسروں کی باتوں کی فکر تھی۔ چنانچہ اس کے اندر وہ کشمکش نظر آتی ہے جو بنیادی طور پر ہر شخص کے اندر موجود ہوتی ہے۔ وہ بغاوت بھی کرنا چاہتی ہے اور ہتھیار بھی ڈال دیتی ہے۔ یہی کشمکش اس کے خودکشی کے جذبات میں بھی موجود ہے۔ خودکشی بھی ایک طرز کی مزاحمت ہی ہے یہ ایک قسم کا احتجاج ہے جس کے ذریعے انسان اپنی زندگی پر اپنے اختیار کا اعلان کرتا ہے اور اپنے انسان ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ خود کو ختم

کر لینے میں بھی ایک فتح ہوتی ہے۔ رخسانہ خود کو ختم کر لینا بھی چاہتی ہے لیکن ساتھ ہی بچوں کی دیکھ بھال کے خیال سے ڈر جاتی ہے۔ اس کے اندر ایک بحران ہے جو تضادات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ تمام قربانیاں بچوں کے لیے دیتی ہے لیکن غصہ بھی بچوں پر نکالتی ہے اور انہیں مارتی بھی ہے۔ غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے مزدور طبقے کی خاندانی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خاندان میں آرام' سکون' خوشی اور پیار ملتا ہے اور بچوں کے لیے کھیلنا کودنا اچھا ہوتا ہے۔ لیکن غربت اور افلاس کی مجبوریوں کے بوجھ تلے یہ خراب ٹوٹ کر چکنا چور ہوجاتے ہیں۔ بچوں سے مشقت کی توقع کی جاتی ہے اور ہر قسم کے مصائب کا غصہ انہیں مار پیٹ کر نکالا جاتا ہے۔ میں بیوی کی باہمی کشیدگی بھی بھوک اور افلاس کا نتیجہ ہے اور اس کا اثر پورے کنبے پر پڑتا ہے۔ ایک دفعہ پھر یہی بات نظر آتی ہے کہ پدرسری کی روایت خاندان کو بھی توڑ دیتی ہے اور ان میں تشدد اور ظلم کو جنم دیتی ہے اور یہی روایت مزدور طبقے کے اتحاد اور یکجہتی کو کمزور کرتی ہے۔

سہیلہ۔ عمر 31 برس۔

مجھے طلاق ہوچکی ہے' میری ایک بیٹی ہے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہوں اور واپڈا میں کام کرتی ہوں۔ میں نے معاشی حالات کی وجہ سے کام شروع کیا۔ طلاق کے بعد مجھے اپنی بیٹی کی کفالت کی خاطر کام کرنا پڑا۔ محلے والے مجھے بہت بری نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں نے طلاق لے لی۔ پھر ہمارے محلے میں کام کرنے والی عورت کو بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ مجھے لوگوں کی حقارت سے بھرپور نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ مردوں کے ہمراہ کس طرح کام کرنا ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے والی عورتوں نے میری بہت مدد کی۔ اب مجھ میں بہت اعتماد پیدا ہوگیا ہے۔ اگر افسران بالا کوئی غلط بات کریں تو میں ایک دم سوال کرتی ہوں اور ڈرتی نہیں ہوں۔ ہمارے ہاں اگر مزدوروں کو کسی کام سے باہر جانا پڑے تو انہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں تحریری اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں مردوں کا پلہ بھاری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کے ٹھیکیدار ہیں۔ جب عورت گھر سے نکلتی ہے اور اس کے برابر کام کرتی ہے تو شعوری یا لاشعوری طور پر وہ اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''میں یونین کی ممبر ہوں ۔یونین کی ہر میٹنگ میں جاتی ہوں۔ یونین ہمیں اپنے حقوق حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے' خاص طور پر بدعنوان افسروں کے خلاف ۔لیکن یونین کے مرد ہمیں جلوسوں میں ساتھ نہیں لے جاتے ۔ ہم انہیں اپنے مسائل بتا دیتے ہیں اور وہ ہماری ترجمانی کرتے ہیں۔''

''جب کوئی مرد افسر کام سے غیر حاضر ہو یا شہر سے دور جائے تو خواتین افسران کو اس کا کام کرنا پڑتا ہے۔لیکن اگر کوئی عورت غیر حاضر ہو تو کسی مرد سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ اس کا کام کر دے۔ یہ سراسر نا انصافی ہے ۔عورتوں کو فیلڈ کے دورے کی اجازت صرف اس وقت ملتی ہے جب افسران بالا سے اس کے تعلقات ساز گار ہوں ۔ ورنہ ہمیں دورے پر نہیں جانے دیتے ۔ جب ہم نے یونین سے بات کی تو فیصلہ ہوا کہ جس کی طرفداری یونین کرے گی' اسے جانے کی اجازت ہوگی۔''

''میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ عورت کو ہمیشہ تابع ہی رکھا جاتا ہے۔ یونین میں بھی ہم مرد ممبران کے تابع ہیں اور وہی ہماری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ تاہم اپنے مسائل ان کے پاس لے کر جاتی ہیں لیکن وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کرنا کیا ہے۔ ان کے پاس طاقت بھی زیادہ ہے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔عورت کو گھر میں بھی اور کام پر بھی تابع ہونا پڑتا ہے۔''

سہیلہ کے انٹرویو سے چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ طلاق یافتہ عورت کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے خواہ اس کا شوہر کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو۔ مزید کام کرنے والی عورت کو برا سمجھا جاتا ہے گو معاشی مجبوریوں کے تحت بے شمار عورتوں کو ملازمت کرنا پڑتی ہے ۔ کام کی جگہ پر نہ صرف مالکان اور انتظامیہ کا رویہ صنفی اعتبار سے امتیازی ہوتا ہے' بلکہ یونین بھی پدر سری قدروں سے لبریز ہوتی ہیں اور ان کا رویہ بھی مردانہ برتری کی قدروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ پدر سری کی قدریں نہ صرف گھر اور خاندان کے رشتوں ناطوں میں پائی جاتی ہیں بلکہ گھر سے باہر کاروبار کی دنیا میں فیکٹری مالکان میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہیں اور سیاسی شعبوں میں' مثلاً یونین میں خود انہیں قدروں کو مضبوط کیا جاتا ہے۔عورتوں کا جلسے جلوسوں میں شامل ہونا برا سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مزدور تحریک کمزور ہوتی ہے۔ جب تک یونین کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ فرسودہ روایات کو ختم کر

کے عورتوں کو آگے لانا اس کا کام ہے' پدرسری نظام مزدور تحریک کو کمزور کیے رکھے گا اور عورتوں اور مردوں میں دوری کا فائدہ مالکان اور حکمرانوں کو ملے گا۔ روایتی نظریات کو چیلنج کرنا خود یونین کا کام ہے اور بجائے ان نظریات کو مزید مستحکم کرنے کے یونین کو چاہئے کہ ان کو چیلنج کرے اور نئے نظریات متعارف کروائے جو عورت کو مکمل شہری تصور کریں اور بطور مزدور اور انسان اس کی برابری کو تسلیم کروائیں۔ موجودہ حالات میں گھر کے رشتے گھر سے باہر کی پدرسری کو مضبوط بناتے ہیں۔ پدرسری نظام کسی ایک جگہ پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسے بیک وقت گھر اور گھر سے باہر ختم کرنا ہوگا ورنہ یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سرایت کرے گا۔ اس نظام کا نقصان یہ ہے کہ معاشرہ بکھر جاتا ہے اور اس کی قوتیں تقسیم ہو کر کمزور ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ مزدوروں کو اکٹھا کیا جائے اور خواتین مزدوروں کے مزاحمت کے جذبے کو سیاسی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ وہ ذاتی معاملات طے کرنے میں ضائع نہ ہوں۔

اس باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ پاکستان میں بے شمار خواتین مختلف صنعتوں میں بطور مزدور کام کرتی ہیں۔ ان کے گھریلو مسائل بھی ہیں اور کام کی جگہ کے مسائل بھی۔ لیکن ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ خواتین انفرادی سطح پر گھر سے متعلق ظلم وستم کے خلاف مزاحمت کرتی ہیں اور اجتماعی سطح پر کام کی جگہ پر نا انصافی کا مقابلہ کرتی ہیں۔ انہیں صرف مظلوم یا بے چاری عورتیں لکھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اپنے اقدام سے' اپنے اعمال سے تاریخ کا نیا باب لکھ رہی ہیں اور تاریخ کے اوراق میں اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

MashalBooks.org

چوتھا باب

مزاحمت اور خواتین اساتذہ

خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد سکولوں اور کالجوں میں بطور استاد کام کرتی ہے خاص طور پر پرائمری کی سطح پر بیشتر اساتذہ خواتین ہیں۔ تعلیم دینا روایتی طور پر ایک باعزت اور باوقار پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر جو خاندان عورتوں کا گھروں سے باہر کام کرنا پسند نہیں کرتے، تعلیم کے شعبے میں خواتین کو کام کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پرائمری سطح چونکہ خواتین کا تعلق بچوں سے ہوتا ہے' اس لیے بہت لوگ عورتوں کا اس سطح پر پڑھانا بر انہیں سمجھتے۔ تاہم بہت سی خواتین لیکچرار اور اعلیٰ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ اس میدان میں عورتوں کی کثرت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چاہے سرکاری سکول ہوں یا نجی' اس پیشے میں تنخواہ بہت کم ہوتی ہے اور مرد زیادہ تنخواہ والے پیشے اختیار کرتے ہیں مثلاً وکالت یا طب وغیرہ۔

بچوں کی تعلیم کا کام نہ صرف عورتوں کے لئے مناسب اور موزوں تصور کیا جاتا ہے بلکہ معاشرتی تعصّبات یہ ہیں کہ عورت بہتر استاد بنتی ہے کیونکہ وہ بچوں کو بہتر سمجھتی ہے اور اس میں بچوں سے اچھا سلوک کرنے اور ہمدردی سے پیش آنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ نیز یہ ایسا کام ہے جس میں تحمل درکار ہوتا ہے' اس لیے عورت کی شخصیت اس پیشے کے لیے زیادہ موزوں تصور کی جاتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ پیشہ ماِمتا کے کردار کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور چھوٹے بچوں کے ساتھ ماں کا سا سلوک بہتر ہے۔ لٰہذا چند کام' خاص طور پر جن میں دوسروں کی خدمات شامل ہوں' عورتوں کے لیے زیادہ مناسب سمجھے جاتے ہیں مثلاً نرس' ڈاکٹر یا استانی۔ لیکن یہ سب کچھ سماجی تعصّبات کی روشنی میں ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سوچ حقیقت پر مبنی ہو۔ مردوں کی تعلیم کے شعبے میں کم دلچسپی کا باعث معاشی وجوہات ہوتی ہیں کیونکہ نہ صرف پڑھانے والاوں کو کم تنخواہ ملتی ہے بلکہ اس پیشے کا ہمارے

معاشرے میں رتبہ اور عزت بہت کم ہے۔ اسی لیے یہ عورتوں کے لیے زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے۔ مرد اس پیشے میں داخل ہوتے بھی ہیں تو انہیں یا تو تنخواہ زیادہ ملتی ہے یا پھر وہ انتظامی سطح پر فائز ہوتے ہیں' جہاں پر پیسے بھی زیادہ ملتے ہیں اور طاقت اور اختیارات بھی وسیع ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت خاص طور پر حکومت کے سکولوں میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے جہاں پرائمری کی سطح پر عام طور پر مرد حضرات ہوتے ہیں۔ اکثر ضلعی تعلیم افسر (DEO) یا معاون تعلیم افسر (AEO) مرد ہوتے ہیں اور ان کے ماتحت اساتذہ خواتین ہوتی ہیں۔ اس طریقے سے ان خواتین پر کنٹرول رہتا ہے اور معاشرتی اقدار مضبوط ہوتی ہیں۔

سرکاری سکولوں کے اساتذہ

سرکاری سکولوں کے اساتذہ پر پرنسپل اور پھر اعلیٰ حکام' خاص طور پر ضلعی تعلیمی افسروں کا بہت کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ ہر اس حکم کے پابند ہوتے ہیں جو اعلیٰ حکام کی طرف سے جاری کیا جاتا ہے۔ اگر ان کے افسر خفا ہو جائیں تو انہیں کس ایسی جگہ پر منتقل کر دیا جاتا ہے جو ان کے گھر سے بہت دور ہوتی ہے اور جہاں تدریس کا شدید فقدان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو انہیں نوکری ترک کرنا پڑتی ہے یا پھر یہ چھٹی لے لیتے ہیں۔ سرکاری سکولوں میں اکثر دباؤ کے تحت داخلے دیئے جاتے ہیں یا پھر کسی من پسند شخص کو تعینات کر دیا جاتا ہے۔ اس امر کے خلاف مزاحمت کا مطلب ہوتا ہے کہ اساتذہ کا تبادلہ کر دیا جائے گا یا انہیں وقتی طور پر معطل کر دیا جائے گا۔ ان کے کام کا سالانہ جائزہ (ACR) جان بوجھ کر خراب کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی ترقی متاثر ہو۔ ان چیزوں سے انہیں قابو میں رکھا جاتا ہے اور مزاحمت کو توڑا جاتا ہے۔ سینئر افسر کا بہت رعب ہوتا ہے کیونکہ وہ بوقت ضرورت ان کی کارکردگی کی رپورٹ میں جھوٹا مواد ڈال کر ان کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ سینئر افسر عموماً مرد ہوتے ہیں جو ہر قسم کے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اگر نہ ملیں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ابھی تک انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا تعلیمی ڈھانچہ رائج ہے جس میں تمام درجوں کے ماتحت لوگ اعلی افسران کے قابو میں رہتے ہیں۔ یہ نظام اب بھی سامراجیت کی ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس نظام کو کس طرح فوج اور عسکریت کی بنیادوں پر استوار کیا گیا' اس پر تفصیلی اور دلچسپ بحث ٹموتھی مچل نے اپنی کتاب ''مصر کو

کیسے نو آبادی بنایا گیا'' میں کی ہے۔ [1] اس نظام کی تشکیل کچھ یوں کی گئی کہ ہر درجے کا ملازم اپنے افسر کے قابو میں ہو اور وہ افسر اپنے اوپر والے افسر کا مرہون منت ہو اور اس طرح ایک درجہ بندی پیدا کی جائے جو سامراجی حکمرانوں کے مقاصد کو سب سے نچلی تہہ تک کنٹرول کرے۔ اس قسم کا نظام زراعت کے شعبے میں بھی رائج کیا گیا اور یہ ایک خاص قسم کا منظّم معاشرہ تیار کرنے کی سوچ کے تحت کیا گیا۔ پاکستان اب تک اس نظام کو توڑ نہیں پایا یہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ سامراجی سوچ ہمارے اندر اب بھی موجود ہے ورنہ تعلیمی نظام کی ترتیب مختلف جمہوری طریقے سے بھی کی جا سکتی تھی۔

سرکاری اساتذہ کو کمرہ جماعت میں وہی کچھ پڑھانا ہوتا ہے جو ٹیکسٹ بک بورڈ یا یونیورسٹی طے کرتے ہیں۔ انہیں اپنے کام پر اختیار نہیں۔ چنانچہ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو دبانا پڑتا ہے۔ وہ اگر طے شدہ نصاب اور درسی کتابوں سے ہٹ کر کچھ پڑھائیں تو ان پر تنقید کی جاتی ہے کیونکہ حکام کا زور کتاب ختم کرنے پر ہوتا ہے نہ کہ اس بات پر کہ طالب علم کچھ سیکھ لیں۔ لہٰذا رٹا لگانے کا نظام چلتا ہے۔ کئی کئی سال تک نصاب تبدیل نہیں ہوتا جس کی وجہ سے نئی نئی باتیں پڑھانے کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ اس طرح آہستہ آہستہ اساتذہ کی تخلیقی قوت بھی ماند پڑ جاتی ہے اور نئی باتیں سکھانے یا نئے طریقے استعمال کرنے کا جذبہ بھی مر جاتا ہے۔ اساتذہ سال بہ سال وہی گھسا پٹا نصاب پڑھاتے رہتے ہیں۔ استاد کی شخصیت گھٹتی جاتی ہے' بلکہ اس طرح طالب علم بھی اس غیر دلچسپ اور بوجھل نظام سے تنگ آجاتے ہیں اور پڑھائی ایک بوجھ لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ تعلیم کا مزہ ختم کرنے میں اساتذہ کا قصور نہیں بلکہ اس پرانے ڈھانچے اور نظام کا ہے جو تعلیم پر چھایا ہوا ہے اور جس کی زد میں اساتذہ جکڑے ہوئے ہیں۔

لیکن عام طور پر لوگ جب بھی تعلیم کے گھٹیا معیار کی بات کرتے ہیں تو اساتذہ کو ہی موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ استاد میں تخلیقی یا تنقیدی سوچ نہیں' استاد کو پڑھانا نہیں آتا' وہ تو رٹا لگواتا ہے لیکن اس بات کا تجزیہ کم ہی کیا جاتا ہے کہ آخر اساتذہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ کوئی خدا کی علیحدہ مخلوق تو نہیں ہیں۔ وہ بھی سب کی طرح تخلیقی سوچ رکھنے والے جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں جو کام میں دلچسپی کا عنصر تلاش کرتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اساتذہ جو تعلیم کا اہم ترین جزو ہیں' جن کا بچوں سے براہ

راست تعلق ہوتا ہے، جو بچوں کی انفرادیت سے واقف ہوتے ہیں، اس درجے بیگانگی اور بیزاری کا شکار ہیں کہ ان کی کارکردگی کو متاثر ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کو اجازت ہی نہ ہو کہ وہ تخلیقی قابلیت استعمال کرے، خود انفرادی طریقے سوچے اور ہر بچے کی انفرادیت کے مطابق کام کروائے، تو وہ کیونکر تخلیقی انداز سے پڑھائے گا۔ اگر ایک استاد کے پاس ایک سو بچے ہیں جنہیں کتاب رٹوا کر امتحان پاس کروانا ہے تو وہ کیسے اپنی منفرد قابلیت کے کارنامے دکھائے۔ قصور ایک فرسودہ اور ناقص نظام کا ہے جس میں اساتذہ نچلے درجے کے بے بس کارکن ہیں۔ ان کے پاس طاقت ہی نہیں کہ وہ نصاب میں، موضوعات میں، مواد میں یا طریقہ کار میں کوئی تبدیلی لائیں چنانچہ وہ تھوڑے سے پیسوں کی خاطر صرف اپنا بنیادی فرض کم سے کم حد تک نبھا دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ کرنے کی نہ تو ان میں سکت رہتی ہے اور نہ کوئی ایسا Incentive انہیں دیا جاتا ہے کہ اعلیٰ کارکردگی دکھائیں۔ ہر شخص پیدائشی طور پر تخلیقی قوت لے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہے کہ ہمارے اساتذہ تخلیقی وتنقیدی سوچ کے اہل نہیں ہیں۔ ان پر سارا الزام لگا کر ہم نظام کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اور یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ایک استاد چاہے ایک جرنیل کے مقابلے میں بہت زیادہ محنت کرتا ہو، بہت زیادہ قابل ہو اور ایک افسر شاہی کے ملازم کے مقابلے میں بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہو، اسے پھر بھی وہ مقام، وہ رتبہ اور وہ عزت میسر نہیں جو ایک جرنیل کو یا ایک افسر شاہی کے اعلیٰ ملازم کو ہوتے ہیں۔ استاد سماجی تبدیلی کا بہترین اور اولین ذریعہ ہوتا ہے لیکن اسے معاشرے میں باعزت مقام نہیں ملتا کیونکہ ہماری قدروں کے نظام میں جنگ کرنے والا، مجاہد، سپاہی اور قتل و غارت کرنے والا اچھا سمجھا جاتا ہے اور پڑھانے والا کمزور اور نا اہل قرار دیا جاتا ہے۔ ہم جسمانی طاقت کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں جو گولہ بارود، ایٹم بم اور بندوق سے بے حد خوش رہتے ہیں اور پڑھنے لکھنے کو یا ذہنی کام کو نسوانیت یا کمزوری کی نشانی سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں سپاہی بنانے کا شوق ہے، مجاہد بنانے کا شوق ہے، لیکن دانشور، صحافی، استاد، سائنس دان بنانے کا شوق نہیں ہے۔ اس لیے استاد کو ہم ایک غیر ضروری کارکن تصور کر لیتے ہیں حالانکہ استاد ذہن کی تعمیر کرتا ہے، سوچ کی تعمیر کرتا ہے اور معاشرے میں اقدار کی تشکیل کا ضامن ہوتا ہے، اعلیٰ اقدار کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اب تو یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ مستقبل میں وہ ممالک آگے بڑھیں گے جو تعلیم کو اہمیت

MashalBooks.org

دیں گے نہ کہ وہ جو فوج اور عسکریت کو اہمیت دیں گے۔ فوج کے ذریعے طاقت کا مظاہرہ ماضی کے معاشروں کی ضرورت تھی۔ اب طاقت کا تصور تبدیل ہو گیا ہے۔ علم کی طاقت کو اصل طاقت مانا جاتا ہے۔ علمی طور پر ترقی یافتہ معاشرے آگے بڑھ پائیں گے خواہ ان کے پاس فوج ہو یا نہ ہو مستقبل کی معیشت تعلیم یافتہ افراد کا مطالبہ کرے گی نہ کہ مجاہدوں اور سپاہیوں کا ۔ چنانچہ اگر ہم اساتذہ کی مرکز اہمیت کا اعتراف نہیں کریں گے تو ہمارا مستقبل تاریک ہی رہے گا۔ اس بات کی اہمیت کے بارے میں حامد قزلباش اپنے مقالے ''اساتذہ کے مسائل اور ان کا حل'' میں ذکر کرتے ہیں: (2)

سرکاری سکول اور کالج مختلف سطح اور طرز کے ہوتے ہیں جن میں پرائمری' مڈل' سیکنڈری سکولوں کے بعد کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے معیار میں بھی فرق ہوتا ہے مثال کے طور پر کچھ سکول براہ راست حکومت کے ہوتے ہیں' کچھ میونسپل کارپوریشن کے سکول ہوتے ہیں' کچھ ڈویژنل پبلک سکول اور کچھ دیگر اقسام کے سکول ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے حقوق اس بات سے بھی متاثر ہوتے ہیں کہ وہ کس قسم کے سکول میں کس سطح پر اور کس جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ اس مطالعے کے لیے ہم ایک سرکاری سکول اور ایک کالج کی لیکچرار کا انٹرویو لے پائے۔ اس کے علاوہ دوسرے اساتذہ نجی اور غیر رسمی سکولوں کے تھے جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

نفیسہ-----عمر 44 سال

'' میں ایک سرکاری سکول میں ملازم ہوں میری شادی نہیں ہوئی۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ نا انصافی کو خاموشی سے برداشت کر لیا جائے میں سوچتی ہوں دوسروں کے لیے مسائل پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔ میں گزشتہ گیارہ برس سے کام کر رہی ہوں اور اپنی تمام ذمہ داریاں پوری طرح نبھاتی ہوں لیکن میں نے کبھی اپنے اعلیٰ افسران کو بلا وجہ خوش کرنے کی کوشش نہیں کی ایک دفعہ پرنسپل نے میری والدہ کو گھر پر بلا لیا کیونکہ میں نے ایک طالب علم کو اصول کے خلاف داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا میں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور اس کے بے اصول رویئے کو کھلے عام چیلنج کر دیا۔ میں نے کہا کہ سکول کے معاملات میں میرے گھر والوں کو شامل کرنا سراسر غلط ہے۔ اس دفعہ تو وہ چپ کر گئی۔ پھر

ایک بار اس کا سکول کے چپراسی سے اختلاف ہوا۔ سرکاری سکولوں میں کسی کو ملازمت سے برخاست کرنے کے لیے کوئی وجہ بتانا ہوتی ہے اور اگر اس شخص کا تبادلہ کرنا ہو تو بھی کوئی خاطر خواہ بتانا پڑتی ہے۔ پرنسل کی کوشش تھی کہ تمام اساتذہ ایک عرضداشت پر دستخط کریں کہ وہ چپراسی ایک لڑکی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا گیا۔ میں نے ایک غریب آدمی کی روزی پر لات مارنے سے صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ مجھے بہت عرصہ عدالتوں کے چکر لگانا پڑے۔ اگر میں دستخط کر دیتی تو اس کا مطلب تھا کہ ایک غریب بے گناہ شخص کی نوکری گئی اور ایک نوجوان لڑکی کی عزت ۔ پرنسپل نے بدلہ یوں لیا کہ چونکہ وہ خود شیعہ تھی اس لیے تمام شیعہ اساتذہ کو اچھی سالانہ رپورٹ ملی اور میری بری رپورٹ کر دی۔ اساتذہ شیعہ سنی اختلاف اس پرنسپل کی وجہ سے پیدا ہوا۔''

''میں ایک چھوٹی سی گلی میں رہتی ہوں میری کوشش ہوتی ہے کہ مغرب سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ ارد گرد لوگ کام کرنے والی عورت کو برا سمجھتے ہیں۔ میں سکول سے فارغ ہو کر سودا سلف خریدتی ہوں۔ والدہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں اور گھر کا سارا کام کاج کرتی ہوں۔ گھر میں ہی چلاتی ہوں۔ ایک دفعہ جب میں رات دیر سے گھر پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ایک ہمسائے نے کچھ برے الفاظ کہے' جن پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس کا سامنا کیا اور اسے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جب سے میرے بھائی بیرون ملک گئے ہیں' گلی کے نوجوان لڑکوں نے یہ عادت بنالی ہے کہ میرے گھر کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں وہاں سے نکل کر جانا محال ہو جاتا ہے۔ آخر ایک دن میں نے انہیں خوب ڈانٹا۔ دوسرے لوگوں کے آنے سے خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھے اس کے بعد انہوں نے یہ حرکت نہیں کی''۔

''عورت کے لیے زندگی اس وقت تک دوبھر ہے' جب تک کہ وہ اپنی کفالت کے لیے دوسروں پر انحصار کرتی ہے۔ مرد جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اگر انسان حالات کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ جب سے بھائی باہر گئے ہیں' حالات پہلے بگڑے لیکن اب میں سب کچھ خود سنبھال لیتی ہوں۔ بھیا کی عادت تھی کہ ہماری حفاظت کریں لیکن ان کے چلے جانے کے بعد ہم نے اپنی حفاظت کرنا خود ہی سیکھ لیا ہے''۔

''مجھے ہمیشہ سے شوق تھا کہ میں خوب پڑھوں۔ لیکن ابا کی وفات کے بعد مجھے

MashalBooks.org

نوکری کرنا پڑی۔ میرے گھر والوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ میں جو چاہتی کرتی تھی۔ جب میں نے کمانا شروع کر دیا تو بھیا پھر بھی مجھے جیب خرچ دیتے رہے۔ میں نے اپنی کار خود اپنی کمائی سے خریدی جس سے میں بہت خوش ہوں۔ میں اپنا غصہ گھر والوں پر نہیں نکالتی۔ اگر کوئی بات ہو جائے تو میں کچھ دن چپ رہتی ہوں کہ سب کے غصے ٹھنڈے ہو جائیں۔ پھر میں اس بات پر گفتگو کرتی ہوں۔ جب کوئی دوسرا غلط بات کرے تو میں اپنی بات پر اڑ جاتی ہوں۔ اکثر سوچتی ہوں کہ کاش میں لڑکا ہوتی۔ میں اکیلی سفر پر جاتے ہوئے گھبراتی ہوں لیکن اگر لڑکا ہوتی تو بلا تامل کہیں بھی جا سکتی تھی''۔

جمیلہ-----عمر 47 برس

''میں لاہور میں ایک خواتین کالج میں بطور پروفیسر کام کرتی ہوں۔ پڑھنے اور نوکری کی غرض سے باہر جانا کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ میں ایک ایسے گھرانے سے ہوں جہاں یہ توقع کی جاتی تھی کہ عورتیں ڈگری حاصل کر لیں تو خود اپنی کفالت کر لیں گی۔ والد کی وفات کے بعد یہ اور بھی ضروری ہو گیا' جغرافیہ میں ایم سے کرنے کے بعد میں نے بہت جگہ نوکری تلاش کی اور اس میں وقت لگا۔ مجھے گلے کی شدید بیماری ہو گئی اور میں نے تیزی سے وزن کھونا شروع کر دیا۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت بے چین تھی ۔ میں تمام گھر والوں کا خیال رکھتی تھی لیکن میری کوئی اپنی زندگی نہیں تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ ہر کسی کو یہ حق ہے کہ میری بے عزتی کرے۔ چاہے کسی کا بھی قصور ہو لیکن میں چھ بہنوں میں ایک تھی اور میرا نمبر چوتھا تھا۔ مجھے جواب دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں اچھی طالبہ تھی اس لیے مجھے قومی ترقیاتی رضا کارانہ پروگرام میں کام مل گیا جس کے لیے مجھے چھوٹا موٹا وظیفہ مل جایا کرتا تھا۔ میں نے پاکستان کے موسمی حالات پر تحقیق کی لیکن میری ساری محنت کو میرے پروفیسر نے خود اپنا ظاہر کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس پروفیسر نے اس تحقیق میں میرے نام تک کو نہیں آنے دیا۔ اسی پروفیسر کی شہہ پر لڑکوں کے ایک گروپ نے مجھ پر فقرے کسنا شروع کر دیئے۔ یہ پروفیسر ہمارا کام اپنے ذاتی کمرے میں بلا کر تنہائی میں چیک کرتا تھا او اس کی نظر میں میل تھا۔ آخر میری شکایت پر انکوائری ہوئی اس کے بعد دوسروں کو مجبور کیا گیا کہ مجھ سے معافی مانگیں۔ یہ معافی تحریری شکل میں تھی۔ اسی پروفیسر نے پوری کوشش کی کہ میرا نتیجہ خراب نکلے

لیکن پھر بھی مجھے فرسٹ کلاس مل گئی ۔ میں نے اس پروفیسر کی حرکتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ میں اسے معلوم نہیں ہونے دیتی تھی کہ کام میرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب انسان ایک خاص صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی طریقہ مزاحمت کے لیے نکال ہی لیتا ہے''۔

''پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت میرا خواب تھا۔ جب پنجاب پبلک سروس کمیشن میں میرا انتخاب ہو گیا تو مجھے لیکچرار کی نوکری ملی جو ایک دور دراز کے گاؤں میں تھی۔ میں نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور چلی گئی حالانکہ رہنے کی جگہ بہت تکلیف دہ تھی۔ ہم ایک سکول کے کلاس روم میں رہتے تھے۔ ہم تین افراد کی وہاں نوکری لگی۔ گاؤں کے لوگوں کو عادت نہیں تھی کہ شہر کی تین نوجوان لڑکیاں گاؤں میں یوں اکیلی رہیں اور پڑھائیں۔ ہم وہاں تانگوں میں جاتے تھے سارا راستہ گاؤں کے نوجوان لڑکے پیچھے پیچھے ہوتے۔ ان کی تیر جیسی نظریں ہمیں کاٹتی تھیں ہم نے چادریں اوڑھنا شروع کر دیا۔ ہمیں بالکل تنہائی میسر نہیں تھی۔ لڑکیوں کے نئے کالج کا انچارج لڑکوں کے کالج کا پرنسپل تھا۔ وہ بہت خبیث آدمی تھا۔ ہفتہ اور اتوار کو بھی سٹیشن لیو (Station Leave) دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ جب اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے آبائی گاؤں بھیجا تو ہمیں کام کی بات کرنے کے بہانے سے اپنے گھر بلا لیا۔ جب ہم نے انکار کیا تو اس نے ڈائریکٹوریٹ میں ہماری شکایت کر دی۔ ہمارے ذاتی اور سرکاری خطوط پر پھول اور ستارے بنانا شروع کر دیئے۔ ہم نے اعلیٰ حکام کو اس کے خلاف شکایت کر دی۔ آخر اسے ایک اور جگہ تبدیل کر دیا گیا اور حکومت نے کالج کے لیے ایک خاتون پرنسپل کا انتظام کیا''۔

''بچپن میں' میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتی تھی اس سے میرا جسم متاثر ہوتا تھا اور میں بیمار پڑ جاتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میں نے مشکل حالات کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا اور ہر رکاوٹ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میں نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ اب میں اس قدر خود مختار اور خود اعتماد ہو چکی تھی کہ میں دوسرے شخص کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ والدہ کے ساتھ رہنے کے باعث مجھے اپنے اندر تحمل کا جذبہ پیدا کرنا پڑا۔ میں سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی ہوں کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ انسانوں کو نہیں بدل سکتے۔ والدہ بھائیوں کو ہم بہنوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ میں خاموشی سے

MashalBooks.org

برداشت کرتی ہوں کیونکہ وہ بہت بوڑھی ہیں اور میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی ۔ میں خاموش رہ کر اپنی عزت بچاتی ہوں ورنہ نا انصافی مجھے بہت رنجیدہ کرتی ہے۔''

نجی سکولوں کے اساتذہ

1970ء کی دہائی سے پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں نجی سکول کثرت سے کھلے ہیں۔ اس سے قبل یا تو سرکاری سکول تھے اور یا مشنری سکول ہوا کرتے تھے۔ چند نجی سکول موجود تھے لیکن ان کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ 1970ء کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو نے کئی سکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا جس کی وجہ سے وہ سرکاری سکولوں کے دائرے میں آگئے۔ قومیائے جانے کی بنا پر ان میں سے اکثر سکولوں کا تعلیمی معیار بہت گر گیا کیونکہ نجی سکولوں میں اساتذہ کی براہ راست جوابدہی ہوتی ہے جو سرکاری سطح پر ممکن نہیں۔ سرکاری سکولوں کے لوگ خواہ کئی ماہ مسلسل حاضری نہ دیں تو بھی کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی جب کہ نجی سکولوں کے افسر وہیں موجود ہوتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہنے دیتے ۔ اس کے علاوہ نجی سکولوں کے افسران کے لیے نگرانی قدرے آسان ہوتی ہے کیونکہ یہ موقع پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ کام کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں اور نگرانی بھی اور بوقت ضرورت اساتذہ سے جواب طلب بھی کرتے ہیں۔ ان کی ہر وقت کام پر تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔

اگرچہ کئی لحاظ سے نجی سکول سرکاری سکولوں سے بہتر ہوتے ہیں لیکن نجی سکولوں کی بھی کئی سطح اور اقسام ہوتی ہیں۔ ہر نجی سکول اچھا نہیں ہوتا۔ اس قسم کے سکولوں میں بھی درجے ہیں۔ مثلاً وہ نجی سکول جو 50 روپے مہینہ پر بچوں کی تعلیم دیتے ہیں اور جن کا معیار سرکاری سکولوں سے زیادہ بہتر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ شہروں میں سکول بھی ہیں جو امیر طبقوں کے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں' جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور جہاں 4000 روپے ماہوار تک فیس لی جاتی ہے۔ یہ سکول مشنری سکولوں کے قومیائے جانے کے بعد اچھی تعلیم کے فقدان کے پیش نظر قائم ہوئے۔ امیر طبقہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے بے شمار پیسہ دینے کو تیار رہتا ہے۔ ان سکولوں میں مستقبل کے حکمران طبقے تیار کئے جاتے ہیں جبکہ سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں میں مستقبل کے محکوم طبقے کے افراد تیار کئے جاتے ہیں۔

اگرچہ اعلیٰ درجے کی نجی سکولوں میں اساتذہ کی تنخواہ قدرے بہتر ہوتی ہے اور یہ 4000یا 5000 روپے ماہوار سے لے کر 10000یا 15000 روپے ماہوار تک بھی ہوتی ہے' لیکن یہاں کے اساتذہ کا بھی بہت استحصال ہوتا ہے ان سکولوں میں کارکنوں کے انسانی حقوق' لیبر قوانین یا عورتوں کے حقوق نہیں ہوتے ۔ یہ اساتذہ مکمل طور پر مالکان کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ انہیں نوکری کا تحفظ نہیں ہوتا۔ انہیں کھڑے پاؤں نوکری سے برطرف کیا جاسکتا ہے معمولی غلطیوں پر ان کو سب کے سامنے کر دی جاتی ہے اور انہیں اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا حق نہیں ہوتا۔ ان سکولوں میں بھی غیر سرکاری تنظیموں کی طرح نہ تو کوئی طبی سہولیات ہوتی ہیں۔ نہ پنشن اور نہ کوئی دیگر سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ ذرائع آمدورفت کا عموماً کوئی انتظام نہیں ہوتا لیکن اگر اساتذہ کو چند لمحے دیر ہو جائے تو بہت ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے۔ جہاں 60یا 100 تک اساتذہ بھی موجود ہوں' یونین بنانے کا حق نہیں دیا جاتا اور جو استاد اپنے حقوق سے واقف ہو اور اپنا حق مانگ لے تو اسے جلد ہی کسی نہ کسی بہانے نوکری سے جواب مل جاتا ہے۔ جہاں بچوں کی فیسوں میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے کبھی کمپیوٹر کے بہانے' کبھی نہانے کے تالاب کے بہانے' کبھی کھیلوں کے بہانے' وہاں اساتذہ کو دس فیصد کی ترقی بھی نہیں دی جاتی ۔ ان سکولوں میں مرد اساتذہ کو عموماً خواتین اساتذہ سے بہتر تنخواہ دی جاتی ہے۔ چاہے خواتین اساتذہ زیادہ پرانی یا سینئر ہی کیوں نہ ہوں۔ مرد اساتذہ کو آزادی سے آنے جانے کی اجازت بھی ہوتی ہے جبکہ خواتین اساتذہ اپنے فری پیریڈ میں بھی' جب تک چھٹی نہ ہو جائے۔ سکول سے نکل نہیں سکتیں۔ کئی نجی سکولوں میں مرد اساتذہ کو اپنے علیحدہ کمرے مل جاتے ہیں جبکہ خواتین ایک سٹاف روم میں بیٹھتی ہیں۔ لہٰذا تعلیم کے میدان میں بھی دوسرے میدانوں کی طرح صنفی تفریق واضح نظر آتی ہے ۔ ہم اس مطالعے کے لیے دو مختلف سطح کے نجی سکولوں کی اساتذہ سے بات چیت کر پائے۔ ان میں سے رشیدہ' ایک متوسط درجے کی نجی سکول میں کام کرتی ہیں جبکہ عقیلہ ایک اعلیٰ درجے کے انگریزی سکول میں پڑھاتی ہیں۔

رشیدہ ۔۔۔۔۔۔عمر 48سال

'' میں نے یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرتے ہی پڑھانا شروع کر

دیا۔ پہلے میں ایک جاگیردار عورت کے سکول میں کام کرتی تھی جو مجھ سے ایسا سلوک چاہتی تھی جو ایک جاگیردار اپنے مزارعہ سے چاہتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اٹھ اٹھ کر اسے سلام کروں۔ جب تک وہ نہ بیٹھے میں بیٹھ نہ سکوں' جیسا وہ کہے' میں وہی کروں خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ کہہ رہی ہو۔ چنانچہ میں نے وہ سکول چھوڑ دیا اور ایک نجی سکول میں جغرافیہ پڑھانے لگی۔ یہاں کی پرنسپل بہت ہی سخت ہیں۔ ہم ہر وقت ان کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ وہ سب کے سامنے ہماری بےعزتی کر دیتی ہیں چاہے ہمارا قصور ہو یا نہ ہو۔ اگر کسی ایک شخص کا بھی قصور ہو تو سب کو بری طرح ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ ہمیں بہت غصہ آتا ہے لیکن پھر روزی کمانے کے ہاتھوں مجبور ہیں کیونکہ نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔ مالکان اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم لوگ چپ ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی احتجاج کرے یا بولے تو فوراً اسے نکال دیتے ہیں۔ اس بات سے سب ڈرتے ہیں کیونکہ بہت سی اساتذہ کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور خاوند چھوڑ دیا ہے وہ پوری طرح اپنی نوکری پر انحصار کرتی ہیں۔ انہوں نے تو پندرہ بیس سال پرانی استاد کی بھی پرواہ نہیں کی اور اسے کھڑے پاؤں نکال دیا۔ ہمیں کسی قسم کا کوئی قانونی تحفظ نہیں ہے۔ شاید کوئی قانون ایسا ہے ہی نہیں جو ہمارے حالات پر بھی لاگو ہو۔ ہمیں کئی دفعہ ہفتہ کی چھٹی بھی نہیں ملتی کیونکہ وہ والدین سے ملنے کا دن ہوتا ہے یا پھر کوئی اور کام لیکن اگر ہم ایک یا دو چھٹیاں بھی کر لیں تو ہماری تنخواہ کٹ جاتی ہے۔ مجھے یہ بات بہت غیر منصفانہ لگتی ہے لیکن ہمیں چپ رہنا پڑتا ہے کیونکہ کوئی بھی اصول ہمارے حق میں نہیں' تمام رولز ہمارے خلاف ہی ہیں۔ پھر ہمیں والدین کو بھی خوش رکھنا ہوتا ہے۔ اب کوئی ماں باپ اپنے بچے کے لیے کچھ پسند کرتے ہیں اور کوئی کچھ اور۔ تو ہم ہر ایک کو خوش کیسے رکھ سکتے ہیں؟ ایک کہتا ہے کہ ہوم ورک کیوں نہیں دیا' دوسرا کہتا ہے کہ ہوم ورک کیوں دیا؟ ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر ایک کو خوش رکھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے''۔

'' اکثر ہم سب لوگ مل کر سوچتے ہیں کہ جا کر مالکان سے بات کریں اور ناانصافی پر احتجاج کریں لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ پہلا قدم کون اٹھائے گا؟ ملازمت کی ضرورت نہ ہو تو شاید خوف کم ہو جائے لیکن آج کل کے زمانے میں مہنگائی آسمان کو ہاتھ لگا رہی ہے۔ اگر نوکری نہ ملی تو گزارا کیسے ہو گا ایک دو مرتبہ جب مجھے غیر منصفانہ طور پر برا

بھلا کہا گیا تو میں مالکان کے پاس گئی اور میں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہیں تو سکول چلانا ہے۔ جو نا خوش ہے وہ کوئی اور نوکری تلاش کر لے۔ مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا لیکن میں بہت روئی کیونکہ مجھ سے بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر کہیں اور بھی نوکری کی تو وہاں بھی یہی کچھ ہوگا' ہم پوری طرح مالکان کے مرہون منت ہوں گے۔ یہ سوچ کر ہم سب ایک دوسرے سے بات کر کے غم غلط کر لیتے ہیں۔ دوسری ٹیچرز سے بات کر کے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور دکھ بٹ جاتا ہے''۔

''میں معاشی طور پر خودکفیل ہوں۔ میں ایک بہت قدامت پرست خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ انہوں نے اپنی مرضی سے میری شادی کر دی۔ میں نے اپنا سارا زیور بیچ کر شوہر کی گھر بنانے میں مدد کی لیکن ایک دن ایک چھوٹے سے جھگڑے پر انہوں نے مجھے گھر سے چلے جانے کو کہا۔ گھر میں جو میرے زیورات تھے ان کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ گھر والوں نے مجھے بہت روکا اور منع کیا کہ گھر نہ چھوڑو اور شوہر کی بات برداشت کر لو لیکن میں بے عزتی نہیں برداشت کر سکتی لہٰذا میں نے گھر چھوڑ دیا اور اب میں ایک کرائے کے مکان میں اکیلی رہتی ہوں۔ میرے گھر والوں نے مجھ سے بول چال بند کر رکھی ہے کیونکہ ہمارے خاندان میں اس سے قبل کسی نے گھر نہیں چھوڑا۔ اگر میں اپنی کفالت خود کر سکتی ہوں تو میں شوہر کی باتیں کیوں سنوں؟ لوگ باتیں بناتے ہیں' مجھے خود سر اور مغرور کہتے ہیں' بہت زیادہ آزاد خیال کہتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہی' نہ تو میں بدچلن عورت ہوں اور نہ آوارہ۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اگر عورت اکیلی رہے اور خود کما کر کھائے تو اسے آوارہ ہی کہا جاتا ہے۔ اب میں نے اپنی کچھ بچت بھی کر لی ہے تا کہ میں مکمل طور پر خود مختار ہو جاؤں۔ جب تک میں شوہر کے ساتھ رہتی تھی میرا کچھ نہیں بچتا تھا۔ میرے شوہر میری پوری تنخواہ لے لیتے تھے اور مجھے ان سے اپنی ہی تنخواہ مانگ کر لینا پڑتی تھی۔ وہ میری تنخواہ گھر کے خرچوں پر صرف کر دیتے تھے' اپنی تنخواہ سے انہوں نے جائیداد بنالی جس میں میرا کوئی حق نہیں تھا حالانکہ میرا زیور اس جائیداد کے بنانے میں لگا۔ پھر بھی مجھے کھڑے پاؤں گھر سے چلے جانے کو کہا۔ میں وہی کرتی ہوں جو خود چاہتی ہوں۔ اس وجہ سے والد اور بھائی مجھ سے خفا ہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی میں مگن ہوں۔ میں کسی پر بوجھ نہیں ہوں' کسی کا سہارا نہیں مانگتی' اس بات پر مجھے فخر ہے' ضرورت

MashalBooks.org

پڑنے پر خاندان والے بھی منہ پھیر لیتے ہیں لیکن انسان کو اگر خود اعتماد اور اپنی قابلیت پر بھروسہ ہو تو وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں اس بات سے بے فکر رہتی ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے میں اس قید سے نکل چکی ہوں''۔

عقیلہ۔۔۔۔۔عمر 40 سال

''میں ہمیشہ سے بہت باغی تھی۔ میں بہت زیادہ آزادانہ سوچ رکھتی ہوں اور اپنی مرضی کی مالک ہوں ۔میں برداشت نہیں کر سکتی کہ مجھے ذہنی طور پر کوئی دبائے۔ جب بھی کوئی لڑکی میں فرق کرتا تھا تو میرا شدید ردعمل ہوتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں لڑکوں کو بہت آزادی تھی اور لڑکیوں کو بند رکھا جاتا تھا۔ میرے والدین پابندیاں لگاتے تھے۔ اس لیے میرے ان سے اچھے تعلقات نہ بن پائے۔ میں نے چھپ چھپ کر' چوری چوری اپنی مرضی کرنا شروع کر دی''۔

''میرا تعلق جاگیردار گھرانے سے ہے' مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ میں ایک پیشہ ور عورت بن سکتی ہوں۔ جو تعلیم دی گئی وہ صرف وقت گزارنے کے لیے لیکن میرے اپنے خیالات بہت مختلف تھے اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں نے ملازمت اختیار کر لی''۔

''میری والدہ کا بہت رعب تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں پڑھوں یا آزادانہ سوچ اختیار کروں۔ مجھے گھر میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے میں دوسرے لوگوں کی نسبت اپنی آزادی کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا شوق ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ زندگی کی ہر چیز کا تجربہ کروں لیکن شوہر کو اس بات پر آمادہ کرنا بہت مشکل تھا ہم دونوں کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں اسے چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ میں بیمار ہو گئی تو ڈاکٹر نے میرے شوہر سے کہا کہ گھر میں گھٹن کا ماحول مجھے متاثر کر رہا ہے۔ میرا جسم گھٹے ہوئے ماحول کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ میں نے باہر جا کر علاج کروایا۔ اس سے میری صحت بہتر ہوئی لیکن میں جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکی تھی اور اب ہر چھوٹی موٹی بات کا بھی ،،مجھ پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اس لیے میں چپ رہنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے خود پر خاموشی کا پہرہ نہیں لگایا' میں نے صرف حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے

اور اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ انسان کچھ چیزیں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اب میں نے کوشش بھی چھوڑ دی ہے''۔

''میرے شوہر مجھ سے بہت مختلف ہیں' ان کے لیے گھومنا پھرنا محض تفریح ہے' میرے لیے علاج ہے' میں اپنی تفریح پر ہمیشہ خود خرچ کرتی ہوں تا کہ مجھ پر پابندیاں نہ لگیں' اس آزادی سے مجھ میں ایک اعتماد پیدا ہوا ہے۔ پہلے تو میں نے یہ آزادی حاصل کرنے پر ندامت محسوس کی جیسے میں نے کچھ غلط کام کیا ہو لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اگر میں شوہر سے علیحدہ اکاؤنٹ نہ رکھتی تو میں کبھی آزاد نہ ہو سکتی۔ پہلے مجھے اپنے ہی پیسے شوہر سے مانگنا پڑتے تھے جس سے مجھے ذلت کا احساس ہوتا تھا لیکن اب مجھے اس ذلت سے نہیں گزرنا پڑتا کیونکہ میں اپنی تنخواہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہوں''۔

''میں نے کام سادہ انداز میں شروع کیا کیونکہ مجھے کام کی جگہ کی سیاست کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ایسے شخص کے خلاف ہو جاتے ہیں جو قابل ہو۔ مجھے یہ بات ذلت آمیز لگی کہ مجھے کام کی جگہ پر اپنا ''مارکیٹ ریٹ'' مانگنا پڑا۔ لیکن اب میں طریقہ سیکھ گئی ہوں۔ اب کوئی میرا استحصال نہیں کر سکتا۔ میں منافقوں سے دور رہتی ہوں اور تندہی سے اپنا کام کرتی ہوں۔ میں کسی بھی وجہ سے اپنی مشکل سے جیتی ہوئی آزادی نہیں چھوڑوں گی۔ اس معاشرے میں عورت کی آزادی بری سمجھی جاتی ہے جبکہ اس کے بغیر عورت کی صلاحیت پنپنے نہیں پاتی۔''

غیر رسمی سکول

گزشتہ دس پندرہ برس سے غیر رسمی تعلیم کا تصور تیزی سے ابھرا ہے۔ غیر رسمی سکولوں کو اب کمیونٹی پر مبنی سکول بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ''غیر رسمی'' کی اصطلاح سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس قسم کے سکول ہیں۔ غیر رسمی سکول ریاست کی ناکامی کی وجہ سے قائم ہوئے۔ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے جو کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور (1948ء) میں بھی دیا گیا ہے اور خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کے معاہدے (1979ء) اور 1990ء میں طے پانے والے بچوں کے حقوق کے منشور میں بھی دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے دیگر معاہدوں میں بھی تعلیم کا حق بنیادی قرار دیا گیا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا

گیا ہے کہ تعلیم فراہم کرنا ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

ہر شہری' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' مسلمان ہو یا ہندو' کسی بھی علاقے کا رہنے والا ہو' کوئی بھی زبان بولتا ہو' یہ اس کا بنیادی حق ہے۔ اس سلسلے میں تھائی لینڈ میں 1990ء میں عالمی کانفرنس منعقد کی گئی جس کے بعد ''تعلیم سب کے لیے'' کا تصور عام ہوا۔ دنیا بھر کے ممالک نے تہیہ کیا کہ تعلیم ہر بچے تک پہنچائی جائے گی وہ امیر ہو یا غریب' مرد ہو یا عورت' بعد ازاں دہلی اعلامیہ میں ایک دفعہ پھر اس وعدے کو دہرایا گیا کہ دنیا سے ناخواندگی کو مٹایا جائے گا' خاص طور پر عورتوں کو ناخواندہ رکھنے کی روش کو توڑا جائے گا۔

تاہم مختلف وجوہ کی بنا پر بہت سے ترقی پذیر ممالک اس نبیادی حق کی فراہمی میں ناکام رہے۔ کہیں تعلیم ریاست کی ترجیحات ہی میں نہیں تھی اس اہم شعبے پر خرچ کرنے کے بجائے ریاستوں نے دفاع اور غیر ترقیاتی کاموں پر معاشرے کا بیش قیمت سرمایہ ضائع کیا۔ ایسا ہی پاکستان اور ہندوستان میں ہوا جہاں ایٹمی توانائی پر زیادہ اور لوگوں کی بنیادی ضروریات پر زور کم رہا۔ چند ممالک میں عورتوں کو جدید تعلیم سے دور رکھا گیا تاکہ معاشرے کی قدیم روایات اور اقدار تبدیل نہ ہو جائیں اور معاشرہ عدم استحکام کا شکار نہ ہو جائے۔ جہاں ریاست نے تعلیم فراہم بھی کی وہاں اس تعلیم کا مقصد روشن خیالی' ترقی پسندی' تنقیدی سوچ یا کشادہ ذہن پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ اس تعلیم کے ذریعے ریاست کے جارحانہ ایجنڈے کو فروغ دیا گیا اور نصاب میں جنگجو قدروں کو فروغ دے کر ایک خطرناک قسم کی قوم پرستی اور ''قوم کی تعمیر'' کی گئی۔ جاپان' اٹلی اور جرمنی میں دوسری جنگ عظیم سے قبل ایسا ہی ہوا تھا۔ اب ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کی اقدار کو فروغ دیا جاتا ہے اور کثیر دفاعی اخراجات کے لیے جواز مہیا کیا جاتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ احساس بڑھتا گیا کہ مستقبل میں طاقت کا ذریعہ فوج' فوجی اور اسلحہ نہیں ہوگا بلکہ تعلیم ہوگی' ایسی جدید تعلیم جو آج کل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد دے گی۔ طاقت کا تصور جنگ' اسلحہ اور جارحیت سے ہٹ کر معاشی طاقت پر مبنی ہوگیا۔ اب ممالک کا ایک دوسرے سے مقابلہ فوجوں سے نہیں' منڈیوں سے ہوتا ہے اور جنگ کی جگہ تجارت نے لے لی ہے۔ لہٰذا اب فوجی اور سپاہی تیار کرنے کے بجائے تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد تیار کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے جو کہ آج کی دنیا میں منڈی کی

MashalBooks.org

معیشت میں مقابلہ کرسکیں۔ اس کے لیے تکنیکی اور سائنسی علوم کی اہمیت دو بالا ہوگئی ہے۔ جو معاشرہ نئے قسم کے شہری تیار کرنے میں ناکام رہے گا' وہ شاید اس دوڑ میں مٹ جائے چنانچہ نئی طرز کے مزدور تیار کئے جاتے ہیں جو تکنیکی ہنر کے ماہر ہوں۔ لہٰذا بدلتی دنیا میں پرانی طرز کی ریاست کمزور پڑتی نظر آتی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوئی اور یہ جدید تقاضوں کے مطابق تبدیل نہ ہوئی تو بادشاہتوں اور سلطنتوں کی طرح یہ بھی تاریخ میں روپوش ہوکر رہ جائے گی۔

ریاست کی ناکامی کے احساس نے کچھ معاشروں کو مجبور کیا کہ وہ تعلیم عام کرنے کے متبادل ذرائع تشکیل دیں۔ اس طرح کئی ممالک میں غیر رسمی تعلیم کا آغاز ہوا جس کے مشہور ترین مثال بنگلہ دیش کا بریک (Brac) پروگرام ہے جو ایک دیہی ترقیاتی پروگرام ہے اس میں تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ غیر رسمی پروگراموں میں معیار تعلیم پر زیادہ زور نہیں ہے' اس پروگرام کی رسائی وسیع ہے اور یہ ایسے افراد کو تعلیم پہنچانے میں کامیاب رہا ہے جن تک عام طور پر تعلیم نہیں پہنچتی۔

غیر رسمی تعلیم کا تصور کیا ہے؟

غیر رسمی تعلیم کا طریقہ کار رسمی تعلیم سے کچھ مختلف ہے۔ اگرچہ غیر رسمی تعلیم کے بہت سے ماڈل ہیں لیکن ان میں ایک بات یکساں ہے کہ یہ تعلیم غریب ترین اور پسماندہ علاقوں کے بچوں کے لیے ترتیب دی گئی ہے' ایسے علاقوں کے بچوں کے لیے جہاں سرکاری یا نجی سکول نہیں ہیں۔ عام طور پر غیر رسمی سکول دور دراز کے علاقوں میں کھولے جاتے ہیں۔ جو شہروں سے بہت فاصلے پر ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم میں لڑکیوں کی تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ عالمی سطح پر لڑکیوں کی شرح خواندگی لڑکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ غیر رسمی نظام تعلیم میں 5 سے 9 اور 10 سے 14 برس کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ ان سکولوں میں زیادہ تر بچے وہ ہیں جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ مشقت و مزدوری کرتے ہیں اور بے انتہا غریب ہیں ۔ یہ تعلیم مفت دی جاتی ہے یا پھر دس پندرہ روپے فیس لی جاتی ہے تاکہ والدین اور بچوں کو اچھے نتائج حاصل کرنے میں دلچسپی ہو اور وہ سکول کو سنجیدگی سے دیکھیں ۔ بہت سے غیر رسمی سکول' غیر سرکاری تنظیمیں

MashalBooks.org

غیر ملکی فنڈ دہندگان کی مدد سے چلا رہی ہیں اور ان کی کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے 1995ء میں وزیر اعظم کے کمیشن برائے خوندگی نے پورے پاکستان میں دس ہزار غیر رسمی سکول کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ان سکولوں کو غیر رسمی تنظیموں کو چلانا تھا اور وزیر اعظم کے کمیشن برائے خواندگی کو اساتذہ کی تنخواہ اور تعلیمی مواد وغیرہ فراہم کرنا تھا۔ تاہم پیسوں کی کمی کے باعث اس سکیم کے تحت صرف 7000 ہزار غیر رسمی ادارے کھولے گئے اور ان کے لیے بھی تنخواہوں اور مواد کی فراہمی میں شدید تاخیر ہوئی۔

غیر رسمی سکول کسی دیہات کی چھوٹی سی کمیونٹی میں کسی ایک گھر میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر کھولے جاتے ہیں۔ استاد کی نشاندہی مقامی افراد کی مدد سے کی جاتی ہے اور عام طور پر کوئی نہ کوئی مقامی لڑکی جو مڈل' میٹرک یا ایف اے پاس ہو پڑھانے کے لیے منتخب کر لی جاتی ہے۔ مقامی کمیونٹی میں سے استانی لینے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پھر یہ لڑکی کہیں اور نہیں جاتی یا اس کا تبادلہ نہیں ہوتا۔ کبھی شادی ہو جانے کے باعث لڑکیاں کام چھوڑ دیتی ہیں لیکن اکثر مقامی لڑکیوں کو بطور استانی رکھنے کے بہت سے فوائد ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وہ مقامی حالات سے واقف ہوتی ہیں' بچوں کو ذاتی طور پر جانتی ہیں اور مقامی روایات اور طاقت کے ڈھانچوں سے واقفیت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنی کمیونٹی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان لڑکیوں کو دوران ملازمت بارہا تربیت دی جاتی ہے اور ایک سپروائزر سکول چلاتی / چلاتا ہے۔

غیر رسمی سکولوں کے اوقات کار اور سالانہ سرگرمیاں لچکدار ہوتے ہیں۔ رسمی سکولوں کے سالانہ کیلنڈر اور روزانہ اوقات میں لچک نہیں ہوتی جس کی بنا پر کام کرنے والے بچے یا دیہی کاموں میں مصروف بچے ان میں داخلہ نہیں لے سکتے غیر رسمی سکولوں میں لچک ہوتی ہے اور کوئی بچہ کسی وقت یا کسی بھی دورانیے کے لیے آ کر پڑھ سکتا ہے۔ کام کرنے والے بچے تھوڑی دیر کام چھوڑ کر پڑھنے آ سکتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے بچے فصل کی کٹائی کے دوران چھٹی لے سکتے ہیں' بھٹہ مزدوروں کے بچے شام کے وقت پڑھ سکتے ہیں۔ ان سکولوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف اوقات کے دوران بچوں کو پڑھایا جائے تاکہ ہر بچہ اس سے استفادہ کر سکے۔ عام طور پر یہ سکول تین یا چار گھنٹے تک کھلے رہتے ہیں اور جو بچہ جتنی دیر کے لیے آ سکتا ہے' آ کر پڑھ لیتا ہے۔ کیونکہ ان سکولوں کی استانیاں

مقامی ہوتی ہیں، بچیاں بھی آسانی سے آ کر پڑھ لیتی ہیں۔ عام طور پر سکول کے کچھ معاملات کی ذمہ داری کمیونٹی پر ہوتی ہے ۔ والدین کی کمیٹیاں یا ماؤں کی کمیٹیاں اس بات کی نگرانی کرتی ہیں کہ سکول کا انتظام ٹھیک ہو، سکول میں بجلی کی فراہمی ہو، پنکھے اور بتیاں ہوں، پینے کا صاف پانی ہو، استانی باقاعدگی سے سکول آئے اور بچے بھی باقاعدہ طور پر سکول آئیں۔ اگر کوئی بچہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے یا غیر حاضر رہتا ہے تو یہ بھی سکول کی انتظامی کمیٹی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ سوچا یہی گیا تھا کہ والدین اور مقامی افراد اپنی کمیونٹی کے بچوں کی تعلیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے لیکن درحقیقت بہت سی کمیونٹیاں اس قدر غریب ہیں اور روزی کمانے کی جدوجہد میں اس قدر مشکلات کا سامنا کر رہی ہیں کہ انہیں بچوں کی تعلیم میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔ انہیں معلوم ہے کہ صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کر کے نوکری نہیں ملتی لہٰذا وہ بچوں کو باقاعدگی سے سکول نہیں بھیجتے ۔ بہر حال کئی جگہ پر ایسے سکول بہت کامیابی سے اور کمیونٹی کی پوری شمولیت اور تعاون سے چل رہے ہیں۔

غیر رسمی سکولوں کے اساتذہ کی صورت حال

غیر رسمی سکولوں کے اساتذہ کی اکثریت نوجوان لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے مڈل، میٹرک یا ایف اے پاس کیا ہوا ہے۔ یہ لڑکیاں عام طور پر کمیونٹی میں سے لی جاتی ہیں اور انہیں دوران ملازمت ٹریننگ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے عموماً ان کا پڑھانے کا انداز اور طریقہ سرکاری سکولوں کے اساتذہ سے بہتر ہوتا ہے۔ ان کو تربیت عام طور پر چھٹی والے دن دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کی ایک دن کی چھٹی بھی کام میں چلی جاتی ہے جس کا ان کو کوئی اضافی معاوضہ نہیں ملتا۔ غیر رسمی نظام میں نہ تو طویل گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور نہ موسم سرما کی تعطیل دی جاتی ہے۔ صرف مقامی تہواروں یا پھر عید اور کرسمس پر چھٹی ملتی ہے۔ ان کی تنخواہ عام طور پر 500 روپے ماہوار سے 800 روپے ماہوار ہوتی ہے۔ حال ہی میں ایک دلچسپ مطالعے سے انکشاف ہوا کہ جہاں صرف مرد غیر رسمی سکولوں میں پڑھاتے ہیں وہاں تنخواہ 2500 سے 3500 روپے تک ہے چاہے ان کی تعلیم بھی صرف میٹرک یا ایف اے تک ہو۔ کئی سکولوں میں استانیاں دو شفٹیں پڑھاتی ہیں جس کے نتیجے میں ان کے کام دن تقریباً آٹھ گھنٹے ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سرکاری سکولوں کے

اساتذہ دوپہر ایک ڈیڑھ بجے تک فارغ ہو جاتے ہیں اور ان کی تنخواہ تین یا چار ہزار روپے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غیر رسمی سکولوں کے اساتذہ کی سخت نگرانی کی جاتی ہے جو کہ سرکاری سکولوں میں نہیں ہوتی۔ غیر رسمی تنظیمیں ان اساتذہ کے کام کی کڑی نگرانی کے لیے اکثر مرد سپروائزر رکھ لیتے ہیں۔ خواتین اساتذہ مرد سپروائزر سے زیادہ گھبراتی ہیں اور بات کرنے سے کتراتی ہیں کیونکہ دیہات میں پردے کا رواج زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس طرح ایک روایتی طریقہ استعمال کر کے ان لڑکیوں پر کنٹرول حاصل کیا جاتا ہے۔ مرد سپروائزر کا کوئی کام نہیں ہوتا سوائے ان خواتین پر نظر رکھنے کے اور یہ دیکھنے کے کہ یہ سکول آتی ہیں یا نہیں' پڑھاتی ہیں یا نہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو فیکٹری کے مالک خواتین مزدوروں کو کنٹرول کرنے کی غرض سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان مزدوروں کے اوپر مرد سپروائزر لگا دیتے ہیں جس سے یہ عورتیں آسانی سے دباؤ میں آ جاتی ہیں۔

غیر رسمی سکولوں کی خواتین اساتذہ کو کوئی ایسے حقوق میسر نہیں جو انسانی حقوق کے عالمی منشور میں دیئے گئے ہیں اور جو خواتین کے خلاف ہر قسم کا امتیاز ختم کرنے کے معاہدے میں دیئے گئے ہیں۔ ان کی تنخواہ طے شدہ نچلی حد سے بہت کم ہے کیونکہ یہ غیر رسمی معیشت کا حصہ ہیں۔ اس قسم کی معیشت میں کوئی حساب یا لکھت پڑھت نہیں ہوتی چنانچہ انہیں وہ تنخواہ دی جاتی ہے جو شہروں میں ایک جزوقتی گھریلو خادمہ کی ہوتی ہے۔ بلکہ جزوقتی گھریلو خادمائیں 1000 یا 1200 روپے لیتی ہیں لیکن ان تعلیم یافتہ اساتذہ کو 500 یا 800 روپے ماہوار دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں کوئی اور سہولت میسر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر انہیں کسی قسم کی طبی سہولت نہیں ہوتی' نہ ہی پنشن' بمع تنخواہ چھٹیاں' پراویڈنٹ فنڈ یا دیگر ایسی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ تربیت کی غرض سے جو اتوار کی چھٹی لے لی جاتی ہے اس کی عوض متبادل چھٹی اکثر نہیں دی جاتی۔ انہیں نوکری کا کوئی تحفظ نہیں اور معمولی بات پر نوکری سے برطرف کیا جاسکتا ہے۔ ان اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ یہ گھر گھر جا کر بچوں کو کھینچ کر لائیں جس کے دوران اکثر انہیں کمیونٹی اور والدین کی گالی گلوچ سننا پڑتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمیونٹی انہیں بری نظر سے دیکھتی ہے کیونکہ ان کو گھر گھر جا کر بچوں کو لانا ہوتا ہے اور معلوم کرنا ہوتا ہے کہ بچہ کیوں نہیں آیا۔ اکثر کمیونٹی والے ان پر طنز کرتے ہیں' ان کا مذاق اڑاتے ہیں' باتیں بناتے ہیں کہ یہ برے کردار کی ہیں کیونکہ گھر گھر جاتی ہیں۔ بہت کم

تنظیمیں ایسی ہیں جو ان کے حقوق کی بات کرتی ہیں کیونکہ تنظیموں کا مرکز بچوں کے حقوق ہیں' خواتین کے نہیں ۔ بچوں کے حقوق کی فراہمی کے دوران خواتین کے حقوق فراموش کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ہر چیز کو دوسری چیزوں سے علیحدگی میں دیکھنے کی روش پیدا ہوگئی ہے۔ ہم یہ سوچنے سے قاصر رہتے ہیں کہ جب تک خواتین اساتذہ کے حقوق نہیں ہوں گے اور وہ ناخوش ہوں گی تو وہ بچوں کو متاثر نہیں کر پائیں گی' بچوں کو اچھی طرح پڑھا نہیں پائیں گی۔ وہ صرف اس صورت میں کام میں مکمل دلچسپی لے پائیں گی جب ان کے اپنے حقوق بھی اہم قرار دیئے جائیں اور ان کا استحصال بند کیا جائے۔ انہیں وہ تمام سہولتیں مہیا کرنا ضروری ہے جس کا ذکر فنڈ و ہندگان انسانی حقوق کے عالمی منشور اور عورتوں کے حقوق کے معاہدے میں ہر وقت کرتے ہیں۔ یہی فنڈ دہندگان غیر رسمی تعلیم بھی پھیلا رہے ہیں ۔ انہیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ ترقی ٹکڑوں میں نہیں ہوتی بلکہ مربوط طریقے سے ہوتی ہے جس میں عورتوں' بچوں' مزدورں' کسانوں' استادوں ہر قسم کے کارکنوں کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ آجکل اگر انسانی صلاحیت اور انسانی ترقی کا اس قدر بول بالا ہے تو انسانی ترقی (Human Resource Development) میں سب سے اہم انسانوں کے حقوق ہوتے ہیں ۔ تاہم بہت سے ترقی کے ماہرین ایسے ہیں جن کا کہنا ہے کہ استحصال کے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ جب بھی کسی ملک میں ترقی ہوئی تو کسی نہ کسی کا استحصال کر کے ہی ہوئی کیونکہ ترقی کے عمل میں لازمی طور پر کوئی پاتا ہے اور کوئی کھوتا ہے۔ جہاں عورتوں کی حدتک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ترقی کے عمل میں زیادہ کھوتی ہیں اور کم پاتی ہیں۔ جہاں بھی غیر رسمی معیشت کا ذکر آتا ہے عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ جس طرح صنعتی شعبے میں فری ٹریڈ زون اور آزاد تجارت زون (Export Processing Zone) ایک غیر رسمی معیشت کو جنم دے رہے ہیں ۔ جس میں مزدور خواتین کے کوئی حقوق نہیں' اسی طرح مغربی ممالک' جو ہر وقت حقوق کا پرچار کرتے ہیں' تعلیم کے شعبے میں غیر رسمی معیشت کو فروغ دے رہے ہیں کیونکہ ان اساتذہ کو حقوق دینے کی ضرورت نہیں اور سستے طریقے سے تعلیم فراہم کی جاسکتی ہے۔ جہاں بھی کسی اور کے حقوق کی بات آتی ہے تو عورتوں کے حقوق پامال کر دیئے جاتے ہیں' کبھی ترقی کے نام پر' کبھی قوم کے نام پر' کبھی مذہب و روایت کے نام پر اور کبھی بچوں کے حقوق کے نام پر۔ اس وقت مغربی ممالک کی

MashalBooks.org

حکومتیں اور بڑی بڑی کمپنیاں ایک طرف انسانی حقوق کا زبردست پرچار کر رہی ہیں اور دوسری طرف آزاد تجارت کے زون اور غیر رسمی معیشت کو فروغ دے رہی ہیں۔ اس قسم کی معیشت میں عورتوں کا زبردست استحصال ہو رہا ہے کیونکہ ایسی معیشت میں حساب کتاب نہیں ہوتا۔

نازیہ----عمر 20 سال

''میں نے 1997ء سے سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ شروع میں تو میرے گھر والوں کو بہت اعتراض تھا کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ گاؤں والے کیا کہیں گے؟ لیکن ہم لوگ بہت غریب تھے۔ میری تنخواہ سے گھر والے کم از کم ایک وقت کی روٹی کھا لیتے ہیں۔ میرے والد بیمار ہیں اور چھوٹے بہن بھائی ابھی پڑھتے ہیں اسی سکول میں جہاں میں پڑھاتی ہوں۔ جب میں نے شروع میں پڑھانا شروع کیا تو محلے کے لوگ برا بھلا کہتے تھے اور طعنے دیتے تھے کہ عورت کی کمائی کھاتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے بولنا چھوڑ دیا۔ اب وہ میرے کام کو بری نظروں سے نہیں دیکھتے۔ پہلے کہتے تھے کہ میں ہر گھر جاتی ہوں جو برا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب انہوں نے اپنے بچوں پر تعلیم کا اثر دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔ پہلے تو لوگ گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم ان کے بچوں کو خراب کر دیں گے۔ ایک دفعہ تو گھر والوں نے تنگ آ کر کہہ دیا کہ کام چھوڑ دو لیکن میں نے بھی کام چھوڑ دیا تو ہم لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ والدہ محلے کے لوگوں کے کپڑے سی کر گزارا کرتی ہیں اور میں پانچ سو روپے مہینہ کما لیتی ہوں تو گزارا ہو جاتا ہے''۔

''میں صبح سات بجے سے لے کر شام چار بجے تک کام کرتی ہوں۔ بیچ میں کھانے کی چھٹی ہوتی ہے۔ بچوں کی ایک شفٹ صبح ہوتی ہے اور دوسری شام کو۔ کئی بار شام کو بچوں کے گھر جانا پڑتا ہے تاکہ پتا چلے کہ کوئی بچہ کیوں سکول نہیں آ رہا۔ کئی دفعہ مائیں ڈانٹ بھی دیتی ہیں لیکن ہمیں سکول والوں سے آرڈر ہوتا ہے کہ گھروں میں جانا ہے۔ ہمیں ہر وقت ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کمیونٹی کے کچھ لوگ اب بھی کہتے ہیں کہ یہ تو سکول ہے ہی نہیں، یہاں تو کھیل کود اور وقت گزاری ہوتی ہے۔ نہ یونیفارم ہے، نہ سزا دیتے ہیں لیکن ہم ان بچوں کو نئے طریقے سے پڑھاتے ہیں۔ ہمیں ٹریننگ دی جاتی ہے کہ سزا مت

MashalBooks.org

دو۔ کئی بار بچے اتنا ستاتے ہیں کہ تحمل نہیں رہتا لیکن ہمیں خود پر کنٹرول رکھنا پڑتا ہے سکول میں تقریباً دوسو بچے ہیں اور تمام ستائے ہوئے گھروں کے ہیں۔ میری تنخواہ پانچ سو روپے ہے جو آج کل کے زمانے میں پوری نہیں پڑتی ۔ ہمیں ترقی ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دوسری بھی کوئی سہولت نہیں لیکن مالکان سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جہاں تم کچھ بھی نہیں کر رہی تھیں وہاں ہم نے تمہیں نوکری دی ہے' خوش نہیں ہو تو چھوڑ جاؤ۔ کبھی کبھی اتوار کو بھی ٹریننگ کے لیے بلا لیتے ہیں تو گھر کے سارے کام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اس کا ہمیں کوئی اضافی معاوضہ نہیں ملتا''۔

''سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ توقعات بہت زیادہ ہیں۔ہم سے کہہ دیتے ہیں کہ کتاب بھی ختم کروانی ہے' کھیل کے طریقے سے بھی پڑھانا ہے بچوں کو سزا بھی نہیں دینی اور کتاب سے ہٹ کر چیزیں بھی پڑھانی ہیں۔ اتنا کچھ اتنے کم وقت میں ممکن نہیں۔ اگر کتاب پڑھائیں تو کھیل کس وقت کروائیں۔ اگر کھیل کود کروائیں تو وقت پر کتاب ختم نہیں ہو گی۔ کہتے ہیں بچوں پر بوجھ بھی نہ ڈالو لیکن انہیں سب کچھ آنا چاہیے۔ ذرا سی غلطی ہو جائے تو سپروائزر صاحب ڈانٹ بھی دیتے ہیں ۔اب وہ مرد ہیں' عورتوں کے کئی ایسے مسئلے ہوتے ہیں جن پر وہ کسی مرد سے نہیں بات کر سکتی ۔ ہم ایک دوسرے کو بتا دیتے ہیں مگر سپراوائزر صاحب کو کیسے سمجھائیں؟ ایک مرتبہ جب ہمیں سپروائزر صاحب پر غصہ آیا تو ہم نے مل کر سوچا کہ ہم میں سے کوئی سکول نہیں آئے گا؟ خود بچوں کو سنبھالیں' جب سپروائزر صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے تنظیم کے افسروں کو بلالیا۔ مل جل کر بات ہوئی تا ہم نے بتایا کہ سپروائزر صاحب ہمارے مسائل کو نہیں سمجھتے ۔ انہوں نے ان کو ڈانٹا اور خبر دار کیا کہ آئیندہ ایسا نہیں ہونا چاہئے ۔اس کے بعد سپروائزر صاحب نے سب کے سامنے ہماری بے عزتی تو نہیں کی لیکن ہر کام میں کیڑے نکالتے ہیں اور بلاوجہ تنقید کرتے ہیں لیکن ہمیں پرواہ نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کتنی محنت کر رہے ہیں''۔

''میرا خیال ہے کہ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ عورتوں کے لیے عورت سپروائزر ہونی چاہئے' وہ عورتوں کے مسائل کو بہتر سمجھ سکتی ہے۔ لیکن شاید انہوں نے یہ سپروائزر صاحب اسی لیے رکھے ہوئے ہیں کہ ہم اپنے مسائل کا ذکر نہ کر سکیں۔ گھروں میں عورتوں کے بہت مسائل ہوتے ہیں' کوئی رشتہ دار آ گئے' رشتے کی بات چل پڑی' کوئی شادی موت وغیرہ ہو

گئی تو دوسروں سے بالکل علیحدہ زندگی مشکل ہو جاتی ہے لیکن ہمارا چھٹی کرنا انہیں بہت برا لگتا ہے۔ ہماری مزاحمت کا یک طریقہ ہوتا ہے کہ کسی دن اگر دل کسی بات سے رنجیدہ ہو یا سپروائزر کوئی زیادتی کریں تو ہم بچوں کونہیں پڑھاتے اور کلاس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ چاہے بچے کچھ بھی کریں ہم انہیں نہیں روکتے ۔ یہ ہم سب مل کر کرتے ہیں تاکہ کسی ایک پر الزام نہ آئے۔ ہماری یہ یکجہتی ہمارے کام آتی ہے۔جس دن کسی ایک ٹیچر کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوتی ہے۔ ہم سب مل کر اس سے نمٹ لیتی ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیتی ہیں۔ اس طرح سب کی نوکری کا تحفظ رہتا ہے کیونکہ وہ ہم سب کو اکٹھا نہیں نکال سکتے''۔

''گھر میں کوئی زیادتی ہو تو میں اکثر خاموش ہو جاتی ہوں۔لیکن جب کوئی بہت ناپسندیدہ بات ہو تو لڑ بھی پڑتی ہوں۔ ایک دفعہ کچھ لوگ میرا رشتہ لینے آگئے جو مجھے پسند نہیں تھے۔ میں نے صاف انکار کر دیا جس پر والد صاحب نے مجھے تھپڑ بھی مارا لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی اور میں اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ گھر والوں کو انکار کرنا پڑا۔ مجھے وہ لڑکا ہرگز پسند نہیں تھا' وہ آوارہ اور لوفر قسم کا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں شادی کے بجائے خود کما کر زندگی گزاروں گی' شادی میں کیا رکھا ہے؟ صبح شام کی غلامی ۔کم از کم اس سکول میں بچوں کے ساتھ خوش تو رہتی ہوں۔صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ہماری تنخواہوں میں کچھ اضافہ ہو جائے اور کوئی طبی سہولتیں وغیرہ مل جائیں کیونکہ ہمارے پاس علاج کے بھی پیسے نہیں ہوتے''۔

زینب----عمر 18 برس

میں نے سکول میں نوکری اس لیے کی کہ ہمارے گھر کے حالات بہت خراب تھے۔ والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی نشے کے عادی ہو گئے اور مجھے میری بہنوں اور والدہ کو مارنے پیٹنے لگے' میں اکیلی پورے کنبے کی کفالت کرتی ہوں ۔ جو کماتی ہوں وہ بھی بھائی چھین کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری کچھ زمین تھی جس پر چچا نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہمارا حصہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ گھریلو حالات تنگ ہیں لیکن میں ان سے نہیں گھبراتی ۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ حالات سے شکست کھا جانا بزدلی ہے۔ میرا پکا ارادہ ہے کہ میں حالات کا مقابلہ کروں گی اور جیتوں گی۔ بچپن سے ہی مجھ میں بہت ہمت تھی۔ جب

بھائی مجھے مارتے تھے تو میں پوری طرح ان کا مقابلہ کرتی تھی حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں لیکن میں کبھی ڈری نہیں۔ میں پہلی لڑکی تھی اس گاؤں کی' جس نے سکول میں ملازمت اختیار کی۔ اس پر گاؤں والوں کا رویہ بہت منفی تھا۔ ایک دو مرتبہ کچھ لڑکوں نے میرا تعاقب کیا اور تنگ بھی کیا لیکن جب میں چیخی چلائی تو وہ ڈر کر بھاگ گئے کیونکہ ہمارے گاؤں میں لوگ اس قسم کے لڑکوں کو چھوڑتے نہیں۔ میں نے رشتہ داروں اور گاؤں والوں کے طعنوں اور لعنت ملامت کے باوجود نوکری کر لی کیونکہ میں گاؤں کے بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی اور اپنی تعلیم کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ مجھے پڑھانے کا بہت شوق ہے اور مزا آتا ہے۔ لیکن سکول کے سپروائزر صاحب کو رعب جمانے اور بلاوجہ اپنی طاقت دکھانے کا بہت شوق ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے ہم سب استانیوں کی بہت بے عزتی کی اور سب کی تنخواہ میں سے کٹوتی کی دھمکی دی۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے دوسروں سے مل کر بات کی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم سب لوگ مل کر استعفٰی دے دیں گے حالانکہ ہمیں نوکری کی ضرورت ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہم سب کے اکٹھے جانے پر سکول نہیں چلا سکیں گے۔ جب ہم نے مل کر سکول چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو وہ انتظامیہ سے ڈر گئے اور وعدہ کیا کہ آئندہ اپنا رویہ بہتر رکھیں گے۔ اب وہ ہر وقت ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم ان کی شکایت اوپر تک نہ لگا دیں کیونکہ اوپر کے افسر ہم سے اچھا سلوک کرتے ہیں'۔

'' کام کے لحاظ سے ہماری تنخواہ بہت کم ہے۔ ہمیں کل 800 روپے ملتے ہیں جبکہ سرکاری اساتذہ پورا دن کچھ نہیں کرتے اور تین چار ہزار لے لیتے ہیں۔ ہم نہ صرف آئے دن ٹریننگ پر جاتے ہیں' کئی دفعہ اتوار کو بھی ٹریننگ ہوتی ہے اور گھر والے بڑ بڑ کرتے ہیں' ہم گھروں سے جا جا کر بچوں کو لاتے ہیں' گاؤں والوں اور والدین کی گالی گلوچ سنتے ہیں۔ لیکن ہماری تنخواہ 800 روپے ماہوار ہے اور کوئی بھی ایسی سہولت نہیں ہے جو سرکاری ٹیچروں کو ملتی ہے۔ یہ بہت زیادتی ہے جب ہم تنخواہ بڑھانے یا سہولتوں کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بجٹ میں اتنے پیسے نہیں ہیں۔ بجٹ میں پجارو گاڑی' بڑی بڑی کوٹھیوں اور دفتروں اور کمپیوٹروں کے پیسے تو نکل آتے ہیں لیکن ہمارے لیے نہیں نکلتے۔ پتا نہیں کون ایسا بجٹ بناتا ہے جس میں فضول چیزوں کے پیسے تو ہیں' ضرورت کی چیزوں کے نہیں۔ یہاں پر اکثر لڑکیاں مجبوری کے تحت کام کرتی ہیں۔ مہنگائی

MashalBooks.org

بہت زیادہ ہے اس لیے ہم مجبور ہیں ورنہ ہم اس طرح کی نوکری نہ کریں جس میں اتوار کی بھی اکثر چھٹی لے لی جائے لیکن جب ہم یک چھٹی کر لیں تو تنخواہ کٹ جانے کی دھمکی ملے۔ آخر ہم انسان ہیں' کوئی مشین تو نہیں۔ لگا تار ہفتے میں سات دن کون کام کر سکتا ہے؟ خاص طور پر بچوں کے ساتھ جو ویسے ہی تھکا دیتے ہیں۔ اگر ہم کبھی یہ موضوع چھیڑیں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمیں صرف اپنا نہیں سوچنا چاہئے۔ محلے کے بچوں کے لیے جذبہ ہونا چاہیے اور اپنے محلے کی بہتری میں خوشی سے شامل ہونا چاہئے۔ لیکن میں سوچتی ہوں محلے کی بہتری میں ہماری کیا بہتری ہے' ہمارے حقوق کہاں ہیں؟ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ اگر تنظیم پجارو خریدتی ہے تو اس میں محلے کی کیا بہتری؟ بڑے بڑے نئے نئے کمپیوٹروں میں محلے کی کونسی بہتری ہے؟ وہی پیسے اگر ٹیچروں کو دے دیں تو شاید زیادہ بہتری ہو اور ہمارا بھی کام میں زیادہ دل لگے۔ ہم نے سوچا اگلی ٹیچرز میٹنگ میں ہم یہ بات ضرور اٹھائیں گے۔ میں تو پہلے ہی بدنام ہو چکی ہوں کہ میں لیڈر ہوں' یونین بناتی ہوں' دوسروں کو اکساتی ہوں' تنگ کرتی ہوں' اس لیے مجھے پروا نہیں کہ کوئی کیا کہے گا۔ میں اپنے حق کے لیے ہمیشہ لڑوں گی' چاہے پورا محلّہ ناراض ہو جائے' میں ڈر کر جینا نہیں چاہتی کیونکہ اگر کوئی سچا ہو تو اس کو شیر دل ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ زندگی کیا ہے؟ دو دن جینا ہے کیوں نہ خوشی سے جئیں' رو رو کر تو کچھ نہیں ملتا''۔

اختتامیہ

اساتذہ کے اس تجزیے سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ سرکاری، نجی اور غیر رسمی تینوں شعبوں میں خواتین اساتذہ کا مختلف طریقوں سے استحصال ہوتا ہے۔ جنسی ہراسانی سرکاری سکولوں کے اساتذہ کے تجزیے میں نظر آئی لیکن خواتین نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ اس کے علاہ تنخواہ کے کٹ جانے، چھٹی نہ دینے اور اتوار کو کام کروانے کی مثالیں نجی اور غیر رسمی دونوں قسم کے سکولوں میں ملیں۔ خواتین اساتذہ پر مرد سپروائزر رکھ کر انہیں دبانے کی مثالیں سرکاری اور غیر رسمی شعبوں میں سامنے آئیں۔ سب سے زیادہ استحصال غیر رسمی شعبے کی اساتذہ کی مثالوں میں نظر آیا۔ ان کی نہ صرف تنخواہ بہت کم ہوتی ہے بلکہ ان کو کوئی سہولت میسر نہیں ہوتی اور اوقات کار طویل ہوتے ہیں۔ آج کل غیر رسمی معیشت کو پیداواری اخراجات کم کرنے کی غرض سے فروغ دیا جا رہا ہے اور یہ معیشت ریاست کے معائنے سے باہر رہتی ہے اور اس میں ہر قسم کے حقوق معطل ہو جاتے ہیں۔

تینوں قسم کے اساتذہ میں ایک طبقاتی فرق نمایاں طور پر نظر آیا۔ نجی سکولوں کے اساتذہ شہروں یا دیہاتوں کے قدرے بہتر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہروں کے اونچے درجے کے نجی سکولوں میں امیر یا اوپر کے متوسط طبقوں کے افراد کام کرتے ہیں۔ ان کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سکول میں کام کرنے والی استاد عقیلہ کا بنیادی مسئلہ تھا گھٹن اور ''نروس بریک ڈاؤن''، جس سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ اکثر ملک سے باہر اکیلے گھومنے چلی جاتی ہیں۔ ان کو اپنے شوہر سے فرار چاہئے۔ یہ مسائل عام طور امیر طبقوں کی خواتین میں پائے جاتے ہیں کیونکہ معاشی طور پر وہ خوشحالی ہوتی ہیں۔ ان کے لیے گھومنا پھرنا، سیاحت کرنا راہ فرار ہوتی ہے اور وہ خود کو بے حد خود مختار اور آزاد ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔

اس کے برعکس غیر رسمی سکولوں کی استانیاں دیہات کے غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے مسائل بنیادی طور پر معاشی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر زینت نے والد کی وفات کے بعد خاندان والوں کی کفالت کے لیے نوکری کی جبکہ عقیلہ نے ذہنی سکون اور آزادی وخودمختاری کے لیے کی۔ زینب 800 روپے میں پوری کنبے کو سنبھالتی ہے جبکہ عقیلہ اپنی تنخواہ جمع کر کے بیرون ملک سیر کرنے جاتی ہے۔ سرکاری سکولوں کے اساتذہ کا سماجی رتبہ ان دونوں کے بیچ میں ہوتا ہے کیونکہ ان کی حالت نجی سکولوں کے اساتذہ کے مقابلے میں ابتر ہوتی ہے وہ غیر رسمی سکولوں کے اساتذہ کے مقابلے میں خوشحال ہوتے ہیں لیکن انہیں ہر دم تبادلے کا ڈر رہتا ہے اور یہ ان کے کنٹرول کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔

رشیدہ کی کہانی سے جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ شوہر کا اس کی تنخواہ پر پورا قبضہ تھا جبکہ اپنی تنخواہ سے وہ جائیداد بناتا رہا۔ جب ذراسی بات ہوئی تو رشیدہ کی کمائی اور اس کے بیچے ہوئے زیورات کو بھلا کر اسے گھر چھوڑ نے کو کہہ دیا اور اپنی برتری دکھائی۔ جائیداد صرف اپنے نام پر بنائی جبکہ رشیدہ کی ملازمت کے بغیر یہ جائیداد بنانا ممکن نہیں تھا۔ ایسی کئی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں جن میں شوہر تمام عمر بیوی کی تنخواہ پر گزارا کرتے ہیں اور اپنی آمدنی سے جائیداد بناتے ہیں لیکن بیس یا تیس برس بعد بھی گھریلو کشیدگی پر بیوی کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ رشیدہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور اپنی زندگی خود بنالی اور اب وہ مکمل طور پر خودمختار ہوگئی ہے۔

جو بات سکولوں کے اساتذہ کے مطالعے سے سامنے آئی وہ یہ ہے کہ عورتوں نے ظلم، جنسی ہراسانی اور تشدد کے باوجود مظلوم بن جانے سے انکار کیا۔ رشیدہ نے پورے خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود استحصالی شوہر کو چھوڑ دیا اور خودمختار ہوگئی' زینب نے والد کی وفات کے بعد کنبے کو سنبھال لیا جبکہ اس کا بڑا بھائی نشے باز بن گیا اور تشدد کی طرف مائل ہوگیا۔ دیہات کی لڑکیوں نے سپروائزر کے خلاف متحدہ مزاحمت کر کے اس کا رویہ بدل ڈالا۔ دوسرے دیہاتی سکول میں خواتین اساتذہ نے مل کر استعفٰی دے دیا جس سے انتظامیہ کو ان کی بات ماننا پڑی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مزاحمت کے ان طریقوں میں کسی نے ان کی رہنمائی نہیں کی' کوئی لیڈر یا Activist نہیں آیا بلکہ انہوں نے خود اپنے لیے آواز اٹھائی۔ نازیہ نے والد کی مار پیٹ کے باوجود مرضی کے خلاف شادی سے انکار کر دیا۔

چنانچہ ان تمام خواتین میں مزاحمتی مادہ بھرپور انداز سے نظر آتا ہے۔ تاہم باقی شعبوں کی خواتین کی طرح ان میں سے بھی کئی نے کہا کہ وہ خاموش ہو جاتی ہیں، رو لیتی ہیں، چپ کر جاتی ہیں۔ خاموشی عورت کا آخری راستہ ہوتی ہے یا پھر وہ دوسروں سے بات کر کے دل ہلکا کر لیتی ہیں۔ عورتوں کے ساتھ جس قسم کی زیادتی ہوتی ہے وہ مردوں سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ یہ جنسی ہراسانی اور مردانہ رعب کا شکار بنائی جاتی ہیں۔ عورتوں کا مزاحمت کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے کیونکہ وہ اکثر مردوں کے برعکس براہ راست مار پیٹ یا جارحیت اختیار نہیں کرتیں بلکہ مل جل کر مختلف طریقوں سے حالات کا مقابلہ کرتی ہیں اور اکثر کامیاب رہتی ہیں۔

MashalBooks.org

پانچواں باب

مزاحمت اور گھریلو نوکرانیاں

گھریلو نوکر اور نوکرانیاں مختلف شعبوں کے مزدوروں میں سب سے زیادہ استحصال کا شکار ہیں۔ پاکستان میں لاکھوں افراد' جن میں مرد' عورتیں اور بچے شامل ہیں گھریلو ملازمت کر رہے ہیں۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو روزگار کی تلاش میں گاؤں چھوڑ کر شہر کی سمت گامزن ہوئے اور انہیں لوگوں کے گھروں میں بطور ڈرائیور' خانساماں' آیا' جمعدار' مالی یا دیگر قسم کا کام ملا ان میں بیشتر وہ لوگ ہیں جن کی زمینیں ان سے چھن گئیں یا پھر کنبے کے افراد اتنے زیادہ تھے کہ زمین سے گزارا مشکل ہو گیا اور انہوں نے شہر کا رخ کیا۔

ان میں سے اکثریت غیر تعلیم یافتہ افراد کی ہے اور ان کی بہت بڑی تعداد کو کوئی خاص ہنر نہیں آیا۔ ان میں سے اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن کے لیے کوئی ہنر درکار نہیں ہوتا۔ مثلاً گھروں کی صفائی 'برتن دھونا' چوکیداری یا پھر چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال۔ جن کاموں میں ہنر درکار ہوتا ہے ان کی اجرت زیادہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کار ڈرائیور اور خانساماں عموماً زیادہ تنخواہ لیتے ہیں جبکہ چائے وغیرہ دینے والا بیرا' برتن دھونے والا مسالچی اور جمعدار بہت کم معاوضے پر دستیاب ہوتے ہیں۔ مالی یا چوکیدار بھی زیادہ پیسے لیتے ہیں کیونکہ مالی کو مخصوص ہنر اور علم کی ضرورت ہوتی ہے اور چوکیدار کا کام کٹھن اور خطرے سے بھرپور ہوتا ہے۔

جن کاموں میں معاوضہ بہت کم ہے وہ اکثر دیہات کی عورتیں سرانجام دیتی ہیں

مثال کے طور پر جمعدارنی ' صفائی کرنے والی' برتن یا کپڑے دھونے والی بہت کم پیسوں میں یہ مشکل اور تھکا دینے والے کام کرتی ہیں۔ جن کاموں میں زیادہ معاوضہ ملتا ہے جیسے چوکیداری یا ڈرائیوری' ان میں عموماً مرد ہوتے ہیں کیونکہ تکنیکی ہنر درکار ہوتا ہے مثلاً بندوق کا استعمال یا کار چلالینا اور اس کی مرمت وغیرہ کروالینا۔

بعض دفعہ پورا کنبہ دیہات سے شہر کی طرف کوچ کرتا ہے اور کسی صاحب حیثیت شخص کے گھر نوکری کر لیتا ہے جہاں اسے کوارٹر مل جاتا ہے۔ اس طرح کنبے کے تمام افراد کام کرتے ہیں جن میں بچے شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً گھر کا مرد ڈرائیور یا خانساماں ہوتا ہے' بیوی کپڑے دھوتی ہے' انہیں استری کرتی ہے اور صفائی کرتی ہے' بچے چھوٹے بچوں کا خیال رکھتے ہیں یا والدین کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے کرتے ہیں۔

شہر کے پسماندہ علاقوں کے افراد بھی گھریلو خدمت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ شہری آبادی کے مسیحی افراد اکثر سفائی کے کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جمعدار یا خاکروب وغیرہ۔ مرد وعموماً میونسپل کارپوریشن کے کوڑا اٹھانے کے کام کرتی ہیں۔ اکثر ان کے کمسن بچے بھی ان کے ساتھ صفائی کے کاموں میں شامل ہوتے ہیں چونکہ صفائی کا کام گھٹیا یا گندا سمجھا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر مسیحی لوگوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے بےعزتی سے لفظ'' چوڑا'' استعمال کیا جاتا ہے۔ انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے اور ان کے خلاف عموماً بے شمار مذہبی اور دیگر تعصّبات ہوتے ہیں۔ مسلمان مالکان اور ان کے مسلمان ملازم بھی اکثر ان کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اکثر گھروں میں ان کے برتن علیحدہ ہوتے ہیں اورا ن کی ہرچیز علیحدہ رکھی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف بے حد غریب ہوتے ہیں بلکہ مذہبی تعصّبات کی وجہ سے ان سے غریب مسلمان ملازم بھی برا سلوک روا رکھتے ہیں

تاہم گزشتہ پندرہ بیس برس میں لوگوں کے رویوں میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے کیونکہ کئی گھروں میں مسیحی خواتین جزوقتی طور پر خانساماں کا کام کرتی ہیں اور ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا برا یا گندا نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ تبدیلی صرف چند ایسے گھروں میں نمودار ہوئی ہے' جہاں مذہبی تعصّبات قدرے کم ہیں۔ لوگ ذرا زیادہ تعلیم یافتہ ہیں' نوجوان ہیں اور کشادہ ذہن ہیں۔ بیشتر گھروں میں اب بھی مسیحی برادری کو چوڑا کہہ کر حقیر اور کمتر بنادیا جاتا ہے۔

متوسط طبقوں کے لوگوں میں تعصّبات کافی زیادہ ہیں اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ ان سے بو آتی ہے، یہ صاف نہیں ہوتے اور ان سے کسی قسم کے تعلق سے انسان ناپاک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ پلید سمجھے جاتے ہیں۔ جب سے حکومت نے 295.C کا قانون بنایا ہے جس کے تحت توہین رسالت کی سزا موت ہے، مسیحی برادری کے کئی غریب معصوم افراد کو محض تعصب کی بنا پر اس قانون کی زد میں پھنسایا گیا ہے۔ توہین رسالت کے مجرم سلامت مسیح کو تو تقریباً تختہ دار تک پہنچا دیا گیا تھا۔ 1996ء میں شانتی نگر میں لوگوں نے غلط معلومات کی بنا پر مشتعل ہو کر مسیحی برادری کے ہزاروں افراد کے گھروں کو نذر آتش کر دیا اور مقامی انتظامیہ نے کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ اس ظلم کو روکا جاتا۔ چنانچہ مسیحی برادری کے گھریلو خادم دوہرے ظلم کا شکار ہیں ایک طرف شدید غربت ہے اور دوسری طرف مذہبی عدم رواداری۔

ہر قسم کے ملازمین میں سے گھریلو ملازمین کی حالت سب سے زیادہ ابتر ہے۔ یہ غیر رسمی معیشت کے اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نہ کوئی باقاعدہ معلومات ہیں اور نہ ہی کوئی قوانین ان کی حفاظت کے لیے مرتب کئے گئے ہیں۔ غیر رسمی شعبے سے منسلک ہونے کے باعث نہ تو ان کی اجرت کی کوئی نچلی حد مقرر ہے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی قانونی حق یا سہولت انہیں میسر ہے۔ ان کے کام کے اوقات طویل ہیں، آرام و تفریح کے مواقع بے حد محدود۔ اور ان پر ظلم و تشدد کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ یہ اپنی مجبوریوں کے تحت مکمل طور پر مالکان کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ مالکان جیسا سلوک چاہے، کرتے ہیں، ان کے مجال نہیں کہ کچھ کریں کیونکہ انہیں کھڑے پاؤں نوکری سے برطرف کیا جاسکتا ہے، مارا پیٹا جاتا ہے اور تنخواہ چھوٹے چھوٹے بہانوں سے کاٹ لی جاتی ہے ان کا مکمل انحصار مالکان کی خوشنودی، انسانیت اور رحم و کرم پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ گھروں کی دیواروں کے اندر بند اکیلے کام کرتے ہیں ان کے کام کی جگہ کے حالات سے کسی کو واقفیت نہیں ہوتی اور مالکان کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔

عاصم حسین، اکتوبر کی 10 تاریخ 1998 کو انگریزی اخبار ''دی نیوز'' کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ گھریلو ملازمین کارکنوں کا وہ طبقہ ہے جو خاموشی سے گھروں کی دیواروں کے پیچھے ایک تلخ زندگی گزار رہا ہے اور مشکل ترین حالات سے گزر رہا ہے۔ یہ زیادہ تر غریب ترین طبقے کے اَن پڑھ افراد ہیں جن کی مجبوریوں کا زبردست فائدہ اٹھایا

MashalBooks.org

جاتا ہے اور جنہیں معاشرے نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ ان کے کام کے حالات پر کسی قسم کی کڑی نظر رکھنا ناممکن ہے۔ ان کی بے انتہا کم اجرت ہوتی ہے اور ان کے مالکان پر ہر دم ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔ انہیں نہ تو ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے اور نہ ہی بیماری کی حالت میں انہیں چھٹی یا آرام کا وقت دیا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب ان کے بچے بیمار ہوں تو انہیں کوارٹر میں جا کر بچے کا خیال نہیں رکھنے دیا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ کام ختم کرنے کے بعد جائیں جبکہ کئی گھروں میں ان کا کام رات ڈیڑھ بجے تک مہمانوں کی پذیرائی میں لگے رہنا ہے اور جب تک مالک خود نہ سو جائیں انہیں بھی نیند کی اجازت نہیں ہوتی۔ مالک صبح گیارہ یا بارہ بجے تک خواب خرگوش میں رہتے ہیں جبکہ ملازمین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر خدمت میں مصروف ہو جائیں۔ انہیں بغیر نوٹس دیئے نوکری سے نکالا جاسکتا ہے' گالی گلوچ اور مار پیٹ روز مرہ کا معمول ہوتی ہے۔ اگرچہ چند مالکان رحمدل ہوتے ہیں لیکن اکثر جگہ پر انہیں اذیت بھی دی جاتی ہے۔

جسمانی اور ذہنی مار پیٹ اور اذیت کے علاوہ جنسی اذیت' ہراسانی اور زنا بالجبر کی بھی ان گنت مثالیں ملتی ہیں۔ عاصم حسین ایک نوجوان لڑکی کی کہانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بچی ایک امیر گھر میں کام کرتی تھی۔ اس کا مالک وقتاً فوقتاً اس پر دست درازی کرتا تھا۔ اس کے احتجاج کے باوجود اس کی بیوہ اور غریب ماں نے اسے مجبور کیا کہ وہ نوکری کرتی رہے۔ وہ نوکری چھوڑ دیتی تو دیہات میں اس کے کنبے کے چھ افراد بھوک سے مر سکتے تھے۔ مالک اپنی بیوی کے منع کرنے کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ آخر مالکن نے اس لڑکی کی کہیں اور نوکری لگوادی۔ اس طرح دونوں عورتوں کو ایک درندے سے نجات ملی۔ بیوی کو شوہر کی بے راہروی سے اور ایک غریب لڑکی کو جسمانی اور ذہنی اذیت سے۔ اس طرح کے ہزاروں قصے آئے دن سننے میں آتے ہیں۔ شدید غربت کے باوجود کئی والدین اپنی بچیوں کو ایسے گھروں میں رکھوانے سے گریز کرتے ہیں جہاں مرد خاص طور پر نوجوان مرد موجود ہوں۔ اس سے ان کی بھوک اور افلاس بڑھتی ہے لیکن انہیں گوارا نہیں ہوتا کہ بیٹی کی ایسی بے حرمتی اور بے عزتی دیکھیں۔

جب کبھی ملازم احتجاج کریں یا نوکری ترک کرنے کا فیصلہ کریں تو انہیں چوری کے جھوٹے مقدمات میں ملوث کر دیا جاتا ہے جس سے وہ پولیس کے حوالے ہو جاتے

ہیں۔ پولیس کے تشدد سے یہ اس قدر گھبراتے ہیں کہ مالک کی ہر زیادتی خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ملازم عورتوں پر تو پولیس زنا بالجبر اور دیگر قسم کے ظلم ڈھاتی ہے۔ مالکان چند روپے پولیس والوں کے دے کر نہ صرف ملازم کو ڈرا دھمکا لیتے ہیں بلکہ ان پر تشدد بھی کروا لیتے ہیں۔ عاصم حسین لکھتے ہیں کہ چند ایسے قصے بھی ہیں جہاں گھریلو ملازمین کو قتل کر دیا گیا لیکن مالک کی طاقت اور پولیس کے طریقہ تفتیش سے ملازم کا کنبہ اس قدر گھبرایا کہ اس نے مقدمہ درج کروانے سے انکار کر دیا۔

ان تمام مظالم کے باوجود لوگ اس قسم کی نوکری اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ معیشت میں ان کے لیے کوئی اور جگہ نہیں۔ عاصم حسین کے مشاہدے کے مطابق بے روزگاری، افراط زر، وسائل کا فقدان اور تعلیم کے کم مواقع کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہات کے غریب لوگ اس قسم کی نوکری لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دوسری طرف شہروں کی خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملازمت اختیار کر رہی ہیں تاکہ گھریلو اخراجات پورے ہو سکیں۔ نتیجے کے طور پر انہیں گھریلو کاموں میں مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضرورت کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ روزگار فراہم کرنے والی ایجنسیاں قائم ہو گئی ہیں جو دیہات کے سیدھے سادھے لوگوں کا مزید استحصال کرتی ہیں۔

یہ چھوٹی چھوٹی روزگار ایجنسیاں نوکری کی تلاش میں افراد اور مالکان کا آمنا سامنا کرواتی ہیں۔ زبانی معاہدے کرواتی ہیں۔ اگر ضرورتمند کو نوکری مل جائے تو اس کی نصف تنخواہ بطور کمیشن ان ایجنسیوں کو جاتی ہے اور مالکان سے بھی رقم وصول کی جاتی ہے۔ چونکہ گھریلو ملازمین کی ضمانت دینا مشکل ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر ایسی ایجنسیاں ڈرائیور وغیرہ کی نوکری کا انتظام کرتی ہیں۔ جہاں وہ ان ملازمین کو ذاتی طور پر نہیں جانتیں، وہاں ان کے شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات سنبھال لیتی ہیں یا مالکان کے پاس رکھوا دیتی ہیں تاکہ کچھ ضمانت یقینی ہو جائے۔ کئی دفعہ ملازم کو تاحیات پابند رکھنے کی خاطر یا بطور سزا اس کے کاغذات ضبط کر لیے جاتے ہیں تاکہ نہ تو وہ کہیں اور نوکری کر سکے اور نہ اپنی تنخواہ کا مطالبہ کر سکے۔ اس طرح ملازم مکمل طور پر مالک کے کنٹرول میں پھنس کر غلام بن جاتا ہے اسے اس کی تنخواہ بھی ملے تو بھی وہ کام کرنے پر مجبور رہتا ہے۔

عاصم حسین لکھتے ہیں کہ گھریلو ملازمین میں 80 فیصد عورتیں اور بچے ہوتے ہیں۔

ان کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی برتی جاتی ہے۔ کئی دفعہ تو صرف ایک شخص کی تنخواہ دی جاتی ہے اور بیوی اور بچے بلا معاوضہ گھر میں کام کرتے ہیں کیونکہ انہیں کوارٹر ملا ہوا ہوتا ہے بچے والدین کے معاون کے طور پر کام کرتے ہیں لہٰذا ان کی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی۔تقریباً 95فیصد گھروں میں کھانا پکانے اور صفائی کا کام عورتیں اور بچے سرانجام دیتے ہیں۔ عام طور پر ان کے مالکان کا تعلق امراء طبقے یا پھر متوسط طبقوں سے ہوتا ہے' مرد عموماً مالی چوکیدار یا ڈرائیور ہوتے ہیں۔

خواتین گھریلو ملازمین کی اجرت بہت کم ہوتی ہے مثال کے طور پر نوراں جو کہ 45برس کی عمر کی عورت ہے اور ایک امیر خاندان میں کام کرتی ہے' مہینے کے 2200روپے کما لیتی ہے،۔اسے مالکان نے کوارٹر دے رکھا ہے۔ اسے کسی اور جگہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہے اس کے خاوند اور بچوں کو بھی گھر میں رہنے کے لیے وقتاً فوقتاً گھر کے مختلف کام کرنا پڑتے ہیں لیکن اس کام کی علیحدہ اجرت نہیں ہوتی۔

اکثر زمیندار یا جاگیردار دیہات سے اپنے مزارعوں کے بچوں کو گھریلو خدمت کی غرض سے شہر لے جاتے ہیں۔ انہیں مہینے میں 1000روپے سے لے 2000 روپے تک ملتے ہیں۔ یہ پیسے مہینے کے شروع میں ضرورتمند والدین کو دے دیئے جاتے ہیں ۔ یہ بچے عموماً دس یا بارہ برس کی عمر کے ہوتے ہیں اورانہیں ان پیسوں کے عوض دس یا بارہ گھنٹے جسمانی مشقت کرنا ہوتی ہے۔ ان پر چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی بنا پر ظلم وتشدد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ پوری طرح زمیندار کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اکثر مفلس اور مجبور والدین نوجوان لڑکیوں کو زمینداروں اور جاگیرداروں کے گھروں میں کام کی غرض سے بھیج دیتے ہیں کئی دفعہ یہ لڑکیاں جنسی تشدد کا شکار ہو جاتی ہیں جیسا کہ صفیہ بی بی کے مشہور قصے میں ہوا۔ اس نابینا لڑکی کو زمیندار کے بیٹوں نے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا اور بعد میں حدود کا مقدمہ درج کرایا اور صفیہ بی بی کو کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اس مقدمے کا سن کر عورتوں کی تحریک مشتعل ہوگئی اور حنا جیلانی نے یہ مقدمہ صفیہ بی بی کے طرف سے لڑا اور کامیاب ہوئی۔ لیکن صفیہ بی بی جیسی بہت سی لڑکیاں زمینداروں اور مالکان کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہیں۔

بچوں کی مشقت کے خلاف کام کرنے والی تنظیموں کا کہنا ہے کہ گھریلو ملازم بچوں اور بچیوں سے شدید جسمانی کام لیا جاتا ہے اور انہیں جسمانی اذیت بھی دی جاتی ہے۔ حال

ہی میں اخبارات میں ایک واقعہ چھپا جس کے مطابق دو نوجوان بچیوں کو' جن کی عمریں بارہ اور چودہ برس تھیں' گرم استری سے جلایا گیا ان کے پورے جسم پر جلنے کے نشانات تھے اور یہ فعل محض اس لیے کیا گیا کہ بقول مالکان انہوں نے نافرمانی کی تھی اس طرح کے گھناؤنے قصے آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔

عاصم حسین کے مطابق گھریو ملازمین کی تنخواہ کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کہاں کام کر رہے ہیں ۔ زیادہ امیر گھرانوں میں ان کی تنخواہ قدرے بہتر ہوتی ہے اور متوسط طبقے یا نچلے درجے کے متوسط طبقے میں کم ہوتی ہے۔ تاہم گھریلو ملازمین کی کثیر تعداد کو بہت کم معاوضہ ملتا ہے کیوں کہ بے روزگاری بہت زیادہ ہے اور ملازم کثرت سے مل جاتے ہیں۔ لاہور کے امراء کے علاقوں مثلاً گلبرگ' کینٹ یا ڈیفنس میں گھر کی صفائی کرنے کے لیے ایک ملازمہ کو 700 یا 800 روپے تک مل جاتے ہیں۔ جہاں برتن بھی دھونے ہوں وہاں یہ معاوضہ 1000 یا 1200 روپے تک بھی ہوتا ہے لیکن متوسط طبقے کے گھروں میں صفائی کے کام کا معاوضہ 250 سے 300 روپے کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

کھانا پکانے کا کام چونکہ خاص ہنر پر منحصر ہوتا ہے لہٰذا اس کام کے لیے 1500 سے لے کر 2500 روپے تک مل جاتا ہے۔کل وقتی خانساماں کو 3000 سے لے کر 4000 روپے تک مل جاتا ہے لیکن جب یہ کام عورتیں کرتی ہیں تو ان کی تنخواہ تقریباً مردوں سے نصف ہوتی ہے۔ جو خادمائیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں انہیں 1000 سے لے کر 3000 روپے تک معاوضہ مل جاتا ہے امراء کے گھروں میں یہ معاوضہ 3000 روپے تک بھی ہوتا ہے اور متوسط طبقے کے گھروں میں بہت کم ہوتا ہے۔ ان خادماؤں کے کام اور گھریلو ملازمین کے کام کے اوقات عام طور پر بہت طویل ہوتے ہیں۔ جب تک مالکان اور ان کے بچے سو نہ جائیں گھریلو خادم اور خادمائیں سو نہیں سکتیں چاہے پوری رات ہی کیوں نہ گزر جائے۔ اس کے علاوہ انہیں گالیاں' چانٹے اور بے عزتی برداشت کرنے پڑتے ہیں ۔ اگر چہ چند ایسے مالکان بھی ہیں جو اچھا سلوک کرتے ہیں اور ان سے اچھی طرح پیش آتے ہیں اور بوقت ضرورت مدد بھی کرتے ہیں' لیکن زیادہ تر لوگون کا ان سے وہی سلوک ہوتا ہے جو کہ غلام معیشت میں غلاموں سے ہوا کرتا ہے۔ دھمکیاں اور زبانی تشدد سے زیادہ عام ہے' مار پیٹ اور جنسی تشدد کچھ کم ہوتا ہے۔

MashalBooks.org

گھریلو ملازمین ہمارے معاشرے کا کمزور ترین طبقہ ہے۔ ان کے پاس اپنے حقوق مانگنے یا مزاحمت کرنے کی اتنی طاقت نہیں ہوتی ۔ پھر بھی ایسے واقعات کئی دفعہ اخبارات میں چھپے ہیں کہ کوئی ملازم مالک کو قتل کر کے فرار ہو گیا یا گالیاں دینے پر مالکن کو چھری مار دی اور قتل کر دیا۔ ایسے واقعات میں اکثر لوگ ملازم کو برا بھلا اور نمک حرام وغیرہ کہہ دیتے ہیں۔ درحقیقت اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ برسوں کی بدسلوکی کے بعد ان لوگوں کے اندر اس قدر نفرت اور غصہ بھر جاتا ہے کہ آخر ایک دن صبر کا پیانہ لبریز ہو جاتا ہے اور یہ کسی جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے جس سوال کا جواب دینا چاہیے وہ یہ ہے کہ انہیں مجرم بنایا کس نے؟ کونسے حالات تھے جو ایک خاموش اور صابر شخص کو جرم کرنے پر مجبور کر گئے۔ ان عوامل پر کوئی باقاعدہ مطالعہ نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہر شخص کے اندر فطری طور پر مزاحمت کا جذبہ ہوتا ہے۔

چوری کے الزامات اکثر گھریلو ملازمین پر لگا دیئے جاتے ہیں اور پولیس میں چوری کے ایسے متعدد کیس درج ہیں۔ یہاں طبقاتی ناہمواری کے عوامل کارفرما ہیں کیونکہ امراء کے گھروں میں اتنا قیمتی سامان کھلا پڑا ہوتا ہے جو لوگوں کی امنگوں کو جگاتا ہے اور خوبصورت اور بیش قیمت اشیاء کا خواہاں بناتا ہے لیکن عموماً چوری کرنے والے غریب ملازمین نہیں ہوتے ۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ پولیس سب سے پہلے انہیں پکڑے گی۔ مگر شک وشبہ سب سے پہلے ان پر پڑتا ہے اور انہیں پولیس کے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ عام طور پر ان کے اور مالکان کے درمیان اعتبار کا رشتہ ہوتا ہے اور کام کا یہ شعبہ باقاعدہ اصولوں اور قواعد وضوابط کی زنجیروں سے باہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ان ملازمین کا بہت زیادہ استحصال ہوتا ہے کیونکہ نہ تو یہ کسی سہولت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور نہ ہی ان کے تحفظ کے لیے کوئی قوانین ہیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے ڈائریکٹر آئی اے رحمان کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں گھریلو ملازمین کے تحفظ کے لیے کوئی قوانین نہیں ہیں۔ آئی اے رحمان کے مطابق کمیشن ایسے ملازمین کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے میں مصروف ہے اور ان کے کام کے حالات کے بارے میں تحقیق کر رہا ہے ۔ جب تک ایسے قوانین مرتب نہیں ہوتے جو گھریلو ملازمین کو تحفظ فراہم کریں' آئی اے رحمان کی تجویز ہے کہ ان ملازمین

پر ان لیبر قوانین کا اطلاق ہونا چاہیے جو دوسرے شعبوں کے کارکنوں کے لیے بنائے گئے ہیں یا پھر موجودہ لیبر قوانین میں ایسی ترامیم کی ضرورت ہے جو گھریلو ملازمین پر بھی عائد ہوں اور صنعتی شعبے کے کارکنوں کو جو تحفظ حاصل ہے' وہ ان ملازمین کو بھی فراہم کیا جا سکے۔

اس مطالعے کے لیے پانچ گھریلو مزدور خواتین کا انٹرویو کیا گیا۔ ان کی کہانیوں سے نہ صرف ان کا کرب ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان کی ہمت اور حوصلے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

سرداراں ----عمر 55 برس

''میں دس سال کی تھی جب میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے والد کی وفات پر مجھے کام کرنا پڑا۔ میں جاگیردار کے گھر مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھی اور ان کے رہنے کی جگہ کی صفائی کرتی تھی۔ میرا بھائی مجھ سے چھوٹا تھا۔ جب وہ بڑا ہو گیا تب بھی وہ کام نہیں کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں لوگ عورتوں کی عزت کرتے تھے۔ مجھے مردوں کے ساتھ کام کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جب میری شادی ہو گئی تو ہمارے مالی حالات بہت خراب تھے' اس لیے مجھے مجبوراً کام کرنا پڑا۔ خاص طور پر جب میرے دو بچے ہو گئے تو مجھے کام کی سخت ضرورت پڑی۔ جب میں کام پر ہوتی تو میری بچی' جو چھ یا سات برس کی تھی' اپنے چھوٹے بھائی کا خیال رکھتی تھی۔ کام پر جاتے ہوئے راستے میں آدمی بہت تنگ کرتے تھے۔ فقرے کستے تھے' مذاق اڑاتے تھے لیکن میں سختی سے انکار کرتی رہی اور ان کی پروا کیے بغیر روز کام پر جاتی رہی۔ صرف ایک مرتبہ جب میں بہت تھکی ہوئی تھی تو ایک پندرہ سالہ نوجوان نے کہا کہ تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں اس دن مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا میں اس کے سکوٹر پر بیٹھنے پر آمادہ ہو گئی اس نے دست درازی شروع کر دی تو میں نے اسے کہا کہ مجھے وہیں اتار دے۔ لیکن میں نے اپنے شوہر کو نہیں بتایا کہ کہیں وہ مجھے ہی برا نہ سمجھے۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں بتایا وہ آخر کرتا کیا؟''۔

ایک دفعہ جب میں کام سے گھر جا رہی تھی۔ ایک کار والا رکا اور اپنے آپ کو برہنہ کر لیا میں نے گھر کے قریب ایک مالی کو آواز دی اور مالی نے اسے ڈرایا۔ اس وقت میری سات سالہ بچی میرے پاس تھی اس لیے میں نے یہ قصہ اپنے شوہر کو بتایا۔ میں بہت روئی' غم و غصہ میں رونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں خوفزدہ بھی تھی کہ کل کو ہمارے ساتھ

کیا ہوگا۔ میں ڈرتی تھی کہ اگر کوئی میری بچی کو اٹھا کر لے گیا تو کیا ہوگا؟ مگر میرے شوہر نے سوائے بے بسی کے اور کچھ نہیں کیا۔ وہ اپنی نوکری چھوڑ کر ہماری حفاظت نہیں کر سکتا تھا لیکن اب میری بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ مجھے اب تسلی ہے لیکن بیٹے کی طرف سے پریشان ہوں کیونکہ وہ کچھ نہیں کرتا۔ میں گھروں میں صفائی کر کے مہینے کے 1500 روپے کما لیتی ہوں۔ میرا بیٹا ہر وقت پیسوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ جوان ہونے کے باوجود کوئی کام نہیں کرتا۔ جب بھی کبھی میری مدد کی' تو صرف بیٹی نے جو شادی سے پہلے' میری طرح گھروں کی صفائی کر کے کما لیتی تھی۔ پتا نہیں لوگ کیوں کہتے ہیں کہ بیٹا ہونا چاہئے۔ ہمارے لوگوں میں تو بیٹے الٹا ماؤں کو مارتے ہیں۔ اگر مدد کرتی ہیں تو صرف بیٹیاں۔ اب تو میرا شوہر بھی ایک حادثے میں معذور ہو چکا ہے' میں خود دل کی مریض ہوں۔ اکیلی کمانے والی ہوں پتا نہیں ایک دن چل بسی تو کیا ہوگا۔ میرا معذور خاوند اور بیٹا کہاں سے کھائیں گے۔ لیکن اللہ مالک ہے' چڑیوں کووؤں کو بھی روزی دیتا ہے' ہمیں بھی دے ہی دے گا۔

سرداراں تین چار گھروں میں صفائی کا کام کرتی ہے اور کپڑے دھوتی ہے یہ مہینے کے 1500 یا 2000 روپے کما لیتی ہے۔ اس کا شوہر معذور ہے اور بیٹا آوارہ۔ اس کا تعلق عیسائی برادری سے ہے اور یہ دل کی مریض اور بوڑھی ہونے کے باوجود سارا دن گھروں میں کام کر کے شام کو پیدل گھر جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ جب ایک شخص نے اسے راستے میں روکا تو اس نے اینٹ اٹھالی' جس سے وہ شخص ڈر گیا۔ سرداراں کہتی ہے کہ اگر وہ باز نہ آتا تو وہ اسے اینٹ دے مارتی۔ سرداراں بچپن سے لے کر 55 برس کی عمر تک کام کرتی چلی آ رہی ہے۔ اس نے غربت' بیماری' بے بسی اور ظلم دیکھا ہے لیکن اس کے بات کرنے کے انداز میں کوئی گلہ' کوئی شکوہ نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ سرداراں نے اپنے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ جب اس بارے میں سوال کیا تو سرداراں نے کہا کہ'' ہم غریبوں کی کیا زندگی ہے' ہمیں تو سب کچھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اللہ نے غریب جو بنایا ہے۔ اس کی نظر میں اللہ کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اکثر اسے گالیاں اور بے عزتی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن وہ صرف رو کر چپ ہو جاتی ہے۔ سرداراں نے غم و غصہ کو دبا لیا ہے۔ لیکن سرداراں کی کہانی سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ والد کی موت کے بعد بھی بیٹی نے گھر چلایا اور نوکری کی۔ بیٹے نے جوانی میں بھی نوکری کرنے سے

MashalBooks.org

انکار کر دیا۔ شوہر کی معذوری کے بعد بیٹی نے گھروں میں کام کر کے مدد کی ۔لیکن بیٹے نے صرف پیسوں کا مطالبہ اور آوارہ گردی کی ۔ جب کبھی اس نے بیٹے کو کام کرنے کو کہا تو اسے غصہ آ گیا اور وہ آگ بگولہ ہو کر بولا کہ کام نہیں ملتا' کیا کام کروں؟ یہی بات دوسرے غریب گھرانوں میں بھی دیکھنے میں آئی کہ ،مصیبت کے وقت عورتوں نے کام کیا اور حالات کا مقابلہ کیا۔ لیکن بیٹوں اور مردوں نے ہار مان لی' مایوس ہو گئے یا تشدد پر اتر آئے۔ سرداراں کی مزاحمت کا ثبوت اس بات میں ملتا ہے کہ نہ صرف اس نے ایک امیر اور طاقتور شخص کی بے حیائی کے خلاف اینٹ اٹھالی بلکہ وہ اینٹ مار بھی سکتی تھی حالانکہ وہ اس غریب عورت کو جو عیسائی بھی ہے' جیل بھی بھجوا سکتا تھا۔ جب بھی گھر میں مشکل حالات پیدا ہوئے' چاہے والد کی موت یا شوہر کی معذوری سرداراں نے ان کا مقابلہ کیا اور نوکری کر کے کنبے کو سنبھالا۔ سرداروں کے بھائی اور بیٹے' دونوں کے رویے سے ہی دکھائی دیتا ہے کہ مفلس غریب اور دبے ہوئے طبقوں کے مرد کنبے کو سنبھالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور مردانگی میں اس کمزوری کو تشدد اور غصہ سے چھپاتے ہیں۔ سرداراں کہتی ہے کہ جب بھی اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ آوارہ گردی کے بجائے کام کرے تو وہ لڑ پڑا اور تشدد پر اتر آیا۔ وہ آج بھی باقاعدگی سے ماں سے پیسے لیتا ہے اور سگریٹ اور جوئے میں استعمال کرتا ہے۔ البتہ اس کی بہن نے نوکری کی اور کنبے کی ضروریات کو پورا کیا۔ جب بھی گھر پر کوئی آفت آئی' عورتوں نے مردانگی کا ثبوت دیا اور خاندان کی کفالت کی۔ سرداراں کہتی ہے کہ اتنی مہنگائی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کام نہ کروں' جب کوئی مجھ سے بری طرح پیش آتا ہے تو میں خاموش اور خود کو کام میں گم کر لینا سرداراں کی مزاحمت کے بالواسطہ انداز ہیں۔ جس نظام سے وہ براہ راست لڑ نہیں سکتی کیونکہ وہ نظام اس کی روزی چھین لے گا۔ وہ اس کا مقابلہ خود کو کام میں کھو کر کرتی ہے۔

سرداراں کہتی ہے کہ میرے مالکان زیادہ تر اچھے لوگ ہیں اور میں جب دکھ میں ہوتی ہوں تو کبھی کبھی مالکان سے بات کر کے اپنا دل ہلکا کر لیتی ہوں اور کبھی کبھی میری مدد بھی کر دیتے ہیں۔ دوسروں سے بات کر کے میرے سینے میں بوجھ کم ہو جاتا ہے اور گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔ سرداراں اپنے دکھ کا ذکر کر کے دل ہلکا کر لیتی ہے۔ یہ عورتوں کا دل ہلکا کرنے کا پرانا انداز ہے کہ وہ دوسری عورتوں سے دکھ سکھ کر لیتی ہیں۔ مرد مذاق اڑاتے ہیں

کہ عورتیں بولتی بہت ہیں لیکن جہاں کسی کو واضح جارحیت ظاہر کرنے کی اجازت نہ ہو اور جہاں محکوم طبقوں کے پاس مزاحمت کا کوئی اور ہتھیار نہ ہو' وہاں زبان اور الفاظ مزاحمت کا موثر ترین طریقہ بن جاتے ہیں ۔ جہاں ایک طرف مکمل خاموشی بھی مزاحمت کی ایک طرز ہے' وہاں الفاظ اور زبان مزاحمت کی طرح کے اظہار کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ زبان سراپا مزاحمت بن جاتی ہے اور الفاظ اس کا مفہوم دوسروں تک منتقل کر کے اسے اجتماعی شکل دے دیتے ہیں۔ سرداراں کہتی ہے کہ جب میری بیٹی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو میرا داماد بہت پریشان ہوا کہ لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ میں بھی پریشان تھی اپنے داماد کے رویے پر کیونکہ میں نے تو دیکھا تھا کہ ماں باپ کا ساتھ صرف بیٹیاں دیتی ہیں اور مشکل حالات میں مدد صرف بیٹیاں کرتی ہیں۔ سرداراں کے تجربات نے اسے سکھایا ہے کہ لڑکوں کو اہمیت دینے والی دنیا کی ریت شاید غلط ہے۔ سرداراں کے تجربات اور طویل عمر کے مشاہدہ اسے بتا رہے تھے کہ دنیا کی سوچ میں خرابی ہے۔ یہ سوچ کسی تحریک نے نہیں دی یا عورتوں کے حقوق کے علمبرداروں نے نہیں دی سرداراں کی سوچ اس کی اپنی تھی جو زندگی کے تلخ حقیقتوں نے اسے دی تھی۔

شہناز----عمر 32 سال

شہناز کا تعلق مسیحی برادری سے ہے اور یہ تین گھروں میں کھانا پکانے کا کام کرتی ہے۔ یہ صبح نو بجے سے لے کر شام کو آٹھ بجے تک کام کرتی ہے اور ویگن کے ذریعے رات کو نو بجے گھر واپس پہنچتی ہے۔ شہناز کا شوہر ویسے تو رنگ و روغن کرتا ہے لیکن اکثر نشہ کر کے لیٹا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ کام نہیں ملا۔ اس کے پانچ بچے ہیں ۔ بڑی بیٹی بھی گھروں میں کام کر کے کماتی ہے۔ شہناز کہتی ہے ۔ میں سات یا آٹھ برس کی تھی جب میں نے کام شروع کیا۔ جب شادی ہوئی تو میرے سسرال والے عورت کے کام کرنے کے خلاف تھے۔ لیکن ہمارے مالی حالات ایسے تھے کہ مجھے گھر سے باہر کام کرنا پڑا ۔ آج تک میرا شوہر میرے کام کرنے سے سمجھوتہ نہیں کر سکا۔ وہ بات بات پر لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر میں نے کام نہ کیا تو ہمارا کنبہ بھوکا مرے گا۔ لیکن اس کی انا یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں دن بھر گھر سے باہر رہوں۔ وہ ہر وقت مجھ پہ شک وشبہ کرتا رہتا ہے۔ خود وہ گھروں میں

رنگ کا کام کرتا ہے لیکن ایسا کام تو موسمی ہوتا ہے' ملے یا نہ ملے کیا پتا؟۔

لیکن میں مالکان کی طرف سے خوش قسمت تھوں کیونکہ تینوں گھروں سے مجھے مدد بھی مل جاتی ہے اور وہ مجھ سے ہمدردی بھی کرتے ہیں۔ میرے معاشی حالات بہت برے ہیں۔ میں بچوں کو تعلیم دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے بہت زیادہ فیس دینی پڑتی ہے بیٹوں کو بیاہنے کے لیے مجھے جہیز اکٹھا کرن اہے۔ میری بیٹی گیارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی 1300 ماہوار کماتی ہے۔ وہ کیسے جہیز بنائے جبکہ سارے روپے گھریلو اخراجات میں لگ جاتے ہیں۔ محلے کی ساری لڑکیاں کام کرنے جاتی ہیں۔ اس لیے محلے والے میری لڑکی کو کچھ نہیں کہتے۔ میرے سسرال والوں نے شروع میں تو مجھے کام سے روکنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ یہ بہت آزاد ہو جائے گی۔ میں نے ان سے ملنا چھوڑ دیا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ بچوں کو تعلیم ضرور دینی ہے تاکہ ان کی وہ زندگی نہ ہو' جو میری ہے۔ لیکن اب وہ چپ کر گئے ہیں' کیونکہ میں پروانہیں کرتی۔ لیکن کبھی کبھی میرا شوہر مجھے مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں صبح سے شام تک گھر سے باہر ہوتی ہوں۔ نہ جانے کیا کرتی ہوں۔ وہ مجھے دوسرے مردوں کے طعنے دیتا ہے۔ جبکہ میرے پاس تو سر کھجانے کا بھی وقت نہیں ہوتا۔ اگر میں تھکی ہوئی ہوں اور اس کے ساتھ ہم بستری نہ کروں تو کہتا ہے کہ ضرور تو کسی اور کے ساتھ ہو کر آئی ہے۔ میں نے حال ہی میں ابارشن کر وایا ہے۔ اگر ایک اور بچہ ہو گیا تو کہاں سے کھلاؤں گی لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھتا اور چاہتا ہے کہ جب چاہے میرے پاس آ جائے۔ ابارشن پر 6000 روپے خرچ ہوئے اور مجھ پر ابھی تک قرض ہے۔ لیکن وہ پروانہیں کرتا اور اپنا آپریشن کروانے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہر وقت یہی طعنہ دیتا ہے کہ تو دوسرے مردوں کے پاس جاتی ہے''۔

شہناز کی کہانی سے بہت سی باتیں سامنے آئی ہیں جو اس کتاب کے بنیادی مفروضے کی تائید کرتی ہیں۔ معیشت کی کمزوری نے مردوں کے لیے روزگر کے مواقع کم کر دیئے ہیں ۔عورتوں کو روزگار کی تلاش میں گھروں سے نکلنا پڑ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے مردوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ وہ آزاد ہو گئی ہیں یا ہاتھوں سے نکل گئی ہیں اور مرد اپنی اہلیت کم ہو جانے کا غصہ تشدد کی صورت میں نکال رہے ہیں۔ شہناز کا شوہر ہر وقت اس پر دوسرے مردوں میں دلچسپی کا شبہ کرتا ہے کیونکہ کام کی وجہ سے وہ گھر سے باہر رہتی ہے لیکن شہناز کی

کمائی کے بغیر کنبہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا اور اس کے شوہر کو کام کبھی ملتا ہے اور کبھی نہیں۔ وہ روز گھر سے نکل کر کام کی تلاش بھی نہیں کرتا اسے آرام کی عادت پڑ چکی ہے۔ اگر شہناز سگریٹوں کے پیسے دینے سے انکار کرتی ہے تو وہ مارتا ہے۔ اس کے پاس مردانگی کا ثبوت صرف مار پیٹ اور جنسی فعل رہ گئے ہیں۔ اسی لیے وہ آپریشن نہیں کرواتا کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ مرد ہونے کا آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ قابلیت بھی اگر چھین لی گئی تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اسے شہناز کے کام سے خطرہ بھی محسوس ہوتا ہے کیونکہ وہ خود مختار اور آزاد ہو سکتی ہے لیکن اس کا شوہر اب اس کی کمائی کے بغیر گزارا نہیں کر سکتا۔ اس احساس سے وہ اور بھی زیادہ خوفزدہ ہوتا ہے اور تشدد کے ذریعے اپنا رعب اور دبدبہ قائم رکھتا ہے۔ اسی میں اس کی بقا ہے۔ شہناز اپنی مزاحمت کا اظہار ان بچوں پر تشدد کر کے کرتی ہے جو بے قصور ہیں کیونکہ وہ خود سے طاقتور شخص پر غصہ نہیں نکال سکتی یا پھر برتنوں جیسی بے جان چیز پر غصہ نکال لیتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات کو نفسیاتی طور پر مسترد کر رہی ہے۔

ایک دفعہ پھر جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ گھر کی عورتیں کفالت کر رہی ہیں اور مرد تشدد۔ مردوں کا کفالت میں بہت کم یا کوئی حصہ نہیں ۔ یہ قصور ان مردوں کا نہیں ہے بلکہ ایسی معیشت کا ہے جو لوگوں کو روزگار فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ شہناز کے دل میں ارمان ہیں کہ بچوں کو تعلیم دے، اس زندگی سے چھٹکارا دلائے اور وہ اس کوشش میں سختیاں بھگت رہی ہے، لیکن خندہ پیشانی سے اپنے نصب العین کی طرف گامزن ہے۔ اس نے نہ صرف سسرال والوں کے خلاف مزاحمت کی اور ان کے اعتراضات کرنے پر قطع تعلق کر لیا بلکہ حال ہی میں اس نے لڑائی جھگڑے پر شوہر کو گھر سے نکال دیا۔ چند دن بعد جب وہ لوٹا تو ہم نے شہناز سے پوچھا کہ ایک ایسے شخص کو کیوں گھر میں آنے دیا جو صرف لڑائی جھگڑا کرتا ہے اور اسے بھی اور بچوں کو بھی مارتا پیٹتا ہے، اور کما کر بھی نہیں لاتا تو وہ کہنے لگی۔ ''باجی ہمارے ہاں تو سگے چاچے تائیوں کا بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ میری بیٹیاں جوان ہیں ۔کم از کم اتنا تو ہے نا کہ گھر بیٹھا ان کی حفاظت کر لیتا ہے۔ ہماری بچیاں تو اپنے سگوں سے بھی محفوظ نہیں ہوتیں'' یہ سن کر دل کو ٹھیس لگی اور افسردگی محسوس ہوئی لیکن شہناز کی ہمت کہ وہ زندگی کے حالات سے ہر طرح نمٹنے کے لیے تیار ہے اور ہر مسئلے کا

پوری طقت سے مقابلہ کرتی ہے۔ ابھی تک تو حالات اسے شکست نہیں دے پائے لیکن آگے چل کر نہ جانے کیا ہو' اس کا سوچنا بھی مشکل ہے۔

حلیمہ-----عمر 37 سال

حلیمہ ابھی میں صرف گیارہ برس کی تھی جب اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کے شوہر کی عمر 23 برس تھی۔ اس وقت حلیمہ کے شوہر کے تین کم سن بھائی تھے اور ایک بہن جو کہ حلیمہ سے بھی چھوٹی تھی۔ حلیمہ نے ان سب کی پرورش کی۔ وہ کہتی ہے کہ "جیسے ہی میری شادی ہوئی' میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ میں مویشی دیکھتی' گھر کی صفائی کیا کرتی تھی اور دودھ دوہتی تھی۔ میرا شوہر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ہمارے وٹے سٹے کی شادی تھی کیونکہ میرا بھائی میرے شوہر کا بہنوئی تھا۔ جب میں گھر سے باہر کام کرنے جاتی تو وہ مجھے مارتا کہ یہ تو برے کردار کی ہے۔ میں کھیتوں میں اس کی مدد کرتی۔ جب بھی کبھی وہ کام پر لگتا تھا۔ نالیاں بھی بناتی تھی' ہل بھی چلاتی تھی اور چاول اور گندم کی کٹائی میں بھی کام کرتی لیکن گزارہ پھر بھی نہیں ہوتا تھا۔ آخر ہم اپنے بھائی کے گھر رہنے لگے۔ یہ لاہور میں تھا۔ ہم بہت غریب تھے۔' میرے بچے ہوئے' جن میں سے سات زندہ ہیں۔ میری بھابی مجھ سے لڑتی رہتی تھی کیونکہ میں قرض مانگتی تھی کہ ہم زندہ رہ سکیں۔ میں نے ماڈل ٹاؤن میں کسی کے گھر نوکری کر لی۔ پیسے جمع کر کے میں نے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا خرید لیا۔ اس عرصے میں میرے شوہر نے ایک اور عورت کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے۔ بعد میں اس سے شادی کر لی اور ہمارا گھر چھوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ سارے بچوں کو میرے پاس چھوڑ گیا اور کوئی خرچ وغیرہ کبھی نہ دیا۔ ایک دفعہ میں اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ میں نے زہر کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن میری بڑی بیٹی نے مجھے بچالیا' میری دیکھ بھال کی اور میں ٹھیک ہوگئی۔ میں نے کام جاری رکھا۔ میری بیٹیوں نے کام میں میری مدد کرنی شروع کر دی۔ پھر میرے بیٹے کا حادثہ ہوا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کے علاج میں بہت پیسہ خرچ ہوگیا۔ جب وہ ٹھیک ہوگیا تو اس نے شادی کر لی۔ وہ بالک اپنے باپ جیسا نکلا۔ میں نے اس کے لیے کیا نہیں کیا' لیکن وہ بالکل ہی غیروں جیسا نکلا۔ اس نے میری بیٹیوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ بعد میں اس نے مجھے بھی مارنا شروع کر دیا۔ خاص طور پر جب میں

اس کی پیسوں کی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ کئی دفعہ میں اور میری بیٹیاں بری طرح زخمی ہوگئیں۔ اب وہ اپنے باپ کے ساتھ مل گیا ہے اور وہیں رہتا ہے۔ میں خوش ہوں کیونکہ اب مجھ پر اتنا بوجھ نہیں جتنا اس کے ہونے سے تھا۔ اب وہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو گھر میں نے بنایا ہے ۔ اس کے نام کر کے کرائے کے مکان میں چلی جاؤں۔ عورتیں مردوں کی گناہگار آنکھوں کو پہچان لیتی ہیں۔ جب کوئی آدمی میری بیٹیوں کو غلط نظروں سے دیکھتا ہے' میں ایک دم جان جاتی ہوں۔ ایک دفعہ وہ جہاں میں کام کرتی تھی وہاں کا مالک خراب تھا۔ وہ میرے سامنے پتلون اتار کر کھڑا ہو جاتا تھا حالانکہ وہ بوڑھا تھا لیکن اس کی نیت میں گندگی تھی۔ جب میں نے اس کی بیوی کو بتایا تو اس نے ہمیں نوکری ہی سے نکال دیا۔ وہ کہنے لگی کہ اس کا شوہر قابل اعتبار نہیں ہے۔ بعد میں اس نے اسے چھوڑ بھی دیا۔ میں ایسی کوئی بات اپنے مرد رشتہ داروں کو نہیں بتاتی۔ وہ تو ہم پر ہی پابندیاں لگا دیں گے پھر ہم کہاں سے کھائیں گے۔ کوئی میرے بچوں کے منہ میں روٹی کا نوالہ نہیں ڈالے گا۔ چاہے وہ بھوکے مر جائیں۔ جب مالکان کسی بات پر ناجائز غصہ کرتے ہیں تو میں خاموش ہو جاتی ہوں کیونکہ مجھے کام کی ضرورت ہے۔ اپنے بچوں کے منہ میں روٹی ڈالنی ہے۔ جب بہت زیادہ غمگین ہو جاتی ہوں تو اپنا سر دیوار سے مارتی ہوں۔ میں مر بھی نہیں سکتی کیونکہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں انہیں پڑھانا چاہتی ہوں۔ کم از کم یہ بجلی یا گیس کے بل تو پڑھ لیا کریں گے۔ کوئی انہیں دھوکہ تو نہیں دے گا''۔

حلیمہ بھی تین یا چار گھروں میں کھانا پکانے اور صفائی کا کام کرتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی کام کاج میں لگی رہتی ہیں لیکن انہیں تنخواہ ایک کی ملتی ہے۔ حلیمہ باتیں کرتی ہوئی رو پڑی۔ اس کی بے بسی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ حلیمہ کی کہانی سے بھی طبقاتی اور جنسی تشدد صاف نظر آتا ہے۔ ایک طرف مالکان کی دہشت اور دوسری طرف اپنے ہی بیٹے اور شوہر کی زیادتیاں۔ حلیمہ کے قصہ میں بھی بیٹیاں ماں کی مددگار اور ہمدرد نظر آتی ہیں اور بیٹا خود غرض' ظالم او راحسان فراموش۔ ایک بار پھر یہی بات نظر آتی ہے۔ کہ دبے ہوئے طبقوں کے مرد جو خود کما کر لانے سے قاصر رہتے ہیں' عورتوں کا کمایا کھاتے بھی ہیں اور انہیں مارتے بھی ہیں۔ ان پر ہر دم شک بھی کرتے ہیں کہ برے کردار کی ہے۔ ظاہر ہے انہیں اپنی مردانگی پر پورا اعتماد نہیں ہوتا۔ مار پیٹ کر اپنا مرد ہونا دکھاتے ہیں مگر اسی

Mashalbooks.org

مار پیٹ سے نامردی مزید واضح ہو جاتی ہے کیونکہ عورت پر ہاتھ اٹھانا جوانمردی نہیں بلکہ بزدلی سمجھی جاتی ہے لیکن حلیمہ کی بھی ہمت اور حوصلہ قابل ستائش ہیں کہ اس نے سات بچوں کو اکیلے پالا' گھر بنایا اور ہر آفت کا مقابلہ کیا۔ حلیمہ کا طرز مزاحمت یا تو رونا تھا یا پھر خودکشی سے خود کو ختم کرنے کی کوشش۔ عورتوں کو جارحیت دکھانے سے روکا جاتا ہے لہٰذا ان کا غم و غصہ بالواسطہ طریقوں سے نکلتا ہے۔ ان کی مزاحمت کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ حلیمہ مالکان کے سامنے چپ کر جاتی ہے تاکہ ذریعہ معاش قائم رہے۔ لیکن گھر میں دیواروں سے سر ٹکرا لیتے ہے۔ یہ سر ٹکرانا ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حلیمہ معاشرے کی کڑی اور اونچی دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے۔ اس کا اقدام خودکشی معاشرے کے خلاف احتجاج کا طریقہ ہے۔ خود کو ختم کر لینا بھی ایک متحرک عمل ہوتا ہے۔ جس میں انسان اپنی ذات کا اور اپنے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ اپنی انسانیت کو منوانا چاہتا ہے اور کبھی کبھی اپنے انسان ہونے کو صرف موت کے ذریعے' خود کو ختم کر کے ثابت کرتا ہے۔ خودکشی اکثر احتجاج کی صورت ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک شخص دوسروں کی آنکھیں کھول رہا ہوتا ہے۔ حلیمہ نے بھی مزاحمت کا یہی راستہ اختیار کیا۔ لیکن اس کے ناکام ہونے کی صورت میں زندگی سے لڑنے کے لیے' اسے پھر سے آمادہ ہونا پڑا۔ جب دوسروں کے خلاف کوئی حربہ نہیں رہتا تو انسان کی مزاحمت اندرونی ہو جاتی ہے اور خود اپنی ہی ذات کی سمت میں مڑ جاتی ہے۔ حلیمہ کی مزاحمت اس کی اپنی ہستی کی طرف مڑ گئی لیکن اسے زندہ رہنا پڑا اور اب تک حلیم زندگی کی تلخ جدوجہد میں سرگرم عمل ہے۔

سوہنی----عمر 24 سال

''ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میرا باپ چوکیدا تھا۔ میری ماں اس گھر میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ ہم ہمیشہ ان کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ مجھے اپنی ماں کے ساتھ کام کے لیے جانا ہوتا تھا جب میں دو سال کی تھی۔ مجھے ماں کے ساتھ جانا اچھا لگتا تھا کیونکہ جب میں گھر نہیں ہوتی تھی تو بھائی مجھے مارتے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک سبزی فروش رہتا تھا۔ میں اس کے بیٹے کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا کیونکہ کبھی مجھے کوئی مالٹا یا کیلا کھانے کے لیے دے دیا کرتا تھا۔ ہم عیسائی تھے اور یہ لڑکا مسلمان۔ جب ہم ذرا

بڑے ہوئے تو ہم نے سوچا کہ ہم شادی کر لیں۔ جب میرے والد کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے اتنا مارا کہ میرے پورے جسم پر نیل پڑ گئے لیکن جاوید کے علاوہ مجھے کسی اور نے پسند ہی نہیں کیا تھا۔ میں بابا کے گھر کی کھڑکی توڑ کر بھاگ نکلی کیونکہ بابا بہت ظالم تھے۔ میں جاوید کے گھر گئی تو وہ مجھے ایک مولوی کے پاس لے گیا اور ہمارا نکاح ہوگیا۔ میں مسلمان ہوگئی تو میرے جانے کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ جاوید کے پاس پانچ سو روپے تھے۔ ہم ریلوے اسٹیشن گئے اور کراچی کی گاڑی پکڑلی۔ کچھ دن جاوید کے ایک دوست نے ہمیں سونے کے لیے ایک کمرہ دے دیا۔ زندگی بہت مشکل تھی لیکن میں خوش تھی۔ میرے والد نے میری گمشدگی پر جاوید کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کر دیا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ کراچی قانون کی زنجیر سے بہت دور رہے۔ لیکن ایک دن پولیس آگئی اور ہم دونوں گرفتار ہوگئے۔ ہمیں علیحدہ جیلوں میں رکھا گیا۔ میں بتا نہیں سکتی پولیس والوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہر ایک نے میری جوانی کا فائدہ اٹھایا۔ میری ماں نے اپنے مالکان سے بات کی اور ان کے وکیل بیٹے نے میری ضمانت کروا دی۔ مجھے اپنے والد کے گھر واپس بھیج دیا گیا لیکن میں نے اپنے والدین کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ مسیحی تھے اور میں مسلمان ہوگئی تھی۔ ماں مجھے کھانا لا کر دیتی مگر میں انکار کر دیتی''۔

''مجھے اپنے شوہر کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ایک دن جب میرا باپ گھر نہیں تھا تو میں گھر سے نکل کر جاوید کا پتا لگانے گئی۔ مجھے اس کی بہت فکر تھی۔ جب میں اس کے گھر پہنچی تو اس کا بڑا بھائی باہر بیٹھا تھا اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ اس کے منہ پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جب میں نے جاوید کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا کہ جاوید ابھی تک جیل میں ہے۔ اس کے بعد ایک دم اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس نے میرے ساتھ جنسی تشدد کی کوشش کی۔ میں زور زور سے چیخی۔ ہمسایوں نے میری چیخ و پکار سنی اور دروازے پر دستک دی۔ میرا دیور گھبرا گیا اور ایک دم اس نے تیزاب کی بوتل اٹھائی اور میرے منہ پر پھینک دیا مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں درد سے تڑپی اور بہت چیخی چلائی۔ پھر میں بے ہوش ہوگئی۔ جب آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال میں پڑا پایا۔ میری ماں کسی سے گفتگو کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ میر بینائی چلی گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے دیور کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مقدمہ درج ہوگیا ہے اور ہسپتال کے تمام اخراجات وہ لوگ چکائیں گے۔ میری

بینائی، میرے احساسات اور میرے جذبات کی کسی کو فکر نہ تھی۔ اب میری ماں مجھے سنبھالتی ہے۔جاوید کے والد کو بہت سی رقم دے کر جاوید کو چھڑانا پڑا۔ میں اب سارا دن چارپائی پر بیٹھ کر ماں کا انتظار کرتی ہوں ۔ وہ آ کر مجھے کھانا دیتی ہے ۔ ماں کے مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مالکان مجھے یہاں رہنے بھی دیں گے کہ نہیں۔اسی سوچ میں دن گزرتے ہیں''۔

سوہنی کی کہانی مالکان کے ظلم کی نہیں بلکہ معاشرے کے مظالم کی کہانی ہے۔سوہنی نے والدین کے خلاف مزاحمت کی اور گھر سے پیار کی خاطر بھاگ نکلی۔قانون کی مزاحمت کی اور دوسرے شہر بھاگ گئی۔ مذہب کے خلاف مزاحمت کی اور اسے ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کرلیا۔سوہنی نے چھوٹی سی عمر میں اپنی زندگی کے کئی اہم فیصلے خود کر لیے۔جن کی اسے سزا بھگتنی پڑی۔ اس کے اندر بغاوت اور سرکشی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی تو گھر والے بھی دشمن ہو گئے' قانون بھی، مذہب بھی، عدالتیں بھی اور ہر شخص نے اس کی کمسن ذات سے فائدہ اٹھایا۔اپنی زندگی کی بازی میں اس نے اپنی بینائی بھی کھو دی اور چہرہ بھی بگاڑ لیا۔لیکن سوہنی بغاوت' فیصلہ سازی اور مزاحمت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ اپنی روداد سناتے ہوئے رو پڑی اور سوال کرنے لگی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا کیا قصور تھا؟ شاید سوہنی کا قصور یہ تھا کہ اس نے اپنی ذات کو اور اپنے جذبات کو اہمیت دی' معاشرے کی قدروں کو نہیں۔سوہنی بینائی نہ ہونے کے باوجود گھر کی صفائی کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہے اور اس کی اندھیری آنکھوں میں ہر وقت یہ سوال رہتا ہے کہ اسے کس گناہ کی سزا ملی؟۔

صغریٰ ----عمر 35 برس

صغریٰ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اس کا شوہر روزگار کی تلاش میں کئی سال پہلے مشرق وسطیٰ چلا گیا تھا اور آج تک اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔اس کا بیٹا بیس سال کا ہے مگر کوئی کام نہیں کرتا اور نشے کا عادی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ'' میں لاہور سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔بارہ سال کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میرا شوہر نائی تھا اور ہمارا گزارا ہو جایا کرتا تھا۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر کسی نے میرے شوہر سے کہا کہ سعودی عرب میں اچھا روزگار ہے'وہاں چلے جاؤ۔ ہمارے پاس پاسپورٹ

وغیرہ کے لیے پیسے نہ تھے لہٰذا میرے شوہر نے 50000 روپے کسی شخص سے ادھار لئے اور ایجنٹ کو دے دیئے۔ اس نے غیر قانونی طور پر اسے سعودی عرب بھیج دیا۔ پھر اس کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ کوئی کہتا ہے کہ مرگیا ہوگا' کوئی کہتا ہے کہ کسی عرب عورت سے شادی کر لی ہوگی۔ مجھے لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچوں کا پیٹ پالنا پڑا۔ بہت مشکل سے میں نے شوہر کا لیا ہوا قرض اتارا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ میرا شوہر واپس آ رہا ہے۔ 20000 روپے کا منی آرڈر آیا جو میرے بیٹے نے لے کر خرچ ڈالا۔ میرا بیٹا کہتا تھا کہ والد کے پیسوں پر بیٹوں کا حق ہوتا ہے' عورتوں کا پیسوں سے کیا تعلق؟ گو وہ میرے پاس رہتا ہے اور گھر سے کھاتا پیتا ہے لیکن یہی کہتا ہے کہ پیسے پر عورتوں کا حق نہیں ہوتا۔ میرے داماد کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ گھر میں کچھ پیسے آئے ہیں' اس نے میری بیٹی کو گھر بھیج دیا کہ جا کر اپنا حصہ لاؤ۔ جب میرے بیٹے نے انکار کر دیا تو میرے داماد نے میری بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔ ساتھ ہی اس نے طلاق کی دھمکی بھی دے دی۔ لیکن میرے بیٹے کو کوئی پروا نہ تھی۔ وہ سارا دن نشے میں دھت رہتا ہے اور گھر میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ مجھے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی ہے اور کہتا ہے کہ والد نے گھر اس کے لیے چھوڑا ہے۔ وہ میری بیٹیوں کو بیدردی سے مارتا ہے۔ ایک دن جب میں کام سے گھر آئی تو اس نے میری پانچ سالہ بچی کو اتنا مارا کہ اس کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ وہ تقریباً مرنے کے قریب ہوگئی۔ میری آٹھ سالہ بیٹی کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھائی نے میری چھوٹی بیٹی سے کھانا دینے کو کہا' جب اس نے بتایا کہ گھر میں کھانا نہیں ہے تو اس نے پانچ سالہ بہن کو مار مار کر تقریباً ختم کر دیا۔ ایک دفعہ اس نے میری چھوٹی بیٹی کو اس کا کیسٹ پلیئر چلاتے ہوئے دیکھ لیا۔ طیش میں آ کر اس نے اس کی ننھی انگلیاں بجلی کے سوئچ میں دے کر جلادیں۔ اب میں اپنی بیٹیوں کو ساتھ کام پر لے جاتی ہوں۔ وہ سبزیاں وغیرہ کاٹتی ہیں اور میں کھانا پکاتی ہوں۔ ایک دفعہ میری بیٹی کو بہت بھوک لگی۔ اس نے فریج سے تھوڑا سا گوشت چرا کر کھا لیا۔ مالکن نے دیکھ لیا اور منع کر دیا کہ آئندہ اس کو ساتھ نہ لانا۔ میں کیا کروں؟ کئی دفعہ سوچا کہ خود کو ختم کر لوں' ماروں اور بیٹیوں کو بھی ساتھ ہی ختم کر دوں مگر شاید ماں ہونے کے ناطے مجھ میں ہمت نہیں ہے''۔

صغریٰ کہتی ہے کہ اگرچہ اس کی مالکن مارتی تو نہیں لیکن مزاج کی سخت ہے اور

ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی ہے۔ کئی دفعہ گالی گلوچ بھی کر دیتی ہے اور اگر ایک دو چھٹیاں ہو جائیں تو تنخواہ بھی کاٹ لیتی ہے۔ جب صغریٰ سے پوچھا کہ وہ اپنا غصہ کیسے نکالتی ہے تو اس نے کہا کبھی رو کر، کبھی بچیوں پر چیخ کر اور کبھی کبھی جب مالکن کی زیادتی ناقابل برداشت ہو تو وہ ہانڈی جان بوجھ کر جلا دیتی ہے یا کوئی برتن دانستہ طور پر دھوتے ہوئے توڑ دیتی ہے۔ اگر بہت زیادہ غصہ ہو تو چھٹی کر لیتی ہے۔ کپڑے استری کرتے ہوئے جلا دیتی ہے کہ غلطی سے ہو گیا۔ مگر اسے دل میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کپڑا جان بوجھ کر جلایا۔ خاص طور پر جب اسے معلوم تھا کہ وہ سوٹ مالکن کا من پسند تھا یا وہ برتن مالکن کو بہت پسند تھا جب ہم نے پوچھا کہ ایسا کرنے کے بعد اسے ندامت ہوتی ہے یا نہیں تو صغریٰ نے کہا کہ نہیں۔ جو لوگ بیدردی سے ہمارا دل توڑتے ہیں، ان کے برتن توڑ کر ہمیں برا کیوں لگے۔

صغریٰ کا انداز مزاحمت بالکل وہی تھا جو اکثر کام کرنے والی عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ یہ انداز براہ راست نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ غلطی سے ہوا۔ مگر لاشعوری یا شعوری طور پر یہ دانستہ حرکت ہوتی ہے، جس سے دل کا غصہ نکل جاتا ہے اور نوکری قائم رہتی ہے۔ کام کو خراب کرنے سے مالکوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ جس سے ملازم کا غصہ تھوڑا ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طرز مزاحمت خطرے سے خالی نہیں کیونکہ نوکری سے نکال دیئے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ لیکن جہاں غصہ نکالنے کی کوئی اور صورت نہ ہو وہاں وہی چلتا ہے۔ صغریٰ کے غصہ کی وجہ صرف مالکن کا بے حس رویہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بیٹے کا ظالمانہ سلوک ہے۔ اس کا بیٹا بھی اپنا مرد ہونا صرف اور صرف اذیت اور تشدد کے ذریعے دکھاتا ہے۔ اس کی جسمانی طاقت زیادہ ہے لیکن ہر دوسرے طریقے سے اس کی مردانگی ہو چکی ہے کیونکہ نہ تو وہ گھر والوں کو کما کر کھلاتا ہے اور نہ گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے۔

گھریلو خادماؤں کی ان چند کہانیوں سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ عام طور پر گھریلو ملازمین شدید غربت اور افلاس سے دو چار ہیں۔ اکثر اس طبقے کے مرد معاشرے کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں سے تنگ آ کر یا تو نشے میں فرار حاصل کر رہے ہیں یا آوارہ گردی میں۔ کنبے کی کفالت نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اپنی اہمیت اور مقام کھو چکے ہیں۔ اس رتبے کو حاصل کرنے کے لیے وہ مار پیٹ اور تشدد کا سہارا لیتے ہیں تا کہ ان کے مرد ہونے کو فراموش نہ کیا جا سکے اور انہیں مراعات ملتی رہیں۔ ان میں سے اکثر مرد موسمی

کام کرتے ہیں جو کبھی نہیں۔ نتیجتاً ان کی عورتوں کو دوہرا کام کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ان کی بیویاں اور بیٹیاں کما کر لاتی ہیں۔ جن سے ان کی انا مجروح ہوتی ہے وہ ان کو طرح طرح کے الزام لگا کر اپنا غصہ نکالتے ہیں اور بدچلنی کے الزام سے ان کو کنٹرول کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے گھریلو ملازمین عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے خلاف تعصّبات بہت زیادہ ہیں جو ہر مرحلے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

مالکان اگر ظاہری طور پر سنگدل نہ بھی ہوں تب بھی وہ ان کی تضحیک کرتے رہتے ہیں۔ ان کی عزت کا ہرگز خیال نہیں رکھتے۔ کئی دفعہ خواتین ملازمین کے ساتھ جنسی تشدد بھی کیا جاتا ہے۔لیکن گالی گلوچ اور بے عزتی اور توہین مالکان عام طور پر کرتے ہیں اور بیشتر ملازم نوکری کے کھونے کے ڈر سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا پھر اپنے گھر والوں پر غصہ نکالتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ مالکوں کو سزا بھی دیتے ہیں جس میں برتن توڑنا' کپڑوں کو جلا دینا یا ہانڈی جلا دینا شامل ہے۔ یہ مزاحمت کے بالواسطہ انداز ہوتے ہیں ۔ان عورتوں نے کام کی جگہ پر مظالم کا ذکر اس قدر کھل کر شاید اس لیے نہ کیا ہو کیونکہ اکثر ان کے گھریلو حالات اس قدر کرب اور دکھ سے بھرپور ہوتے ہیں کہ کام کی جگہ بھی ان کے لیے وقتی راہ فرار ہوتی ہے یہاں پر یہ اپنے گھر کے اور خاندان کے دکھ بھرے حالات سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹکارا پاتے ہیں۔ گھر کی مصیبتوں کے مقابلے میں کام کی جگہ کی تکالیف انہیں زیادہ پریشان کن نہیں لگتیں۔

تاہم ان کہانیوں سے عورتوں کی جرات' مستقل مزاجی اور حوصلے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ پانچوں عورتوں نے' اور ان جیسی لاکھوں دوسری عورتوں نے' بے حد مشکل حالات کا مقابلہ کیا اور مصیبت کے وقت میں پورے کنبے کو سنبھالا' انہوں نے تنہا پورے کنبے کی کفالت بھی کی اور حفاظت بھی۔ اس کے مقابلے میں مرد' جنہیں محافظ یا کفالت کرنے والے سمجھا جاتا ہے' اکثر خود ہی ظالم نکلے اور حفاظت کی ضرورت ان محافظوں کے ہی خلاف پڑی۔ مرد کے محافظ ہونے کی متھ کی ان کہانیوں سے نفی ہوتی ہے اور عورت کے کمزور اور بے بس ہستی ہونے کی متھ بھی ان کہانیوں کے آگے غلط اور جھوٹی ثابت ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

چھٹا باب

نتائج اور اختتامیہ

یہ مطالعہ ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل اور مزاحمت سے متعلق ایک چھوٹے پیمانے کا جائزہ ہے۔ اس میں چار شعبوں سے متعلق تقریباً تیس(30) خواتین نے حصہ لیا۔ان چار شعبوں میں صنعتی کارکن' غیر سرکاری تنظیموں سے منسلک خواتین' اساتذہ اور گھریلو خادمائیں شامل ہیں۔ خواتین بہت سے دیگر شعبوں میں بھی سرگرم عمل ہیں لیکن اس مطالعے میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ انہیں بھی شامل کیا جائے۔ مثال کے طور پر کسان عورتوں کی زندگی پر بھی ایک مطالعے کی شدید ضرورت ہے۔ ہم وقت اور سہولتوں کی کمی کے باعث صرف 30 خواتین کو اس تحقیق میں شامل کر پائے۔اس وجہ سے اس مطالعے کے نتائج کو محتاط انداز میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ان نتائج کا اطلاق بلا تامل دوسری خواتین پر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہر شعبہ مختلف ہوتا ہے اور ہر فرد بھی علیحدہ ہوتا ہے ۔ایک شخص کے مطالعے سے حاصل کردہ نتائج کا دوسرے افراد پر اطلاق تحقیقی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتے کہ جو باتیں ان تیس عورتوں نے ہمیں بتائیں وہی باقی خواتین کے لیے بھی کہی جاسکتی ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ ہر زندگی دوسری زندگیوں سے مختلف ہوتی ہے اور ہر شخص کی کہانی ایک کی علیحدہ کہانی ہوتی ہے۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کہانیوں میں کہیں کہیں مناسبت یا مشابہت نظر آتی ہے۔ کچھ کہانیوں میں کچھ چیزیں یکساں ہیں اور کچھ مختلف۔ مزید یہ مطالعہ صرف لاہور کے کارکنوں کے ساتھ کیا گیا۔ اگر ایسی ہی تحقیق کراچی' فیصل آباد' ملتان، پشاور یا کسی اور شہر میں کی جاتی تو ممکن ہے کہ کہانیاں مختلف

ہوتیں اور ان میں اور قسم کے مسائل سامنے آتے ۔ پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ ان کہانیوں کو الگ الگ کہانیوں کے طور پر ہی پڑھا جائے کیونکہ حالات اور پس منظر ایک سے دوسری کہانی تک اتنے مختلف ہوتے ہیں انہیں اکٹھا دیکھنا کافی مشکل ہے۔

تاہم کچھ باتیں پھر بھی اخذ کی جاسکتی ہیں ۔ایک تو یہ مفروضہ بہت حد تک غلط ثابت ہوتا ہے کہ عورت محض ایک مظلوم و نادار ہستی ہے جو حالات سے بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتی ہے اور خاموشی سے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ فیکٹری کی کارکن ہوں یا گھریلو خادمائیں' اساتذہ ہوں یا این جی او ورکر' عورتیں گھروں میں' دفتروں میں' سڑکوں پر' ہر جگہ مزاحمت کا اظہار کرتی ہیں اور ڈٹ کر تلخ حقائق کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ظلم ضرور ہوتا ہے' تشدد سے انکار کرنا ناممکن ہے' لیکن عورت بے بس ولاچار نہیں ہے اور طرح طرح سے مزاحمت کرتی ہے۔ اس کی مزاحمت کا انداز خاموشی بھی ہوسکتا ہے اور لڑائی بھی' فرار بھی اور جھگڑا بھی' موسیقی و مصوری بھی ہوسکتا ہے اور اپنا حق لینے کی جنگ بھی۔ عورتیں گھروں میں بھی مزاحمت کرتی ہیں' خاندان والوں کے دباؤ سے بھی لڑتی ہیں اور مالکان' افسران اور سپروائزر کے حربوں کے خلاف بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مزاحمت کا جذبہ' جو کہ بنی نوع انسان کی میراث ہے' عورتوں میں بھی بھرپور انداز میں موجود ہے۔ بے شک وہ اس کا اظہار براہ راست نہ کریں۔ خاموشی سے دکھ برداشت کرنے والی عورت شاید آہستہ آہستہ تاریخ کا کوئی بھولا ہوا صفحہ بن جائے۔

ان خواتین سے انٹرویوز کے دورانیہ بات بھی واضح ہوئی کہ موجودہ دور کی معیشت میں مردوں کا کردار کم ہوگیا ہے کیونکہ اب بہت سے طبقوں کے مرد اکیلے کنبے کی کفالت نہیں کر پاتے۔ وہ کردار جو مردانہ غیرت' عزت وقار اور عصمت کی علامت ہوا کرتا تھا' کمزور ہوگیا ہے کیونکہ عورتوں کو گھروں سے نکل کر معاشی کاموں میں حصہ لینا پڑا ہے تاکہ گھریلو اخراجات پورے ہوسکیں۔ بہت سی عورتیں جن میں گھریلو خادمائیں' مزدور خواتین' اساتذہ سب شامل ہیں نے بتایا کہ انہیں والد کی وفات کے بعد مجبوراً کام کرنا پڑا یا شوہر سے طلاق کے بعد کام کرنا پڑا تاکہ خاندان کو سنبھال سکیں۔ کچھ کے بھائی' شوہر یا بیٹے ناکارہ تھے' کام چور تھے یا پھر نشے کے عادی تھے جس کے باعث ان خواتین نے کما کر انہیں کھلایا۔ چنانچہ جہاں ایک طرف مردوں کا روایتی بوجھ کم ہوا' وہاں دوسری طرف عورتوں

MashalBooks.org

کا دوہرا بلکہ تین گنا ہو گیا کیونکہ مامتا اور گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ انہیں ملامت بھی کرنا پڑی اور کمیونٹی کے کاموں میں بھی ان کی شمولیت اہم قرار دی گئی۔ اکثر ایسا بھی ہوا' جیسا کہ ان خواتین کے انٹرویوز سے واضح ہے کہ جب خواتین نے ملازمت کی تو مردوں نے ان پر تشدد میں اضافہ کر دیا کیونکہ ملازمت پیشہ خواتین کے آزاد اور خود مختار ہو جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں ماضی میں مرد کے کنٹرول کا ذریعہ اس کی کفالت تھی جو کمزور پڑ جانے کے باعث ہاتھ سے چلی گئی۔ اب کنٹرول کا واحد ذریعہ یہ رہ گیا کہ عورت کو مارا پیٹا جائے۔ اور اس کی آمدنی پر اسے اختیار نہ دیا جائے۔ لہٰذا جدید دور میں جہاں عورت کا معاشی کردار بڑھ گیا ہے وہاں اس پر تشدد بھی بڑھ گیا ہے کیونکہ اس کی آزادی مردوں کے لیے خطرے کا باعث ہے اور ان کی انا گوارا نہیں کرتی کہ عورت کی کمائی کھائیں لیکن انہیں مجبوراً کھانا بھی پڑتی ہے۔

جیسا کہ پہلے' کتاب کے شروع میں کہا گیا۔ موجودہ دور کے صنعتی کردار کی تبدیلی کی وجہ سرمایہ داری' نظام ہے جو انسان کے بے شمار چیزوں کا خواہاں بنا دیتا ہے جو کہ زیادہ آمدنی کے بغیر خرید ناممکن نہیں ہوتا۔ عورتوں کے کردار میں اضافہ اور مرد کے کردار میں کمی سی نظام کی اسی وجہ سے ہوئی جو سستی لیبر اور زیادتی آسانی سے کنٹرول ہو جانے والی لیبر کا طلبگار ہے۔ اس تبدیلی کے اثرات مردوں اور عورتوں کے باہمی رشتوں کی تبدیلی کی شکل میں نمودار ہوئے۔ معاشی رشتہ بدل گیا۔ عورت کا مرد پر مکمل انحصار ختم ہو گیا' لیکن اس اعتبار سے اقدار اتنی تیزی سے نہیں تبدیل ہو رہیں کیونکہ مرد اپنی روایتی طاقت کھونا نہیں چاہتے۔ چنانچہ دونوں فریقوں میں ایک قسم کی جنگ چل پڑی ہے جس میں تشدد کا استعمال ہو رہا ہے۔

مرد اور مرد کے پرانے تصورات میں بحران کی وجہ سے مردانگی کو ثابت کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ یہ سب تشدد پر مبنی ہیں۔ جہاں کنبے کی حفاظت کر کے مردانگی کا ثبوت دینا ناممکن ہو گیا ہے وہاں تشدد کی نئی سے نئی شکل ثبوت دینے کی کوشش میں نمودار ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر بڑی بڑی فوجیں اور اسلحے سے لیس سپاہی اور فوجی' مردانگی کی انتہا پسندی کی جھلک ہے۔ کیونکہ مردانگی کا تصور اب بھی طاقت' زور' قابو پانے سے جڑا ہوا ہے اس لیے طاقت کا مظاہرہ نئے سے نئے ہتھیار بنانے' فتح کرنے' جنگ

وجدل کرنے اور قتل و غارت کرنے کے ذریعے کیا جا رہا ہے یہ تشدد کبھی دوسرے ممالک کے ساتھ جنگوں میں نظر آتا ہے یا پھر لسانی ' علاقائی فرقہ وارانہ اور دیگر فسادات کی صورت میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان خوراک کی غرض سے جانوروں کا شکار کم کرتا ہے اور اس کا نشانہ اب اکثر دوسرے انسان ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرد اپنا کھویا ہوا وقار' عزت' رتبہ اور مقام کیونکہ حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تشدد اور قتل و غارت بھی ختم کر دیں اور پھر بھی مرد کہلائیں؟ جنگیں نہ لڑیں' فرقہ واریت اور علاقائی قتل و غارت نہ کریں لیکن پھر بھی مردانگی کا مظاہرہ کر لیں اور اپنی انا کو تسکین پہنچا لیں؟ ہمارے تجزیے کے مطابق یہ ممکن ہے۔ تشدد کے ذریعے مردانگی کا مظاہر خود اپنی شکست بن جاتا ہے کیونکہ خود سے جسمانی طور پر کمزور شخص پر ہاتھ اٹھانا نامردی سمجھی جاتی ہے چنانچہ تشدد مردانگی کا ثبوت ہونے کے بجائے نا مردی کا ثبوت بن جاتا ہے۔ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد تو ایک ڈرا ہوا۔ خوفزدہ اور عدم تحفظ کا شکار شخص کرتا ہے۔ اس طریقے سے تو کمزوری کی جھلک نظر آتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات تشدد کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں تو پھر اس تصوراتی بحران کا حل کیا ہے؟۔

ان مسائل کا حل انسان کے اپنے ذہن کی تخلیقی قوت میں ہے۔ جو انسان نسوانیت اور مردانگی کے مخصوص تصورات تعمیر کر سکتا ہے' وہ ان تصورات میں تبدیلی لانے کا بھی اہل ہے۔ تصورات کو تبدیل کرنا انسان کی طاقت میں ہوتا ہے اور انسان کی علمی اور تخلیقی صلاحیتا وسیع ہوتی ہے۔ جو انسان تصورات بنا سکتا ہے' وہ انہیں توڑ بھی سکتا ہے۔ جس انسان نے بت بنائے' اسی نے وقت پڑنے پر ریزہ ریزہ کر بھی دیئے۔ تصورات بھی بتوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جن کی پرستش بھی کی جا سکتی ہے اور توڑا بھی جا سکتا ہے۔

علم کے ذخیرے میں اضافہ کرنے والوں کا یہ کام ہے کہ وہ روایتی تصورات کو از سر نو تشکیل دیں ۔ نسوانیت اور مردانگی کے تصورات کی پرانی شکل موجودہ دور کی حقیقتوں کے برعکس ہے۔ لہٰذا پرانے تصورات کو ترک کرنا ہوگا اور ان تصورات کے ساتھ نئی صفات کو جوڑنا ہوگا۔ اس کام کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جارحیت' تشدد اور جسمانی طاقت کو مردانگی کے تصور سے علیحدہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے پہلے طاقت' زور اور جسمانی قوت کی پوجا اور پرستش ترک کرنا ہوگی۔ جب تک انسان کی جسمانی قوت کو تشدد اور جارحیت

کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا' مردانگی اور جسمانی طاقت کا تصوراتی رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔ انسان کی جسمانی اور ذہنی قوت کو تخلیقی کام اور تخلیقی مشقت سے جوڑنا ہوگا تاکہ جسمانی توانائی کا مثبت استعمال ہو۔ تعمیری ہو نہ کہ تباہی کی غرض سے اسے استعمال کیا جائے۔ تخلیقی مشقت سرمایہ داری نظام میں رہتے ہوئے ممکن نہیں ہوگی۔ سرمایہ داری نظام انسان کی تمام تر جسمانی توانائی کو منافع کی خاطر ایک ہی جیسے غیر دلچسپ کام میں لگا دیتا ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ اس قسم کے طبقاتی نظام کو ختم کرنے سے ہی تشدد کا دائرہ ٹوٹے گا کیونکہ جب تک ایک مزدور اور غریب طبقے کا شخص سرمایہ داری کی چکی میں پسے گا' وہ اپنا رنج وغم تشدد کی صورت میں ضرور نکالے گا۔ اگر جسمانی توانائی وقوت تشدد اور جارحیت کے بجائے تخلیقی اور تعمیری کاموں میں استعمال ہوئی' تو اس کو مردانگی کے روایتی تصور سے علیحدہ کرنا بھی قدرے آسان ہو جائے گا۔ جسمانی قوت اور بہادری نہ تو قابل پرستش اقدار رہیں گی اور نہ انہیں مردانگی کی علامت سمجھا جائے گا۔

اگر طاقت' قوت بہادری اور دلیری کے تصورات کو مردانگی سے علیحدہ کر دیا گیا' تو اس تصور کے اندر کیا رہ جائے گا؟ اس تصور میں پھر وہ کام اور صفات شامل کرنا ہوں گی جو روایتی طور پر عورتوں سے منسوب کی جاتی ہیں مثلاً گھر کا کام بچوں کی دیکھ بھال' ہمدردی' پیار اور شفقت۔ جس طرح گھر سے باہر ملازمت کرنا اب نسوانیت کے تصور میں پوری طرح شامل ہو چکا ہے اسی طرح گھریلو کاموں میں شامل ہونا مردانگی کے تصور کا حصہ بن جانا ضروری ہے۔ گھریلو کام اور بچوں کی دیکھ بھال کو نامردی کہنے کی روش کو ختم کرنا ہوگا۔ نسوانیت اور مردانگی سے منسوب کیے جانے والے تصورات کو نئے سانچے میں ڈھالنے سے امید کی جاسکتی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان طاقت کے رشتے بھی تبدیل ہوں گے۔ ان رشتوں کا دارومدار موجودہ دور میں طاقت عدم برابری اور تشدد پر ہے لیکن مستقبل میں ان رشتوں کا دارومدار باہمی تعاون اور دوستی پر ہوسکتا ہے۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب لوگ پیداوار میں حصہ دار ہوں گے اور ان کے وقت اور قوت کا بہت بڑا حصہ غیر دلچسپ اور غیر تخلیقی کاموں میں صرف نہیں ہوگا۔ انسانی قوت کا کچھ حصہ ضروری اور پیداواری کاموں میں لگانا ضروری ہوتا ہے تاکہ انسان خوراک کا انتظام کر سکے۔ لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ دن کے دس یا بارہ گھنٹے ان کاموں پر صرف ہو جائیں۔ اضافی کام

صرف منافع کمانے کی غرض سے کروایا جاتا ہے۔ اگر دن کے پانچ چھ گھنٹے' ضروری مشقت میں لگا دیئے جائیں تو انسان اتنا نہیں تھکتا کہ تخلیقی قوت کو بڑھانے میں نہ لگا سکے۔ جدید دور کی ٹیکنالوجی نے یہ ممکن کر دیا ہے کہ انسان کو فارغ وقت ملے لیکن منافع کی ہوس کے تحت سرمایہ داری نظام میں لوگوں کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ دن میں دس بارہ گھنٹے غیر دلچسپ کاموں میں لگائیں۔ جن میں یک ہی حرکت مسلسل دہرائی جاتی ہے اور انسان مشین کے پرزے کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو تشدد' دکھ' بیگانگی' اجنبیت اور بدحالی کو جنم دیتا ہے کیونکہ اتنے طویل اوقات صرف ذریعہ معاش میں لگا دینے کے باعث نہ تو اس کے پاس گھر والوں اور خاندان والوں کے ساتھ پیار و محبت کے رشتے قائم کرنے کے لیے رہتا ہے اور نہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے وقت یا قوت رہ جاتی ہے۔ اس طرح ایک شخص دوسروں سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے دور اور علیحدہ ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔ تمام رشتے ناطے صرف استحصالی رہ جاتے ہیں اور بازاری قوتوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام بے شمار اشیاء کے حصول کی خواہش بھی پیدا کرتا ہے جس کے لیے لوگوں کا زندگی سے رشتہ صرف مشقت اور خریداری کا رہ جاتا ہے۔ وہ کماتا ہے اور اشیاء خریدتا ہے ۔اس کی زندگی کے دوسرے اہم پہلو آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے افراد سے قریبی رشتے ٹوٹ جانے کے باعث وہ انہیں اشیاء اور روزگار کے حصول میں صرف رقیب کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ہر دوسرا شخص اس کے لیے ایک دشمن یا رقیب بن جاتا ہے جو روزگار اور چیزیں حاصل کرنے کی دوڑ میں اس کے مقابل ہے' اس کا رقیب ہے۔ اس طرح وہ ہر دوسرے شخص کے خلاف ہو جاتا ہے اور اس سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اس خوف اور مقابلے کے احساس کو فرقہ وارانہ اور لسانی جماعتیں استعمال کر کے تشدد اور غصے کو مزید ابھارتی ہیں ۔ چنانچہ روزگار کا خوف' تحفظ کا خوف' دوسروں سے دوری اور بیگانگی' ہر ایک کو حریف تصور کرنے کا رجحان' ان تمام چیزوں کو سیاسی جماعتیں فرقہ وورانہ رنگ دے کر استعمال کرتی ہیں۔ سندھیوں کو لگتا ہے کہ مہاجران کا روزگار اور سکھ چھین لیں گے' مہاجروں کو لگتا ہے کہ سندھی ایسا کر رہے ہیں۔ شیعوں کو لگتا ہے کہ سنی ان کے دشمن ہیں اور تمام وسائل پر قابض ہو جائیں گے۔ سنی کو لگتا ہے کہ شیعہ اس کا دشمن ہے۔ ہر شخص دوسروں کو پیروں تلے روند کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دوڑ

میں تشدد بہت بڑھ جاتا ہے اور باہر کی دنیا کے مسائل گھر کی دہلیز کو پار کر جاتے ہیں جہاں یہ تشدد عورتوں پر نکلتا ہے۔

سرمایہ داری نظام مردانگی سے منسوب تصورات کی معراج ہے۔ اس نظام میں مقابلہ کرنا' دوسرے کو ہرا دینا یا پیچھے چھوڑ دینا' دوسروں کی محنت چھین لینا' وسائل اور ذرائع پیداوار پر قبضہ جمالینا بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مردانگی سے منسوب جارحانہ تصورات اس وقت تک ماند نہیں پڑیں گے جب تک کہ سرمایہ داری نظام رہے گا۔ یہ نظام کمزور طبقوں اور عورتوں' دونوں کو ایک ہی طرح سے دیکھتا ہے۔ مزدور اور عورت محنت کے لیے بنے ہیں' ان کی محنت کو بہت کم داموں یا مفت میں چرانا ہے' ان دونوں کا استحصال کرنا ہے اور دوسرے سرمایہ داروں کے مقابلے میں جیتنا ہے۔ چنانچہ مزدور کسان طبقوں اور عورتوں کی صورت حال میں کچھ یکسانیت ہے جو اگر سمجھ لی جائے تو ان دونوں گرپوں میں یکجہتی ہوسکتی ہے۔ امیر طبقوں کی خواتین بھی اپنے طبقوں کے مردوں کے مقابلے میں کمتر اور کمزور ہوتی ہیں۔اس لیے تمام پسے ہوئے گروپوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنا ہوگا۔ کیونکہ دشمن ایک ہی ہے اور وہ سرمایہ داری نظام ہے۔ کوئی ایک فرد نہیں ہے اور نہ مرد حضرات ہیں۔

سرمایہ داری نظام کو تبدیل کرنے سے مردانگی سے منسوب دیگر تصورات بھی کمزور پڑ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر قبضہ کرنے کا جذبہ' جنگ و جدل' اسلحے کی دوڑ دوسروں کی زمین اور وسائل پر تسلط جمانے کا جذبہ اور فتح حاصل کر کے ہیرو بن جانے کا جذبہ' کیونکہ سرمایہ داری نظام منڈیوں اور خام مال کی تلاش کرتا ہے' اس کے اندر جارحیت' قبضہ کرنا' فتح کرنا' دوسروں کی زمین اور وسائل چھین لینا' یہ سب کچھ کثرت سے موجود ہے۔ سامراجیت کو بھی اسی نظام کی اقدار نے پیدا کیا۔ چنانچہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر ذرائع پیداوار کا سماجی انصاف پر مبنی ہوگا اور یہ ذرائع سب کی ملکیت ہوں گے' تو ایک طرف مقابلہ کرنے کی روح کم ہوگی' جارحانہ جذبات میں کمی واقع ہوگی۔ قبضہ کرنے کی خواہش کم ہوگی اور فتح کرنے کی کوشش میں بھی کمی آئے گی۔ اس طرح جنگ و جدل اور قتل و غارت کا جذبہ بھی کمزور ہوگا۔ اس طرح مردانگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنا کسی قدر آسان ہو جائے گا۔

تاہم یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ معلوم ہوتا ہے۔ آجکل عالمی سرمایہ

داری نظام پورے زور وشور سے آزاد منڈی کی معیشت کے نام سے پوری دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔'' آزاد منڈی کی معیشت'' جو سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے' اس حد تک طاقتور ہو چکی ہے کہ قومی ریاست اس کے سامنے کمزور ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے قومی ریاستیں خود کو عالمی ترقیاتی بینک' ملٹی نیشنل کمپنیوں اور عالمی مالیاتی ادارے کے ہاتھوں بے بس محسوس کرتی ہیں۔ ویسے ویسے ان میں قومی غیرت' قومی عزت اور قومی وقار اور قومی تحفظ کا جوش بڑھتا ہے۔ اس کی مثال ہمیں پاکستان میں 28 مئی کے ایٹمی دھماکوں کے بعد کی صورتحال سے ملتی ہے۔ جیسے جیسے پاکستان معاشی طور پر کمزور ہوتا چلا گیا اور معاشی پابندیوں کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا' ویسے ویسے قومی غیرت اور عزت مند قوم کے نعرے تیز ہوتے گئے اور خود انحصاری کے بیکار نعروں نے زور پکڑا۔ دوسروں سے بھیک مانگنے کے باعث جب قومی انا مجروح ہوئی تو غیرت مند قوم ہونے کے نعرے تعداد میں بڑھ گئے۔ قومی غیرت اور قومی عزت کے تصورات عورتوں کو قومی غیرت وعزت کی علامت بنا دیتے ہیں اس طرح عورتوں کو دبانے' چادر اور چار دیواری میں لپیٹ دینے اور انہیں باہر کی دنیا سے غائب کر دینے کے مطالبات بڑھ جاتے ہیں۔ جب قومی غیرت شدید حد تک مجروح ہوتی چلی جاتی ہے تو مذہب کا سہارا لے کر خود کو عظیم قوم ہونے کی تسلی دی جاتی ہے۔ اس طرح جب شرعی نظام نافذ کرنے کا مطالبہ بڑھتا ہے تا کہ خود کو تخیلاتی طور پر طاقتور تصور کر لیا جائے تو سب سے پہلے خواتین کے حقوق سلب ہوتے ہیں۔ چاہے افغانستان میں طالبان ہوں یا پاکستان میں مولوی حضرات' مسلم قومی غیرت کی افتاد عورتوں پر گرتی ہے اور ان پر مزید پابندیاں لگانے کے مطالبات زور پکڑ لیتے ہیں۔ بقول نیلم حسن عورت خوف اور ہوس دونوں چیزوں کی علامت ہوتی ہے۔(1) لہٰذا اس کی طرف مردانہ جارحیت بڑھ جاتی ہے' خاص طور پر جب مرد خود کو دوسرے مردوں یا دوسری قوموں کے مردوں سے خطرے میں محسوس کرتے ہیں۔ جب تک مردوں کے درمیان قومی' مذہبی فرقہ وارانہ اور لسانی فسادات رہتے ہیں' عورتیں مزید تشدد بنی رہتی ہیں کیونکہ وہ مردوں کی جنگوں اور لڑائیوں میں میدان جنگ بن جاتی ہیں اور ان پر زنا بالجبر اور دیگر قسم کا تشدد کیا جاتا ہے۔ اس امر کا تفصیلی مطالعہ حال ہی میں ہندوستان کی دو عورتوں ریتو مینن اور کملا بھسین نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے جس کا موضوع تقسیم ہند کے دوران ہونے والا تشدد ہے۔

اس بحث سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پدرسری کے تشدد کا ازالہ یا تدارک کوئی ایک معاشرہ اکیلا نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داری نظام چونکہ عالمی ہے' اس کے خلاف مزاحمت بھی عالمی سطح پر ہی ہوسکتی ہے۔ جب تک ایک معاشرہ دوسروں کو زیر کرتا رہے گا اور تسلط جماتا رہے گا' جب تک ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو دباتا رہے گا' اس وقت تک نہ تو سرمایہ داری ختم ہوگی اور نہ سرمایہ دارانہ طرز کی پدرسری۔ ان دونوں کو اکٹھا کرنا ہوگا کیونکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ عالمی پدرسری کی جارحیت قومی اور مقامی طرف کی پدرسری کو مزید مستحکم کرتی ہے جو کہ واپس پھر عالمی طرز کی پدرسری کو مضبوط کرتی ہے۔ اس طرح پدرسری کے مفادات میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو۔ جس طرح یہ سرمایہ داروں کی باہمی رقابت کے باوجود ان میں ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے' اسی طرح پدرسری میں باہمی رقابت کے باوجود ان میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اس عمل میں عورتوں پر نہ صرف معاشی وثقافتی اور سماجی تشدد ہوتا ہے بلکہ جسمانی اور اور ذہنی تشدد بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ خواتین کی مزاحمت اگر صرف پدرسری کے نظام اور مردوں کے خلاف رہی تو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ اس مزاحمت کو پدرانہ نظام کی قدروں کے علاوہ سرمایہ داری' جاگیرداری اور عالمی معیشت کے نظام کے خلاف بھی ڈھالنا ہوگا۔ یہ کام بیک وقت کرنا ہوگا کیونکہ یہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں علیحدہ طور پر نہیں ختم کیا جاسکتا۔ معاشی نظام' خواہ سرمایہ داری ہو' قبائلی ہو یا جاگیرداری ہو' قدروں کو نظام سے جڑا ہوا ہوتا ہے اور قدروں کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ ان دونوں کو'معاشی طبقاتی نظام اور پدرسری کے نظام کو' اکٹھا ختم کرنا ہوگا۔ ان کے خلاف جدوجہد بیک وقت کرنا ہوگی کیونکہ معاشی نظام اور اقدار کا نظام ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

اس جدوجہد میں عورتوں کو یہ مفروضہ ترک کرنا ہوگا کہ تشدد یا پدرانہ تسلط ایک انفرادی عمل ہوتا ہے جو برے مرد کرتے ہیں۔ انہیں ان باتوں کا تجزیہ سماجی ڈھانچوں کے زاویئے سے کرنا ہوگا۔ مرد بھی عالمی' قومی اور سماجی ڈھانچوں میں اتنے ہی پھنسے ہوئے ہیں جتنی کہ عورتیں۔ معاشی خوشحالی سے تشدد اور تسلط مکمل طور پر ختم تو نہیں ہو جاتے لیکن کمزور ضرور ہو جاتے ہیں۔ معاشی خوشحالی اور منصفانہ معاشروں میں قومی غیرت' قومی عزت و وقار جیسے تصورات کا اتنا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ اس لیے عورتوں کے خلاف قانون سازی بھی کم ہو

جاتی ہے اور ریاست بھی اس حد تک پدرانہ اقدار سے متاثر نہیں رہتی۔

مردانگی اور نسوانیت سے متعلق تصورات تبدیل کرنے سے مردوں کو بھی فائدہ پہنچے گا کیونکہ ان پر بوجھ بھی کچھ گھٹ جائے گا۔ موجودہ سوچ میں مردوں پر بہت زیادہ بوجھ ہے کہ وہ ہر دم مردانگی کا مظاہرہ کریں اور مرد ہونا ثابت کریں۔ کبھی کشتیوں میں، کبھی آنسوؤں کو چھپا کر، کبھی زندگی کو داؤ پر لگا کر، اور کبھی جنگ کے دوران جان دے کر۔ مردوں سے ہروقت معاشرے کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ دلیری دکھائیں۔ بہادری دکھائیں، طاقت کا مظاہرہ کریں اور مضبوطی کا ثبوت دیں۔ اسی لیے جھگڑے، فساد جنگیں وغیرہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ دلیری کے مظاہرے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر مردانگی کو ہر دم دلیری کے مظاہرے سے علیحدہ کر دیا جائے، اس کے مفہوم میں تبدیلی لائی جائے تو مردوں سے تقاضے بھی کم ہو جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا معاشرتی کردار بھی بڑھ جائے گا کیونکہ یہ بچوں کی نگہداشت اور گھریلو کوموں میں حصہ لینے میں شرم محسوس نہیں کریں گے۔ ان کی معاشرتی اہمیت اور ضروریات لڑائی جھگڑے کے بجائے اہم کاموں میں ظاہر ہوگی مثلاً بچوں کی دیکھ بھال اور گھریلو کام۔ اس طرح عورتوں پر بوجھ کم ہو جائے گا اور وہ بھی تنگ آ کر لڑنے جھگڑنے سے گریز کریں گی۔ امید کی جاسکتی ہے کہ روایتی تصورات بدلنے سے عورتوں اور مردوں کے درمیان دوستی اور رواداری کے رشتے مضبوط ہوں گے اور موجودہ کشیدگی، عدم اعتبار اور تلخی کی کیفیت دور ہو سکے گی۔

نسوانیت اور مردانگی کے تصورات تبدیل کرنے سے پورے معاشرے کو بھی فائدہ ہے۔ جب مردانگی کے تصور سے دلیری، بہادری، کارنامے اور شجاعت کے تصورات کو خراج کر دیا جائے گا تو ان تصورات کا بھی ارتقاء ہوگا اور یہ خود بھی اپنے مفہوم میں بدل جائیں گے۔ اسی طرح کام کا تصور بھی بدل جائے گا اور کچھ کام نسوانی اور کچھ مردانہ کے بجائے تمام کام چاہے بچوں کی دیکھ بھال ہو، کھانا پکانا ہو، گھروں کی حفاظت کرنا ہو، انسانی کام سمجھے جائیں گے۔ یہ نہ تو نسوانی ہوں گے اور نہ مردانہ بلکہ محض انسان کے ضروری کام قرار دے دیئے جائیں گے۔ جنہیں مرد بھی کر سکتے ہیں اور عورتوں کی ذمہ داری نہیں رہیں گے۔ اور تمام باہر کے کام بھی صرف مردوں کی ذمہ داری نہیں رہیں گے۔ اس طرح ذمہ داریوں کی تقسیم زیادہ منصفانہ انداز میں کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح دلیری، بہادری اور شجاعت جیسے الفاظ کے مفہوم تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ تصورات روایتی سوچ کے دائرے میں رہے، جنگ خانہ جنگی، تشدد اور فرقہ وارانہ فسادات کم نہیں ہوسکیں گے۔ لیکن ان تصورات کی از سرِ نو تشکیل ممکن ہے۔ دلیر اور بہادری کو جنگ میں قتل کرنے یا دوسرے کو مارنے یا اس پر غالب آجانے کے بجائے روز مرہ کی چھوٹی موٹی جدوجہد سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور میں روز مرہ کی جدوجہد اور مزاحمت ضروری ہوگئی ہے۔ ہر شخص اپنی روزی روٹی کے لیے تگ و دو کرتا ہے، بیماریوں یا آسمانی آفتوں کا مقابلہ کرتا ہے، دکھ تکلیف اور ظلم برداشت کرتا ہے۔ بہادری کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کو مارنے کے بجائے کسی کو بچایا جائے۔ دلیری کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکمرانوں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے، چاہے جیل میں ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ شجاعت کا مطلب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی طاقتور جاگیردار کی نجی جیل سے غریب کسانوں کو چھڑایا جائے۔ کیا شکیل پٹھان جنہوں نے یہی کیا، دلیر نہیں تھے؟ کیا اختر حمید خان جنہوں نے اورنگی کے پسماندہ علاقے کی شکل تبدیل کر دی، بہادر نہیں ہیں۔ جب روز لوگ افسر شاہی کے مظاہرے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو وہ بہادری کا مظاہرہ نہیں ہے۔ لوگوں کو آگ سے بچانا، سیلاب یا طوفان سے بچانا کیا شجاعت کے کارنامے نہیں ہیں؟ کسی کو مارنے پیٹنے اور دبانے کے بجائے مصیبت سے نجات دلانا اور بچانا کیا دلیری نہیں ہے؟ کیا دلیری اور بہادری صرف دوسروں کا سر نیچا کرنے میں ہے؟ کیا کسی غریب و مفلس کی مدد کرنے یا کسی غریب بچے کی ذمہ داری لے لینے میں شجاعت نہیں ہے؟ ان الفاظ کو جنگ و جدل، فسادات اور ہیرو بننے کا دائرے سے نکال کر سماجی کارناموں سے جوڑنا ہوگا تاکہ طاقت کی پوجا کرنے والا معاشرہ تباہ کن نوعیت کی طاقت کے بجائے تعمیری طرز کی طاقت کو بہتر سمجھے۔ توڑنا آسان ہوتا ہے، تعمیر کرنا بہت مشکل۔ اگر ہمیں طاقت دلیری، بہادری اور شجاعت کے ''مردانہ'' مفہوم کو ختم کر کے ان الفاظ کے معاشرتی مفہوم تلاش کرنا ہوں گے۔ اور یہ جدوجہد بھی عالمی سطح پر ضروری ہے کیونکہ آجکل کے ''عالمی گاؤں'' میں کوئی معاشرہ اکیلا نہیں رہا۔ ہر معاشرے کا دوسروں پر انحصار ہے۔ عورتوں کو سڑکوں پر چھیڑنا، آوازیں اور فقرے کسنا ہرگز دلیری اور بہادری کی نشانیاں نہیں بلکہ اس خوف کی غمازی کرتی ہیں کہ عورت اگر کفالت کے لیے گھر سے باہر کی دنیا میں نکل آئی تو مرد کی اہمیت کم ہو جائے گی۔

MashalBooks.org

یہ دراصل خوفزدہ، شکست خوردہ اور بزدل مردوں کی نشانی ہے۔ اسی طرح عورتوں اور بچوں پر تشدد کسی بہادر یا دلیر مرد نہیں بلکہ کمزور اور خوفزدہ مرد کی نشانی ہے۔ دلیری وہ نہیں ہے جو اپنے سے چھوٹے پر دکھائی جائے بلکہ وہ ہے جو اپنے اعلیٰ افسر کی زیادتی پر مزاحمت کے ذریعے دکھائی جائے خواہ نوکری چلی جائے۔ دلیری بدعنوان حکمرانوں سے ٹکر لینے کا نام ہے، چاہے وہ جیل میں ڈال دیں۔ جارحیت طاقت کی نہیں، خوف کی علامت ہے، چاہے وہ جیل میں ڈال دیں۔ جارحیت اور تشدد کا سرچشمہ خوف ہوتا ہے اور خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ جارحیت اور تشدد کمزوری، بزدلی اور خوف سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح محبت، پیار، شفقت اور ہمدردی کمزوری کی نشانیاں نہیں ہیں بلکہ مضبوطی اور بہادری کی نشانیاں بھی ہیں۔ کمزور اور بزدل شخص پیار، ہمدردی، رحمدلی اور نرم جذبات کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ نرم جذبات اور رحمدلی کے جذبات اندرونی طاقت کی غمازی کرتے ہیں۔ کمزور شخص مارنے پر آمادہ رہتا ہے کیونکہ خوفزدہ ہوتا ہے، جذباتی اور جسمانی طور پر طاقتور شخص رحمدلی اور ہمدردی پر آمادہ رہتا ہے کیونکہ وہ خوفزدہ نہیں ہوتا۔

اسی لیے عورتوں کے لیے بہت اہم ہے کہ وہ اپنی طاقت کو پہچانیں۔ ان کے نرم اور ہمدردانہ جذبات ان کی کمزوری کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ ایک اندرونی طاقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عورت مظلوم نہیں بلکہ طاقتور ہے۔ اس کی طاقت کا ذریعہ اس کے نرم جذبات ہیں، اس کی حساس طبیعت ہے اور اس کی رحمدلی اور ہمدردی ہے۔ عورت خود کو مظلوم و بے بس طبیعت ہے اور اس کی رحمدلی اور ہمدردی ہے۔ عورت خود کو مظلوم و بے بس کہہ کر اپنے آپ سے ناانصافی کرتی ہے۔ اگر وہ غور کرے تو وہ ہر ظلم اور ہر تشدد کے خلاف خندہ پیشانی سے لڑتی ہے۔ جب وہ خود مردوں کے انداز میں طاقت کا منفی مظاہرہ کرتی ہے، اس وقت وہ پدرسری نظام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی نسوانیت کے مثبت پہلو کو جھٹلا رہی ہوتی ہے۔ یہ مفروضہ غلط ہے کہ عورت بیچاری اور مظلوم ہے اور حالات کے آگے بے بس ہے۔ کیونکہ بارہا عورتوں نے اپنی مضبوطی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا، نہ صرف اس مطالعے میں بلکہ تاریخی طور پر بھی۔

چنانچہ ہم اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پدرسری نظام کا دارومدار افراد پر نہیں بلکہ موجودہ دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں پر ہے۔ عالمی سطح کی

پدرسری بہت جارحانہ طرز کی ہے اور وہ دوسرے معاشروں میں قدم رکھ کر اپنا تسلط جماتی ہے، کبھی نوآبادیوں کی شکل میں، کبھی سامراجی صورتوں میں، افراد کی تبدیلی کے لیے اس نظام اور اس کے ڈھانچوں کی طاقت، مضبوطی اور کمزوری کے تصورات بھی تبدیل کرنا ہوں گے اور انہیں صنفی خانوں سے نکالنا ہوگا۔ اس مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تشدد اور بربریت کی لہر کے لیے قطعی طور پر مردوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ ان عوامل کی پشت پر معاشی، سیاسی اور طبقاتی عناصر کارفرما ہوتے ہیں جو پسے ہوئے افراد کو کمزور کرتے ہیں۔ ان پسے ہوئے افراد میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، جنہیں یہ نظام کمزور کرتا ہے۔ اصل پدرسری طبقاتی طاقت میں ہوتی ہے لیکن اس کا اثر نچلے اور غریب طبقوں کے مردوں تک چلا جاتا ہے- وہ بھی عورتوں پر تشدد شروع کر دیتے ہیں اور اس عمل میں اپنے ہی طبقے کا نقصان نہیں دیکھ پاتے۔ دبے ہوئے طبقوں کے مردوں اور عورتوں کو مل کر اس نظام کے خلاف مزاحمت کرنا پڑے گی جس میں وہ جکڑے ہوئے ہیں اور جو انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے اور ان کے اتحاد کو توڑ دیتا ہے۔

عام طور پر جب عورتوں پر تشدد کے تجزیئے کیے جاتے ہیں تو تمام تر توجہ عورت پر ہی ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ کیونکہ عورت، غیرت' عزت' خوف اور خواہش کی نشانی ہے، اس کا جسم تشدد کا نشانہ بنتا ہے- اس مطالعے میں ایک نیا زاویہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق مسئلہ عورت کی طرف سے نہیں بلکہ مردانگی کے تصور کے بحران کی وجہ سے ہے۔ موجودہ دور میں صنفی تصورات کا بحران ہے- جہاں عورتوں اور مردوں کے کرداروں میں تیزی سے تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور عورتوں کا گھر سے باہر کی دنیا میں کردار بڑھ گیا ہے۔ جبکہ مردوں کا گھر کے اندر کی دنیا میں پوری طرح کردار واضح نہیں ہوا۔ مردوں کا کردار کچھ کم ہو جانے کے باعث، مردانگی کا اظہار ہر قسم کے تشدد کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ یہ تشدد گھر سے لے کر معاشرے تک اور معاشرے کے اداروں سے لے کر ریاست تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی فرقہ واریت اور لسانی فساد میں خود کو ظاہر کرتا ہے، کبھی گھریلو تشدد میں اور کبھی جنگ و جدل میں۔ موجودہ زمانے میں مردانہ طاقت کا ثبوت فراہم کرنے کے پرانے طریقے ختم ہو چکے ہیں اور نئے ابھی مرتب نہیں ہوئے۔ یہاں تجویز دی گئی ہے کہ مردانگی کے مفہوم کو بدلا جائے اور جبر و تشدد کو اس کے مطلب سے خارج کیا جائے اور بہادری اور

شجاعت کو نئے معنی دیئے جائیں، جو صنفی تفریق کے دائرے سے باہر ہوں۔ اس طرح موجودہ دور کا احساس نامردی اور مردانگی کے فقدان کا احساس ختم نہ ہو جائے گا اور مردانگی ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہوا، عورتیں معاشی نظام اور پدرانہ نظام کے خلاف مزاحمت کرتی رہیں گی۔

MashalBooks.org

حوالے

تعارف

1- مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ اور عورت'' میں ذکر کرتے ہیں کہ زراعت عورت کی ایجاد ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تحریری تاریخ سے عورت غائب ہے کیونکہ تاریخ مردوں نے لکھی اور عورت کی پیداوار اور کارناموں کو نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا تاریخ میں کوئی کردار نہیں تھا۔

2- اس رجحان کی ایک مثال سیمرغ ویمن ریسورس سینٹر کی کتاب ''خواتین کی عدالت میں'' ہے۔ اس کتاب میں خواتین کی شہادتیں ہیں کہ ان پر کس کس طرح کے مظالم ڈھائے گئے- اگرچہ یہ سچ ہے کہ خواتین کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن ان کی مزاحمت اور جدوجہد کو نظرانداز کرنا تصویر کا صرف ایک ہی رخ ہے۔

3- یہ بات کیتو کاتکرک اپنے ایک مقالے میں کہتی ہیں جس کا نام ہے''ہندوستانی قومیت گاندھی کی ستیہ گرہ کی تحریک اور عورتوں کی جنسی نمائندگی'' --جس کتاب میں یہ مقالہ چھپا- اس کا نام ہے (Nationalism and Sexualities) صفحہ 395-

4- ایضاً-صفحہ 396-

MashalBooks.org

5- یہ بات سری لنکا کی مفکر کماری جیور دینا اپنی کتاب
Feminism and Nationalism in the Third World میں کہتی ہیں
صفحہ 97-

6- یہ بات مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ اور عورت'' میں کہتے ہیں-

MashalBooks.org

پہلا باب

1- ہندوستان کے سب آلٹرن(Subaltern) تاریخ دان جن میں رانا جیت گوہا' پر تھا چیٹر جی اور دیگر مورخ شامل ہیں- تاریخ کو پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے کام کی کئی جلدی چھپ چکی ہیں جن میں کسانوں اور غریب عوام کی ایسی تحریکوں پر مواد شامل ہے جو مشہور نہیں ہوئیں لیکن تاریخ میں اہمیت رکھتی ہیں-

2- غلامی کے موضوع پر مبارک علی کی کتاب ''غلامی اور نسل پرستی'' میں تفصیلی تاریخ ملتی ہے-

3- اس پر مشہور نفسیات دان سگمنڈ فرائڈ نے بہت کام کیا ہے- ان کے مطابق انسان کے دو بنیادی احساسات ہیں، ایک جنسی جذبہ جس سے افزائش نسل ممکن ہوتی ہے اور دوسرا جارحیت کا جذبہ جس کی مدد سے انسانی اپنی بقا کا سامان کرتا ہے، زمین سے اناج اگاتا ہے اور شکار کر کے خوراک کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں جذبات انسانی بقا کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس موضوع پر سگمنڈ فرائڈ کے کئی مقالے اور کتابیں ہیں- مثال کے طور پر

(The Instincts and their Vissicitudes)اور(On Sexuality)-

4- یہ بات کیتو کاتکرک اپنے مقالے میں کہتی ہیں جو انہوں نے Nationalism and Sexualities لکھا ہے-صفحہ 398-

5- یہ بات شفا نعیم اپنے مقالے میں کہتی ہیں جو انہوں نے اثر کی شائع کردہ کتاب میں لکھا- مقالے کا عنوان ہے:

"Psycho-Social Risk Factors for Depression in Pakistani Women."

MashalBooks.org

جس کتاب میں یہ مقالہ چھپا اس کا نام ہے۔

Aspects of women and Development, pp. 99-110

6- یہ اشعار ''کلیات اکبر الہ آبادی'' سے لیے گئے۔

دوسرا باب

1- یہ مواد محمد زبیر اور حامد قزلباش کی کتاب ''ہمارے انسانی حقوق'' سے لیا گیا۔ یہ کتاب سیاہی (سوسائٹی برائے فروغ تعلیم) نے شائع کی۔ 1993ء۔ صفحات 47 تا 51۔

2- یہ بات شاہدہ لطیف اپنی کتاب میں کہتی ہیں جس کا نام۔

Muslim Women in India: Public and Private Realities-1890-1980

3- اس موضوع پر انیس ہارون کا مقالہ جس کا عنوان ہے ''عورتوں کی تحریک کا تاریخی پس منظر'' اثر کی شائع کردہ کتاب ''نئے زاویے'' میں موجود ہے۔ صفحات 167-174۔

4- یہ بات حنا جیلانی نے سیمرغ کی کانفرنس میں بتائی جو کہ دسمبر۔ جنوری 1993ء میں لاہور میں منعقد کی گئی۔ یہ عورتوں پر تشدد کے موضوع پر بین الاقوامی ٹربیونل تھا۔

5- یہ بات خاور ممتاز سندھیانی تحریک پر اپنے مقالے میں کہتی ہیں جس کا عنوان ہے ''خواتین محاذ عمل اور سندھیانی تحریک: پاکستان کی سیاسی ترقی پر دو ردعمل۔''

South Asia Bulletin-1991 Khawar Mumtaz Khawateen Mahaz-e-Amal and Sindhiani Tehrik: Two responses to Political Development in Pakistan. South Asia Bulletin. 1991.

6- اس موضوع پر روبینہ سہگل کا مقالہ موجود ہے جس کا عنوان ہے ''صنعتی تفریق کی

تعمیر میں تعلیم کا کردار''- یہ 1997ء میں سیاہی کی سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا اور ''غیر رسمی تعلیم کے مسائل'' نامی کتاب میں موجود ہے یہ پہلے دن پڑھے جانے والے مقالوں پر مشتمل ہے-صفحات 106-47

7- یہ بات روبینہ سہگل نے اپنے مقالے میں کہی ہے جس کا نام ہے ''گھر بنانے والی گھر بگاڑنے والی'' یہ مقالہ آنے والے جریدے ''تاریخ'' میں چھپ رہا ہے اور اس میں ڈپٹی نذیر احمد کے عورتوں کی تعلیم سے متعلق خیالات پر تنقید کی گئی ہے- اس کے دوسرے حصے میں اکبر الہ آبادی کی شاعری میں عورت اور خواتین کی تعلیم اور پردے پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے- دوسرا حصہ ''تاریخ'' کے دوسرے شمارے میں چھپے گا- ''تاریخ''، فکشن ہاؤس 1999-

8- یہ بات مولانا اشرف علی تھانوی اپنی مشہور کتاب ''بہشتی زیور'' میں کہتے ہیں- وہ بہت سی کتابوں کو عورتوں کے لیے غیر موزوں قرار دیتے ہیں-صفحات 583-584-

9- یہ بات فاطمہ مرنیسی اپنے مقالے میں لکھتی ہیں جس کا نام ہے-

The Fundamentalist Obsession with Women.

یہ مقالہ سیمرغ ویمن ریسورس سنٹر نے شائع کیا ہے-

10- چپکو تحریک ہندوستان کی دیہی عورتوں کی مشہور تحریک ہے جو جنگلات کی حفاظت کے لیے چلائی گئی- یہ معلومات چپکو معلوماتی مرکز سے لی گئیں- آئی-ڈی-او-سی انٹرنیشنل- مارچ 1989ء-صفحہ 110

Chipko Infornation Center I. D. O. C. I nternational

11- مبارک علی- تاریخ اور عورت-

12- یہ بات نیلم حسین اپنے مقالے ''فوجی حکومت' بنیاد پرستی اور پاکستان میں عورتوں کی تحریک'' میں کہتی ہیں- یہ مقالہ Alternatives میں چھپا اور ستمبر 1988ء میں ہونے والی کانفرنس میں پڑھا گیا-صفحہ 219-

Neelum Hussain's Paper "Military Rule, Fundamentalism and the Womens movement in

MashalBooks.org

Pakistan" Dawn South Asian Meeting in Dacca, Bangladesh, 1988. p. 219.

13- یہ بات سنیلا ایبے سکرا(Sunila Abeysekera) پدر شاہی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

In the Court of Women. p. 14.

14- یہ بحث فریدہ شہید نے اپنے مقالے ''پدر شاہی کی ثقافتی انداز'' میں کی ہے۔ "Farida Shaheed".

"The Cultural Articulation of Patriarchy"

یہ مقالہ Finding Our way نامی کتاب میں چھپا۔صفحات 136-158

15- یہ مواد صادق حسین صدیقی کی کتاب ''بہادر شہزادیاں'' سے لیا گیا ہے۔

16- اس بات پر تفصیل نیلم حسین نے اپنے مقالے میں دی ہے۔ اس مقالے کا نام ہے۔

Narrative Appropriations of Saimal Coercion and Consent in Muslim Pakistan" 199-241 صفحات

یہ مقالہ سیمرغ کی کتاب میں چھپا جس کا نام ہے۔

Engendering the Nation-state Vol. I. pp. 199-214.

17- اس بات کی مبارک علی نے ایک گفتگو کے دوران نشاندہی کی۔

تیسرا باب

1- کشور ناہید۔ ''عورت۔ خواب اور خاک کے درمیان۔ ''صفحات 27-42' 134-142

2- ایضاً،صفحہ 39۔

3- ایضاً،صفحہ 35-36۔

4- نازلی جاوید کا مقالہ دیکھئے ''سرمایہ داری جبر کا عالمی شکار- خواتین-'' ''جدوجہد''
اکتوبر 22 تا 28-1998ء- صفحات 4 تا 9

6-5 ایضاً، صفحہ 6-

9-8-7 ایضاً، صفحہ 7 تا 9-

10- فرحت پروین اور کرامت علی کا مقالہ دیکھئے ''پاکستان میں خواتین صنعتی مزدوروں
کو منظّم کرنا-''

Farhat Perveen and Karamat Alis Paper,
Organising Women factory Workers in Pakistan.
in a Celebration of Women. pp. 112-130.

11- صبیحہ حفیظ کی اس تحقیق کا حوالہ فرحت پروین اور کرامت علی اپنے مقالے میں
دیتے ہیں- صفحہ 115-

12-13 ایضاً، صفحہ 119

14- یہ بات حمیرا اختر اپنے مقالے میں کہتی ہیں جس کا عنوان ہے ''خواتین اجرتی
مزدوری، کنٹرول اور مزاحمت-''

Humaira Akhtar's Paper, "Women, paid Work, Controls and Resistance," in Aspect of Women and Development, pp. 17-57.

چوتھا باب

15- ایضاً- صفحہ 17 تا 18-

16- ایضاً- صفحہ 19 تا 22-

17- ایضاً- صفحہ 23 تا 26-

18- ایضاً- صفحہ 27 تا 35-

MashalBooks.org

19- ایضاً-صفحہ 36-

20- ایضاً-صفحہ 41-

21- ایضاً-صفحہ 47-

22 یہ بات جون اونیل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جہاں پرانے زمانے میں کارکنوں اور مزدوروں پر کنٹرول سزاؤں کے ذریعے باہر سے آتا تھا اور واضح تھا کیونکہ کنٹرول کرنے والا نظر آتا تھا، اب کنٹرول کام اندرونی جزو بنا دیا گیا ہے اور مزدوروں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان پر کوئی کنٹرول نہیں کر رہا بلکہ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ کنٹرول اور نظم و ضبط مشین کا اپنا تقاضا ہے- مثال کے طور پر اسمبلی لائن کا طریقہ خود مزدوروں کی حرکات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس میں بیرونی دباؤ یا مداخلت کی ضرورت نہیں ہوتی-

John O'Neil's The Poverty of Postmodernism.-56-59 صفحات

23- یہ بات مائیکل اپیل اپنی کتاب ''تعلیم اور طاقت'' میں کہتے ہیں:

Michael Apple's Education and Power.-79 تا 82-صفحات

24- ایضاً-صفحہ 81-

25- ایضاً-صفحہ 82-

26- حمیرا اختر-''خواتین'' اجرتی مزدوری، کنٹرول اور مزاحمت-صفحہ 48-

27- ایضاً-صفحہ 52 تا 53-

29-28 ایضاً-صفحہ 53-

31-30 ایضاً-صفحہ 54-

32- ایضاً-صفحہ 55-

33- فرحت پروین اور کرامت علی کا مقالہ ''پاکستان میں خواتین صنعتی مزدوروں کو منظّم کرنا-''-صفحہ 120

پانچواں باب

MashalBooks.org

1- ٹموتھی مچل اپنی کتاب ''مصر کو نوآبادی کیسے بنایا گیا'' میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ تعلیم کی فوج کی طرز پر ڈھالا گیا اور ذہن اور جسم پر کنٹرول کا ذریعہ بنایا گیا۔

Timothy Mitchell - Colonising Egypt.

2- اساتذہ کے مسائل کے بارے میں حامد قزلباش اپنے مقالے ''پاکستان میں پرائمری اساتذہ کے مسائل اور ان کے حل میں'' نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مقالہ سوسائٹی برائے فروغ تعلیم (ساہی) کی اگست 1997ء کی قومی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ یہ کانفرنس کے پہلے دن کے مقالوں کی کتاب میں چھپا ہے۔ جو غیر رسمی تعلیم کے مسائل پر چھاپی گئی۔ ساہی، 1997ء صفحات 6 تا 10۔

چھٹا باب

1- نیلم حسین ۔ ''فوجی حکومت، بنیاد پرستی اور پاکستان میں عورتوں کی تحریک۔''

Military Rule, Fundamentalism and the women's movement in Pakistan? Alternatives, 1988. p. 219.

2- کملا۔ بھیسن اور رینو مینن کی کتاب میں تقسیم ہند کے دوران ہونے والے تشدد کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ "Borders and Boundaries"

Bibliography

Adams, P. and Lawrence Solomon. (1985). In the Name of Progress.

The Underside of Foreign Aid, London: Earthscan.

Allahabadi, Akbar, *Kuliyaat-e-Akbar Allahabad*, Lahore: Maktaba-e-Shaair-o-Adab.

Ali, M (1993). Tareekh Aur Aurat. Lahore: Fiction House.

(1993). Ghulami Aur Nasal Parasti. Lahore: Takhleeqat.

Alternatives, First Dawn South Asian Conference. September 2-4 1988.

Apple, A. (1982). Education and Power, Boston: Routledge.

Freud, S. (1977). On Sexuality. New York: Pelican.

(1963). Sexuality and the Psychology of Love. New York: Collier.

(1989). An Outline of Psycho-Analysis. Trans. And edited by James Strachey. New York: Norton.

Hussain, N., Mumtaz, S. & Saigol, R. (1997). Engendering the Nation-state, Lahore: Simorgh.

MashalBooks.org

Khan, N.S., Saigol, R. and Zia, A.S. (eds.) (1995).Aspects of Women and DevelopmentLahore: Asr.

Khan, N.S. Saigol, R. and Zia, A.S, (eds.) (1995).A Celebration of Women. Lahore: Asr.

Khan, N.S. And Zia, A.S. (eds.) (1995), Nai Zaaviye. Lahore: Asr.

Jayawardena, K. (1994):Feminism and Nationalism in the Third World, Lahore: ASR.

Jiddo-Jehad, June 18-24, 1998. Edited by Farooq Tariq Lahor: Matba-e-Shanakht.

Jiddo-Jehad, October 22-28, 1998, Edited by Farooq Tariq. Lahroe: Matba-e-Shanakht.

Lateef, S. (1990). Muslim Women in India: Political and Private Realities: 1890s-1980s New Delhi: Kali for Women.

Menon, R, & Bhasin, K. (1997).Borders and Boundaries: Women in India's Partition. New Delhi: Kali for Women.

Mernissi, F. (1987). The Fundamentalist Obsession with Women, Lahore: Simorgh.

Mitchell, T. (1998): Colonising Egypt. Berkeley.

University of California Press.

Naheed, K (1985).*Aurat: Khwab Aur Khak Kay Darmiyan*, Lahore: Gulrang.

O. Neill, J. (1995). The Poverty of Postmodernism,London: Routledge.

Parker, A, Russo, M., Sommer, D. & Yaeger, P. (1992). Nationalisms and sexualitiesNew York: Routledge.

MashalBooks.org

Saigol, R. (1997) Papers on the Issues of Non-formal Education read at the Conference on Non-formal education organised by the Society for the Advancement of Education, Lahore: SAHE.

Saddiqui, S.H. *Bahadur Shahzadian* Lahore: Jahangir Sons.

Simorgh. (1995). In the Court of Women The Lahore Tribunal on Violence Against Women, 1993-94.

Lahore: Simorgh Women's Resource and Publication Centre.

South Asia Bulletin (1991) 11, Nos. 1-2: 85-101.

Tareekh, Journal of Historical Studies, Lahore: Fiction House, Forthcoming, 1999.

Thanvi, A.A. *Bahishti Zewar.* Lahore: Maktaba-e-Rehmania.

Zafar, F. (1991). *Finding Our way: Readings on Women in Pakistan*, Lahore: ASR.

Zubair, M. & Kizilbash, H. (1993). *Hamaray Insaani Huqooq* Lahore: SAHE.

MashalBooks.org

روبینہ سہگل

روبینہ سہگل سوسائٹی برائے فروغ تعلیم میں انسانی حقوق، عورتوں کے حقوق اور بچوں کے حقوق پر کام کرتی ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں تعلیمی امور پر ورکشاپ منعقد کیے ہیں اور اساتذہ کی تربیت میں انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق شامل کیے ہیں۔ روبینہ پائلر کی ریسورس پرسن بھی ہیں اور مزدور خواتین کے ساتھ انہوں نے عورت اور مزاحمت اور معیشت میں مزدور خواتین کے کردار پر ورکشاپ کیے ہیں۔

روبینہ Iwsl (انسٹی ٹیوٹ آف ویمن سٹڈیز، لاہور) کے اساتذہ میں بھی شامل ہیں اور وہاں کورسز دیتی ہیں اس کے علاوہ یہ عورتوں کی تنظیم سیمرغ کی ریسورس پرسن بھی ہیں اور آج کل گھریلو تشدد پر سیمرغ کے لیے ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔

انہوں نے تعلیم اور خواتین کے حقوق پر کتابیں لکھی ہیں جن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

1- Education Critical Perspective.

2- Knowledge and Identity.

3- Locating the Self (Co-editor).

4- Aspects of Women and Development (Co-editor)

5- Engindering the nation-State (Co-editor) Vol.I and II.

7- انسانی حقوق کی مینوئل

8- انسانی حقوق کی تحریک: ایک تنقیدی جائزہ

MashalBooks.org

9- قومیت تعلیم اور شناخت

اس کے علاوہ انہوں نے چند کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے-

WOMEN AND RESISTANCE:

A STUDY OF WOMEN IN TEH PRODUCTION
AND SERVICE INDUSTRIES

Rubina Saigol

Copyright (c) Urdu 1999 Mashal

PublisherMashal

RB-5, Second Floor,
Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,
Lahore-54600, Pakistan.

Telephone & Fax: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org